اسلام کا نظامِ حیات

اسلام کے بارہ مہتم بالشان اصول حیات پر نقد و تبصرہ جو افراد کے تزکیہ نفس ان کی تعمیر سیرت، جماعت کی اصلاح و تنظیم اور عالم انسانی کی بقا و فلاح کے ذمہ دار ہیں

مولفہ

عبدالوہاب ظہوری

نفیس اکیڈیمی

قیمت پانچ روپیہ سکہ عثمانیہ

قیمت چار روپیہ چار آنہ سکہ کلدار

14992

طبع اول ..... دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء ..... ایک ہزار



مطبوعہ

رزاقی پریس و انتظامی پریس

حیدر آباد (دکن)

فہرست مضامین

پیش لفظ

(تیرہ سو پینسٹھ سال پیشتر دنیا میں مذہب، دیانت، اخلاق اور روحانیت پر بڑھاپہ طاری تھا، کفر و الحاد اور شر و فساد پر جوانی چھائی ہوئی تھی، یہودیت مادیت کا شکار ہو چکی تھی، عیسائیت پر رہبانیت کے بحرانی دورے پڑ رہے تھے، مشرق کا دامن نورانی شعاعوں سے یکسر خالی تھا، مغرب کی پیشانی خون ناحق سے داغ دار ہو گئی تھی، مہذب ملکوں میں ظلم و طغیان کے بگولے اُٹھ رہے تھے، انسانیت کا سفینہ جور و استبداد کے طوفان خیز سمندر میں جھکولے کھا رہا تھا، غرض کائنات ارضی کا چپہ چپہ ظلمت و ضلالت کی چادر اوڑھے ہوئے تھا!

اسلام ایک ہمہ گیر انقلابی دعوت کی حیثیت سے

عرب کے ریگستانوں سے اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام کرۂ ارض پر چھا گیا، اس کے عالمگیر اصول و اخلاق، اس کی انقلابی تحریکات اور اس کے اساسی افکار و نظریاتِ حیات نے عربوں کے منتشر شیرازہ کو ایک نظام میں مربوط کردیا اور ان کی مختلف ذہنی و جسمانی طاقتوں کو، جو تباہی و بربادی کے میدانوں میں فتنہ و فساد کی آندھیاں برپا کر رہی تھیں، مرتکز کرکے ایک اجتماعی مرکزی شکل وصورت میں نمودار کردیا، پیغمبر اسلام نے تہذیب و تمدن سے ناآشنا قوم کے اندر اسلامی حرکت و عمل کے برق پاروں، ایمان ویقین کے حراروں، جہاد و اجتہاد کی اسپرٹ اور الٰہی توانائیوں کو ترکیب دے کر ایک ایسا پاور ہاؤس POWERHOUSE اور فکری وعقلی طاقت وقوت کا ایک ایسا خزانہ بنادیا۔ جس سے ریگستان کے پتھردل انسانوں کے سینوں سے رقت و شفقت اور اخوت ومساوات کے ایسے چشمے پھوٹ نکلے، جنھوں نے رنگ و نسل کے حدود کو توڑ دیا اور قومیت و وطنیت کی چٹانوں کو پاش پاش کردیا اور انسانیت اور حق و عدالت کی مضبوط بنیا دیں تعمیر کیں، ان کی بے حس رگوں میں ایسی برقی لہریں دوڑا دیں، جنھوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ کر رکھ دیے

دھرتی کے وحشت زدہ دل و دماغ اور اس کے خوف و دہشت سے دھڑکتے ہوئے سینوں کو امن و سلامتی کا پیغام سنایا، ظلم و استبداد کے طوفانوں کو زیر کرکے ان کے بجائے جمہوریت کی بنا ڈالی، دکھی انسانیت کو چین، سکھ اور شانتی بخشی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمان الٰہی تعلیمات، اسلامی اصول و آداب اور قرآنی نظریاتِ حیات کو لے کر اٹھے اور دنیا کے ہر ہر گوشہ میں اپنی دعوت و تبلیغ کے گہرے اثرات چھوڑے، قوموں کو عدالت، سیاست، معاشرت، جمہوریت اور حکومت اسلامیہ و خلافت الٰہیہ کا سبق دیا یونانی علوم و فنون کو زندہ کیا، اسلامی فکر و نظر کی روشنی میں آسمان و زمین کے پوشیدہ اسرار و رموز کا انکشاف کیا، نئی تحقیقات کیں، اپنے علوم و فنون کی روشنی سے قرون مظلمہ اور از منۂ وسطیٰ کی تاریک راتوں کو چراغاں کردیا، ان کے کیمیا و طبیعیات کی جواہر آغوش کانوں نے یورپ کے خشک کانوں میں امرت برسایا، ان کی تہذیب و ثقافت کے زریں نسخوں نے سونے ذرّوں کو سونا بناکر جگمگایا تو خزف ریزوں کو چاندی کے پترے بناکر آسمان حکمت میں چار چاند لگادیے، اور یورپ سے گشتہ

وحشت و جہالت کو تہذیب و عمران کا ماء الحیات پلا کر زندۂ جاوید بنا دیا۔

الغرض ایک عرصۂ دراز کے بعد مسلمانوں کی اسلامی تہذیب و ثقافت کا آفتاب افق مشرق سے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوکر اپنی کرنیں دنیا کے ہر خطہ تک پہنچائیں، بالآخر شفق کے لالہ زاروں اور مغرب کی خونین گھاٹیوں میں ڈوب گیا، مسلمانوں کے یقین و عمل کا یہ تیشہ پیما اپنے ارتقائی نقطہ تک پہنچ کر فکری جمود و خمود اور عقلی و عملی سرد مہری سے تنزل کے آخری سرے تک گھٹ گیا، ان کی لامرکزیت نے ان کی جمعیت پریشان کردی اور ان کی توانائیوں کو بے کار و مضمحل بنا دیا۔

زمانے نے ایک نئی کروٹ بدلی، مغرب کے بطن سے ایک نئے تمدن اور ایک نئی تہذیب نے جنم لیا، نئے نئے فتنے ابھرنا شروع ہوئے۔ مختلف مسائل حیات منظر عام پر آئے، اسلام کا وہ پاور ہاوس جس نے اپنی توانائیاں حکومت الہٰیہ کے قیام اور جمہوریت کی تعمیر کے لئے خرچ کی تھیں، یورپ کے ہاتھوں میں آیا، یورپ نے اس پاور ہاؤس کے "تعمیری عناصر" کو تخریبی عناصر میں

تبدیل کردیا، اس میں دہریت کے شعلے، مادیت کے شرارے الحاد کے طوفان، فتنوں کی بجلیاں اور جنگی دیوتاؤں کی توانائیاں بھردیں اور ان کو طاغوتی نظام کے لئے استعمال کیا پھر اس نے اخلاق و کردار اور اسلامی افکار و عقائد کی مضبوط عمارت کو اپنا نشانہ بنایا، انسانیت کو غلامی کے آہنی شکنجوں میں جکڑدیا، جمہوریت کے ایوان کو منہدم وحدتِ ملتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرکے اسلامی بنیادوں کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کی کوشش کی اور اسلامی نظام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دھاروں کو جو صحیح شاہراہ زندگی پر بہہ رہے تھے، باطل کے دہانوں کی طرف موڑ دیا۔

ذرا آج سے ساڑھے تیرہ سو سال اسلام کے قبل کے اس دور کا مطالعہ کیجئے، جو تاریخ انسانی کا نہایت تاریک دور کہلاتا ہے، جس میں اگر ساری دنیا ظلمت و جہالت کی کثیف چادریں اوڑھے ہوئے سسکیاں بھر رہی تھیں اور عالم انسانیت کے ماتھے پر ایک بدنما داغ اور دھرتی کے کندھوں پر ناقابل برداشت بوجھ بنی ہوئی تھی، تو کوئی تعجب کا مقام نہیں، پھر موجودہ ترقی یافتہ دنیا کے نقشہ کا جس کی تہذیب، سیاست، طرز تمدن اور اسلوب حکومت کو دور حاضر کا قابل فخر کارنامہ اور مغرب کی گراں مایہ

پیداوار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مشاہدہ کیجئے کہ اس میں انسانیت کس درجۂ انحطاط تک پہنچ چکی ہے، اخلاق، مذہب اور کردار کا کیا معیار ہے، مشرق و مغرب کے درمیان کش مکش اور قوموں کے اختلافات کس درجہ تلخ تر ہوتے جارہے ہیں، اب دونوں دور کے حالات کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ کیا دور حاضر کا یہ مایہ ناز تمدن اور اس کے پیدا شدہ پیچیدہ مسائل اور خطرناک صورتوں میں اور آج سے ڈیڑھ دو ہزار بلکہ لاکھوں سال پہلے کے دور کی انسانی تباہ حالی و بربادی میں، جو تاریخ انسانی کا ابتدائی دور کہلاتا ہے، جس میں انسان سراسر وحشت و بربریت کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ کچھ بیّن فرق نظر آرہا ہے؟ آج سے ہزاروں سال کی تاریخ عالم کے صفحات کو اُلٹ کر دیکھئے تو آپ کو ڈھونڈے سے کہیں پتہ نہ چلے گا کہ دنیا کی کسی ظالم سے ظالم قوم نے گھنٹوں میں لاکھوں انسانوں کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اتار دیا ہو شہروں کو پل بھر میں اُجاڑ دیا ہو، بخلاف اس کے عصر حاضر کی تمدن یافتہ حکومتوں اور مہذب قوموں کی تاریخ ایسے بے شمار دردناک واقعات اور انسانیت سوز مظالم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔

یورپ اس کو محسوس کر رہا ہے کہ جس تہذیب کی اس نے تخم ریزی کی ہے۔ اس کے ثمرات حنظل سے زیادہ تلخ و بدمزہ

ہیں، جس کو یہ تریاق اور امرت سمجھے ہوئے تھا، وہی زہر ہلاہل بن کر اس کے حلق میں اتر رہا ہے، الغرض دنیا جن سیاسی، اقتصادی، معاشی اور اخلاقی پستی میں گر رہی ہے، اور جن نئے نئے مسائل، پیچیدہ حالات اور اضطراب انگیز مشکلات سے دو چار ہو رہی ہے۔ مغربی مفکرین کے لئے سامانِ بصیرت وعبرت فراہم کر رہی ہے۔ چنانچہ چند سال سے یورپ کے ارباب فکر و نظر نے اپنے ہاتھوں سے اپنے گلوں میں ڈالے ہوئے تہذیب کے لعنتی پھندوں کو نکالنے کی کوشش کی، مغرب کے نامور فلاسفہ و حکماء نے موجودہ تمدن کی خرابیوں کو دور کرنے اور زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی فکر کی مگر ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، حالات نازک و بد تر ہوتے گئے، اصلاح ہو تو کیوں کر ہو۔ ان کے پاس کونسا ایسا صالح نظام ہے، جس کی بنیادوں پر یہ حکومت کی تشکیل کریں؟ کونسا ایسا الہامی و ربانی سرچشمہ ہے جو بلبلاتی ہوئی پیاسی انسانیت کی پیاس بجھا سکے، کونسے ایسے صالح عناصر ہیں جو تہذیب، معاشرت، اقتصاد کی ترکیب میں داخل ہوں، اخلاق، دین، سیاست اور عمران کے وہ کونسے اصول ہیں جو دنیا کو امن و سلامتی اور صلح و آشتی کا پیغام سنائیں؟ ان کے پاس ایسے اساسی تصورات اور بنیادی نظریات

بھی تو نہیں، جن سے زندگی کے نازک مسائل کو حل کرسکیں، فرد و جماعت کے تعلقات کو برقرار رکھیں، بندہ و خدا کے مابین حد بندی کریں اور سوسائٹی کے نظام میں ایسا ربط و ضبط قائم کردیں جو بنی نوع انسان کی خوش حالی کا کفیل ہو۔

اسلام زندگی کا ایک اٹل قانون اور منظم ضابطہ ہے گو دنیا میں اس وقت بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سب انسان کی دماغی کاوشوں اور کوششوں کے رہین منت ہوکر رہ گئے ہیں، لیکن اسلام اب بھی اپنے اندر وہی جوہری، اصلی اور حقیقی عناصر ~~اپنے اندر~~ رکھتا ہے جو آج سے تیرہ سو پینسٹھ سال سے رکھے ہوئے ہے۔

پیش نظر کتاب میں اسلام کے اسی نظام حیات کی تشریح کی گئی ہے فرد کی اصلاح، جماعتی تنظیم، اجتماعی آداب و اصول۔ عقائد، اخلاق، بندگی کا انقلابی تصور، معاشی ذرائع، انسانیت کا مقام اعلیٰ، حکومت الٰہیہ کا قیام، وحدت ریاست اسلامیہ، اقوام عالم کی اصلاح وغیرہ اہم مباحث پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے، یہ کتاب در اصل محمد احمد جاد مولیٰ بک کی کتاب "المثل الکامل" کے ایک باب مقاصد الاسلام کا پھیلاؤ ہے جس کو سامنے رکھ کر اور بہت سی عربی کتابوں سے مواد فراہم کیا گیا ہے جن کی تفصیل کتاب کے آخر میں درج ہے

عبد الوہاب ظہوری

پہلا باب

افراد کی اصلاح

افراد کے نفوس کی اصلاح کے لئے حسب ذیل طریقے ہیں

(۱) دنیا میں جتنے مذاہب اللہ تعالیٰ کی جانب سے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے' ان کا مقصد یہی تھا کہ نفوس انسانی میں معرفت الٰہی اور وجود حقیقی کے اعتقاد کی شمع روشن کریں اور ان کو ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کمالیہ سے حسب طاقت بشری روشناس کرایا جائے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظہور قدسی تک جتنے انبیاء مبعوث ہوئے' ان تمام کا مقصد اولین صرف توحید تھا یعنی سب کے سب اس ایک مقصد پر متفق تھے کہ اللہ ایک ہے وہ جملہ صفات کمال سے متصف' صفات نقصان سے پاک اور وہ علی الاطلاق معبود ہے' اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کیا جا سکتا قرآن مجید کا دار و مدار بھی تمام تر عقائد پر ہے' شان توحید کا اسے ...

ظاہر کیا گیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ (سورۂ اخلاص) ایسے ہی کہدو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوْا اِلٰهًا وَّاحِدًا (سورۂ توبہ) ان کو صرف ایک ہی ذرا کی عبادت کا حکم ملا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنَ (انبیاء) ہم نے تمہارے پیشتر جس رسول کو بھی بھیجا، اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بلا شبہ میرے سوائے کوئی معبود ہی نہیں اس لئے تم میری ہی پرستش کرو!

اسلام کے پیشتر حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے عہد سے عربوں میں توحید پائی جاتی تھی، لیکن جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا ان کی توحید پرستی پر کفر و ظلمت اور اصنام پرستی کی گھٹائیں چھا گئیں، وہ اس ارشاد الٰہی کے پورے مصداق بن چکے تھے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (یوسف) ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں۔

اسلام نے تمام باطل عقائد کو مٹا کر شان توحید کی نئے رنگ میں تجدید کی اور ان تمام فاسد اوہام و خیالات کو نیست و نابود کر دیا، جن سے دین خالص کے اصول و احکام تاریکیوں میں پڑ گئے تھے۔

اسلام ہی وہ فطری مذہب ہے، جو انسانوں کی فطرت کے عین مطابق ہے

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (عمران) بیشک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (عمران)

جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تلاش کرے تو وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا۔

معلوم ہوا کہ توحید ہی دین کی اصل بنیاد اور اسلام کا ایک سب سے بڑا رکن ہے، کیونکہ یہ معرفت الٰہی تک پہنچنے کا راستہ ہے اور اسی پر سعادت کا انحصار ہے، قرآن مقدس اور آنحضرت اکرم صلعم نے اس کی عظمت و اہمیت کو بیان فرماتے ہوئے اس کو تمام انواع خیر وبر میں دل کا درجہ عطا کیا ہے، اس کے اصلاح و فساد سے دوسری چیزوں کا کون و فساد وابستہ ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (نساء)

بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کی مغفرت نہیں کرتا، جو اس کے ساتھ شرک کرے اور اس کے سوا جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

اسی حقیقت کا اظہار حضور صلعم نے اس طرح کیا ہے۔

مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

جو شخص اس حالت میں وفات پائے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کرتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگیا۔

توحید الٰہی کے چار مظاہر ہیں۔

(۱) ذات واجب تعالیٰ ہی سرچشمۂ وجود ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ ہی نے کائنات ارضی و سماوی کو وجود بخشا ہے۔

(۳) وہ ایک ہی ذات ہے اس میں مطلق کسی کا شمار نہیں ہو سکتا۔

(۴) ملک و ملکوت کی تدبیر میں تنہا ہے اور اس کو اس میں ہر قسم کا تصرف کرنے کا اختیار و حق حاصل ہے، اس کے نافذ کردہ قوانین و احکام میں کسی کو دم مارنے کا یارا اور چون و چرا کرنے کی گنجایش نہیں۔

عقیدۂ صحیحہ پیدا کرنے کے وسائل

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں بے شمار مقامات پر انسان کو موجودات عالم میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے، تاکہ اس کی توحید و ربوبیت، صفات کمال و ذات، جلال و جمال کے مناظر، اس کی عمومی قدرت کے مظاہر، اس کی کبریائی و جبروت، لطف و احسان علم و حکمت اور اس کے غضب و رضا کا حال پورے طور پر بندوں پر واضح ہو جائے۔

عجائبات قدرت میں سے ایک انسان ہے جس کی پیدایش اپنے اندر بے شمار اسرار پوشیدہ کیے ہوئے ہے، چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدایش انسان میں غور و خوض کرنے کے بارے میں متعدد بار توجہ دلائی ہے کہ انسان کو سب سے پہلے اپنی تخلیق کی گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہیئے،

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ (طارق) انسان کو غور کرنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

کائنات عالم کا ذرہ ذرہ کتاب قدرت کا ایک روشن باب ہے جو انسانی نفوس کے تاریک گوشوں میں فکر و نظر کی قندیل روشن کر رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں غور کریں کہ وہ کس طرح وجود کی روشنی حاصل کرنے سے

پیشتر عدم کی تاریکیوں میں خاکی ندات کی شکل و صورت میں حیران و سرگرداں تھے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُونَ (سورہ روم) — اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اب تم زمین میں پھیلے پڑے انسان ہو۔

دور کیوں جاتے ہو، دفتر کائنات کا مطالعہ کرنے سے پہلے اپنے نفسوں کے اوراق کو الٹ کر اور ضمیروں کو ٹٹول کر دیکھو کہ ان کے گوشوں میں کتنے ایسے جہاں کروٹیں لے رہے ہیں، اور فطرت کائنات کی کتنی رنگینیاں سمٹ کر آگئی ہیں۔

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (ذاریات) — اور خود تمہارے ہی نفوس کے اندر ہے کیا تم نہیں دیکھتے ہو۔

جو کچھ تم اس بسیط عالم میں ڈھونڈنا چاہتے ہو، وہ سب اپنے آئینۂ دل میں محسوس کرو گے، جن عجائبات قدرت کا مظاہرہ تم اس وقت اس عالم میں کر رہے ہو، اس کا مشاہدہ اپنے نفس میں اچھی طرح کر سکتے ہو اور پھر اس کے ذریعہ سے موجودہ مشاہدات عالم اور آثار قدرت کی طرف قدم بڑھا کر دونوں جہانوں کا موازنہ کر سکتے ہو۔

ارباب فکر و نظر کے لئے شان رحمت کی اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو سکتی ہے کہ قدرت نے دلی سکون اور نفسی طمانیت کے لئے مرد و عورت کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں کے دلوں میں عشق و محبت کے جذبات کی موجیں بہا دیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ — اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ اس نے

مِنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْکُنُوْا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً وَرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِقَوْمٍ یَتَفَکَّرُوْنَ (سورہ روم)

تمہارے لئے تمہاری قسم میں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے پاس چین پاسکو اور تمہارے درمیان محبت اور مہربانی رکھا، البتہ اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِلْعَالِمِیْنَ (سورہ روم)

اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے، بلاشبہ اس میں سمجھنے جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

کیا آسمان و زمین کے لامحدود وسیع صفحات، زبانوں کی نیرنگیاں اور رنگوں کی تبدیلیاں اور ان کا اختلاف ایک فطرت پرست فلسفی اور باریک بیں عالم کے قدرتی مطالعہ کے لئے کافی نہیں ہیں۔

سکون و راحت کے لئے رات کے سکون پرور آغوش میں خواب نوشیں کے مزے، فکر معاش اور حصول روزگار کے لئے دن کی بیداریاں یہ سب ایک بیدار مغز اور زندہ قوم کے لئے بساط نظر و بصیرت پیش کر رہے ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَابْتِغَاؤُکُمْ مِنْ فَضْلِہٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِقَوْمٍ

اور اس کی نشانیوں سے رات اور دن میں تمہارا سونا اور اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے بے شک اس میں سننے والوں کے لئے

بَسْمَعُوْنَ (سورۂ روم) بہت پتے کی باتیں ہیں۔

یہ چمکتی ہوئی بجلیاں، جن میں شوخیٔ قدرت کے حسین دلکش نظارے رقصاں ہیں اور یہ آسمان سے اترتا ہوا پانی، جس سے اجڑی ہوئی کائنات ازسرِنو زندگی اور تروتازگی حاصل کرتی ہے، قدرت کی نشانیوں کو آشکار کرنے اور عقل و شعور رکھنے والے ضمیروں کو بیدار کرنے کے بیش بہا سامان ہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ	اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ
خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ	تم کو بجلی ڈر اور امید کے لئے دکھاتا
مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ	ہے اور آسمان سے پانی اتارتا ہے
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ	مرگئے پیچھے زندہ کرتا ہے، اس میں
لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (روم)	عقل مندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں

علی الاطلاق اقتدارِ الٰہی کا ایک اور بین ثبوت یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بسیط حکومت جس ہستی کے تفویض سے اس کی ایک آواز پر باشندگانِ ارضی لبیک کہتے ہوئے نکلیں گے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ	اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ
وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ ثُمَّ إِذَا	آسمان اور زمین اس کے حکم سے کھڑے
دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِنَ الْأَرْضِ	ہیں، پھر جب تم کو ایک بار پکارے گا
إِذَا أَنْتُمْ تَخْرُجُونَ۔	زمین میں سے اس وقت تم نکل
(روم)	پڑو گے۔

مذکورۂ بالا آیتوں کی طرح قرآن مجید میں اور بے شمار آیات

اس قسم کی موجود ہیں، جن میں تخلیق انسان، اور کائنات عالم میں فکر و نظر صرف کرکے مظاہر قدرت اور آثار فطرت کا مطالعہ کرنے کے لئے دل آویز اور دلنشیں پیرایہ میں دعوت دی گئی ہے، کیونکہ انسانی تخلیق پروردگار عالم پر زبردست دلیل ہے اور اس کا قریبی مظہر خود انسان کا نفس ہے اس میں وہ عجائب ہیں، جو عظمت خالق پر دلالت کرتے ہیں جن کی بعض گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے انسانی عمریں ناکافی ہیں۔

بدن انسان کے متعلقات اس کے پٹھوں ہڈیوں، رگوں اور نسوں پر غور کریں کہ کس طرح دست قدرت نے ایک دوسرے کو مضبوطی کے ساتھ باندھ رکھا ہے اور کس طرح ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنا کر ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

ہڈیوں کی ترکیب میں حکمت خالق کا کتنا بلیغ ثبوت ہے کہ وہ بدن کے لئے ستون ہیں، پھر ان کی نوعیت مقدار اور بوقلمون اشکال میں مختلف آثار قدرت پائے جاتے ہیں، بعض ہڈیاں چھوٹی اور بڑی ہیں بعض لمبی اور پست، بعض ٹیڑھی جھکی ہوئی اور گول تو بعض باریک اور کشادہ اور ٹھوس اور جوف دار،

نظام سر اور اس کی بے شمار ہڈیوں میں غور کریں کہ کس طرح قدرت نے سر کو بدن پر سوار کرایا ہے اور اسے سب سے اونچے مقام پر رکھا ہے اور کس حکمت سے اس کے اندر پانچ محسوس کرنے والی قوتوں (حواس خمسہ یعنی دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا، چھونا) کو پیدا کیا ہے دیکھنے کی قوت (حاسئہ بصارت) کو سب سے مقدم رکھا تا کہ بدن کے لئے دربان اور قاصد بن کر رہے ہر آنکھ میں سات طبقات بنائے ہر طبقہ سے ایک

امتیازی وصف اور مخصوص مقدار اور خاص منفعت وابستہ ہے، ان میں سے اگر ایک طبقہ بھی زائل ہو جائے یا ان کی شکل و ہئیت میں کچھ بھی تبدیلی رونما ہو جائے تو آنکھ اپنی بصارت کھو بیٹھتی ہے، موجد ازلی نے ان سات طبقات کے اندر عدسہ کی مقدار میں پتلی کو مرکوز کیا ہے، جو مشرق و مغرب اور زمین و آسمان کے درمیان کی لامحدود وسعتوں کو دیکھ سکتی ہے جس طرح دل تمام اعضاء کا سرچشمہ ہے، یہ پتلی بھی آنکھ کے لئے بمنزلہ قلب کے ہے، گویا یہ ملکہ ہے اور یہ طبقات پلکیں، پپوٹے سب اس کے خادم محافظ اور دربان ہیں، اگر ان میں سے کسی میں بھی کمی و بیشی ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

آسمانوں کی بلندیوں پہنائیوں، ان کی عظمت اور مضبوطی بنیادمیں قدرت کی کتنی عجیب کاریگری نمایاں ہے، ان کو کس حسن و نزاکت سے بنایا ہے، پھر چاند، سورج اور ستاروں کی گردش، ان کی مختلف شکلوں اور صورتوں کا معائنہ کریں کہ وہ کس طرح مشرق و مغرب کی دور دراز مسافت طے کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ذرہ ذرہ حکمت و عبرت کی دنیا لئے ہوئے نظر آئے گا۔

قرآن مقدس آسمانوں اور زمینوں کے ذکر سے جابجا آراستہ و پیراستہ ہے، جو شخص ان کے بار بار دہرائے جانے کے راز کو دریافت کرنا چاہے تو وہ حسب ذیل امور پائے گا۔

(۱) آسمانوں اور زمینوں کی عظمت و وسعت کی خبر دینا۔

(۲) ان کی قسم کھائی گئی ہے۔

(۳) ان میں فکر و نظر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(۴) کائنات ارض و سما کے خالق کی عظمت و قدرت پر استدلال کرنے کے لئے بندوں کو ارشاد فرمایا گیا ہے

(۵) ربوبیت الٰہی سے وحدانیت کا استدلال کریں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی سرچشمۂ ربوبیت و عبودیت ہے، اس کے سوا دوسری کوئی ہستی معبود نہیں۔

(۶) ان کی مضبوطی، حسن کاری، اور ان کے اجزاء کے باہم ملاپ اور ربط و ضبط سے کمال قدرت اور انتہائے حکمت کا روشن ثبوت۔

غرضکہ قرآن مجید میں چاند، سورج ستاروں اور قدرت کے اور بیشمار عجائب موجود ہیں، جن کی گہرائیوں تک انسانی عقول پہنچنے سے درماندہ و عاجز ہیں، چنانچہ بے شمار مقامات پر ان کی قسمیں کھائی گئی ہیں مثلاً۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ	قسم ہے برج والے آسمان کی۔
وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ	قسم ہے آسمان کی اور اندھیری رات میں آنے والے کی۔
وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا	قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اس کو بنایا،
وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ	قسم ہے چکر مارنے والے آسمان کی
وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا	قسم ہے سورج کی اور اس کے دھوپ چڑھنے کی۔
وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ	قسم ہے تارے کی جب گرے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی، جو اس کی ربوبیت و وحدانیت کا وجودی نمونہ ہیں، اس لئے قسم کھائی ہے تاکہ اس کے بندے اس سے متعارف ہو جائیں اور اس کی قدرت کا اعتراف کریں جاننے و سیع

ولا محدود آسمانوں کو اپنے قبضہ میں لئے ہوئے ہے اور ان کو اس طرح ثابت و برقرار کر رکھا ہے کہ نہ تو ان کے اوپر کوئی علاقہ ہے اور نہ ان کے نیچے کوئی ستون۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (رعد)

اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے اونچا کیا ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو۔

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ۔ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ۔ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (لقمان)

اور زمین پر پہاڑ رکھ دئے کہ تم کو لے کر جھک نہ پڑیں۔ اور اس میں ہر طرح کے جانور بکھیر دئے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پھر زمین میں ہر قسم کے خاصے جوڑے اگائے۔ یہ سب کچھ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اب مجھے دکھلاؤ اس کے سوا اوروں نے جو بنایا ہے کچھ نہیں بلکہ بے انصاف صریح بھٹک رہے ہیں۔

قدرت کی ان روشن نشانیوں میں قوموں کی زندگی و موت اور بقا و زوال کا راز مضمر ہے۔

لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ (انفال)

تاکہ ہلاک ہو جس کو ہلاک ہونا ہے قیام حجت کے بعد اور جئے جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد۔ اور بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

قرآن حکیم نے کائنات عالم میں غور و خوض کرنے کی دعوت دی ہے کہ یہ عالم کس ترتیب اور حسن نظام سے بنایا گیا ہے، اس وسیع کارخانے کے اجزاء و عناصر کیوں کر ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر انسان ان تمام حقائق میں فکر و نظر کرے تو خلاق عالم کی کمال قدرت و حکمت اور اس کی حسن لطافت و تدبیر کا بلیغ ثبوت مل جائے، قدرت نے نہ صرف اس عالم کو بنایا، بلکہ انسان کے لئے اس کو ایک گھر کی صورت پیدا کر دی، جس میں زندگی کی تمام ضروریات اور سازوسامان کو فراہم کر دیا ہے،

چنانچہ آسمان ایک بلند چھت ہے زمین فرش اور باشندوں کے لئے رہائش گاہ ہے، آفتاب و مہتاب دو روشن چراغ ہیں، جو اس میں روشنی پھیلاتے رہتے ہیں، ستارے زینت بخش قمقمے ہیں، جو اس گھر کے راستہ چلنے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں، جواہر اور کانیں اس کے اندر بطور ذخیرہ و سرمایہ کے پوشیدہ رکھے گئے ہیں، یہاں ہر چیز حسب حال فراہم کر دی گئی ہے، مختلف قسم کی نباتات پیدا کی گئی ہیں ہر طرح کے جانور اپنے اپنے کام انجام دینے میں مصروف ہیں، جن سے سواری غذا، دودھ، لباس اور مختلف فائدے حاصل کئے جاتے ہیں، انسان ان تمام چیزوں کا مالک بنایا گیا ہے وہ کائنات پر حکمرانی کرتا اور ان اشیاء میں اپنے حسب منشاء تصرف کرتا ہے۔

یہ تمام مظاہر اس امر پر برہان ہیں کہ اس عالم کو کسی زبردست قادر و برتر ہستی نے پیدا کیا ہے جس کی تشکیل و نظام کا معیار سب سے

اونچا ہے۔

انسان دست قدرت کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے جس کا پیکر قدرتی نقش و نگار کا روشن نمونہ ہے، یہ درمیانی قد و قامت، حسین و جمیل خط و خال جو حسن کاری کا آئینہ ہیں۔ یہ بہترین شکل و صورت جو پیکر انسانی کو پہنائی گئی ہے علم و عرفان کی شمع جو عقل و ضمیر میں روشن کی گئی ہے، اخلاق حسنہ اور علوم و معارف کو حاصل کرنے کے لئے جو بے نظیر فکر و نظر کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے، کیا یہ تمام چیزیں موجد ازلی کی صناعی و حسن کاری کا آئینہ دار نہیں ہیں؟ کیا یہ سب وجود خالق پر بین شہادت پیش نہیں کر رہے ہیں؟

انسان کو عقل و شعور حسن صورت اور حسن فکر و نظر سے سرفراز کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کے اندر تسخیر عالم کی کشش رکھی۔ ساری چیزیں انسان کی خدمت گزار، اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں کوشاں ہیں، آسمان مطیع و منقاد ہو کر انسانی مصلحتوں کے محور پر گردش کر رہا ہے، چاند، سورج، ستارے تسخیری قلادہ پہنے ہوئے اپنے مقررہ حدود و اوقات پر چکر کاٹتے ہیں، کائنات جوّی، ہوا بادل، برق و باراں اور عالم ارضی کی تمام موجودات، زمین، پہاڑ، سمندر، نہریں درخت، پھل پھول، نباتات و حیوان سب کے سب انسانی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے مسخر کر دئے گئے ہیں۔

وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ وَسَخَّرَ لَكُمْ	اور تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتی چلے اور تاکہ تم اس کے فضل سے تلاش کرو، تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ

مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
جَمِیْعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (سورہ جاثیہ)

اور تمھارے لئے آسمان اور زمین کی
تمام چیزوں کو مسخر کر دیا، اس میں سوچنے
والوں کے لئے بہت سی نشانیاں
ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّکُمْ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ
لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ
لَکُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَکُمُ
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ
وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ
وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ (سورہ ابراہیم)

اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین
بنائے اور آسمان سے پانی اتارا اور اس کے
ذریعہ پھلوں میں سے تمھاری روزی
نکالی۔ اور تمھارے لئے کشتی کو مسخر کر دیا
تاکہ وہ اس کے حکم سے دریا میں چلے اور
مسخر کر دیا تمھارے لئے ندیوں کو اور مسخر
کر دیا تمھارے لئے سورج اور چاند کو دستور
کے برابر اور مسخر کر دیا تمھارے لئے رات
اور دن کو اور تم کو تمھاری خواہش کی
تمام چیزیں دیں اور اگر اللہ کے احسان
کو شمار کرو گے تو پورا نہ کر سکو گے بے شک
انسان بڑا بے انصاف ناشکرا ہے۔

قرآن مجید کی یہ اور اسی قسم کی دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص آثار و مظاہر قدرت میں غور و فکر کرتا ہے، وہ اپنا دامن ایمان مشاہدہ کی دولت سے بھر لیتا ہے، بخلاف اس کے وہ شخص کتنا بدقسمت ہے جو اپنی عادت و طبیعت کی سرحد سے باہر قدم نہ اٹھائے اور اپنے ابنائے جنس کی

زندگی پر راضی ہو کر خود کو ان میں کا ایک فرد شمار کر بیٹھے اور نسلی وخاندانی الجھنوں میں پھنس جائے اس کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنے کا حق اسی شخص کو حاصل ہے، جو کٹھن منزلوں اور دشوار گزار راستوں کو طے کر کے آفاق کی سیر و سیاحت کرتا ہے اور توحید الٰہی، اس کی صفات کمال، جلال و جبروت، اور کائنات میں فطرت کے بے شمار مظاہر و شاہدات کا مطالعہ کرتا ہے، بعثت انبیاء کے مقصد، جزا و سزا کے مسئلہ پر غور کر کے اپنے ایمان وعقیدہ میں درستگی و استقامت پیدا کرتا ہے، اس کے سامنے یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں انسانی فطرت میں پیدا کر دی گئی ہیں، اگر انسانی فطرت اس مرکز سے ہٹ جائے جس پر اس کو قائم رہنا چاہیے تھا اور توحید الٰہی اور صفات باری تعالیٰ کا انکار کر بیٹھے تو پروردگار عالم انبیاء کو بھیج کر گمراہ انسانوں کو راہِ راست پر لاتا ہے اور ان کو اپنی فطرت سلیمہ کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے،

الحاصل قرآن مجید نے اصلاح عقیدہ کے باب میں مکمل و جامع تعلیمات پیش کی ہیں، اگر دنیا کے تمام عقلمند اور روشن ضمیر اصحاب مل کر اس بارے میں کچھ سوچتے تو اس سے بہتر یا اس کے مماثل اصول ہرگز پیش نہ کر سکتے، اس سے بڑھ کر شان وحدانیت اور کمال الوہیت کی اور کونسی روشن اور واضح دلیل مل سکتی ہے ؟

قرآن عزیز کے پیرائہ بیان سے یہ امر پایۂ ثبوت وتحقیق کو پہنچا ہے، کہ قدرت نے انسانی فطرت کے اندر وہ تمام صفات پیدا کر دی ہیں جو زندگی میں ہر وقت تمام اشخاص کو پیش آیا کرتی ہیں، جن پر کاربند ہو کر انسانیت کے مقام بلند تک پہنچ سکتے ہیں، وہ آئین و اصول

جن سے فطرت انسانی عبارت ہے یہ ہیں:۔ عدل و محبت، سچائی، نیکی، بھلائی، ایفاء عہد، مخلوق کی خیر خواہی مسکینوں کے ساتھ رحم و کرم، حاجت مندوں کی دست گیری، مظلوموں کی امداد، درد مندوں کی غم خواری، امانتوں کی ادائیگی۔ اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دینا، برائی سے درگزر، مصیبتوں میں صبر و تحمل، انتقام لینے کی جگہ انتقام، وقار و طمانیت، نرمی و رحم دلی، حسن اخلاق، باہمی محبت، رشتہ داروں اور اجنبیوں سے نیک سلوک، کسی کے عیب کی پردہ پوشی، ضرورت کے وقت ایثار، مصیبتوں میں اوروں کے کام آنا، ہر قسم کی نیکی اور بھلائی پر تعاون، ہمت و استقلال، اظہار حق پر ثابت قدم رہنا لوگوں کی اصلاح کرنا، دو کشیدہ خاطر انسانوں کے درمیان مصالحت پیدا کرانے کی کوشش، بزرگوں کی تعظیم، لوگوں کے مراتب کا پاس لحاظ، ہر شخص کے حقوق کی نگہداشت، گمراہوں کو راہ راست پر لانا، جہالت کی تاریکیوں کو علم کی روشنی سے بدلنا، حق کا شکر و احسان بجالانا غرضکہ یہ اور اس قسم کی دوسری صفات سے انسانی فطرت آراستہ و پیراستہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ فطرت کو ان اشیاء کے مخالف و مضاد امور سے بھی روشناس کرایا گیا ہے، پھر انہی فطری چیزوں کو سمجھانے بھلائیوں کا حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے کے لئے انبیاء کرام تشریف لائے، اس لحاظ سے شریعت کے جتنے احکام اور تعلیمات ہیں وہ تمام کے تمام فطرت کے عین مطابق ہیں چنانچہ مذہب نے اپنی تعلیمات واحکام پر فطرت کو گواہ ٹھہرا کر دنیا کے انسانوں کو ایمان و عمل صالح، فوز و فلاح اور سعادت و نجات کی طرف دعوت دی اور اپنی روشن نشانیوں سے کفر و ضلالت کے تاریک و کثیف

پردوں کو چاک کر دیا اور عقل و فطرت دونوں نے ہم آہنگی کے ساتھ شرعی تعلیمات و احکام کے فطری آئین و اصول کے مطابق ہونے کی شہادت دی۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ.

وہی تراش اللہ کی جس پر لوگوں کو تراشا، اللہ کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں، یہی ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔

(سورۂ روم)

اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ انسانی عقول نے قرآنی محاسن کا ادراک کیا اور اس کے افضل و اعلیٰ ہونے پر گواہی دی اور اس بات کا اعتراف کر لیا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بہتر جامع اور مکمل دین کسی نے پیش نہیں کیا، اس لحاظ سے وہ خود اپنے آپ پر گواہ اور گواہی دئے جانے کے قابل، خود ہی دلیل اور خود ہی دعویٰ دبرہان ہے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کوئی برہان بھی پیش نہ فرماتے تو خود اس کی ذات اس امر پر دلیل و برہان تھی کہ وہ منجانب اللہ ہے، یہ ایک نعمت عظمیٰ اور برہان کبریٰ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اتاری ہے، اس سے بڑھ کر بڑی نعمت اور روشن ہدایت اور کونسی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو راہ راست دکھایا اور اپنی رحمت کا سایہ ان کے سر پہ رکھا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا

اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں کا رسول

مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (مائدہ)

بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور ان کو شرک وغیرہ سے پاک کرتا اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ)

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے مذہب اسلام پسند کیا۔

دین کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کے لئے اہل بصیرت کی ضرورت ہے جن کی نگاہیں اس سرچشمۂ نور کا مشاہدہ کرتی ہیں، یہاں سے ان کے دلوں پر انوار و تجلیات کا فیضان ہوتا ہے، جن کے ذریعہ سے ان کے نفوس یقین ومشاہدہ کی اس مقدس سرزمین میں پہنچ جاتے ہیں، جو کہ دینی کمالات ومحاسن کا مرکز ہے، اس درجۂ علیا کے حاصل ہونے کے بعد اگر ان کے سامنے دینی تعلیمات وکمالات کی متضاد و مخالف اشیاء پیش کی جائیں تو یہ کسی طرح ان کو قبول نہیں کریں گے، ان کو ان مضاد اشیاء پر تاریکی و جہالت کے پردے پڑے ہوئے دکھائی دیں گے۔

یہی فرق ہے ان ارباب بصیرت اور اس گروہ کے درمیان جس کی توصیف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ "وہ ہر گمراہ پیش رو کے پیرو ہیں، ہر چیخنے والے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، یہ علم کی روشنی سے کوسوں دور ہو گئے اور ان کو کوئی مستحکم مرکز نہ ملا۔

یہی امتیازی فرق ہے اہل ایمان اور باطل پرست طبقہ کے درمیان جس نے ایمان افروز بصیرت کو اپنے اوپر حرام کرلیا، وہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو گھٹا ٹوپ تاریکی، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سوا اور کوئی چیز نہیں پاتے۔ ان کی نگاہیں رحمت الٰہی اور حیات ابدی کی سرحد کو عبور کرکے قدرت کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتیں۔

لیکن وہ ہستیاں جو اسلامی شان و عظمت کو بلند مقام تک پہنچانا چاہتی ہیں اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر اپنی زندگی کی پروا نہیں کرتیں، عقل و بصیرت کے جگمگاتے ہوئے ستارے اور ہمت و عزیمت کی مضبوط چٹانیں ہیں، جن کے دل انوار الٰہی کے جلوہ گاہ، جن کے مقدس نفوس میں خلاق عالم کی صفات کی شمع روشن اور جن کی نگاہوں میں بارگاہ قدس کے تمام مظاہر قدرت نمایاں ہیں۔

ان ہی اہل عرفان و بصیرت نے کائنات کے تغیر و تبدل کے اندر قانون قدرت کا مشاہدہ کیا تو ان کی نظریں اس حادثے کے امکان اور حشر و نشر کے اس بنیادی نظریہ کی گہرائی تک پہنچ گئیں جس کو انبیاء کرام نے پیش کیا ہے، ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ قرآن و سنت محض اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عالم سرے سے تباہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے اندر تغیر و تبدل واقع ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن و سنت نے یہ جو کہا ہے کہ تبدیل کائنات کے بعد جو آسمان و زمین ہوں گے، وہ موجودہ آسمان و زمین سے بالکل جداگانہ ہوں گے، آسمان شق ہوگا، سورج اپنی اصلی

حالت پر لوٹ جائے گا، ستارے منتشر ہو جائیں گے دریا پھوٹ پڑیں گے قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے پہاڑوں کو روئی کی طرح پرزے پرزے کر دیا جائے گا، زمین پھیل جائے گی اور آفتاب لوگوں کے سروں کے قریب آجائے گا، غرض کہ یہ تمام امور وہ ہیں جن میں نہ اعتراض کی گنجایش ہے اور نہ شک و شبہ کا مقام۔

کیا قرآن مجید اس کی خبر نہیں دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا؟ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ انسانی اعضاء اور ان کا گوشت پوست کہاں کہاں زمین میں بکھرا پڑا ہے اور کتنا کم ہو گیا ہے، پھر ان کو جمع کر کے دوبارہ از سر نو زندگی بخش دے گا؟ لیکن کتاب و سنت سے اس بات کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ اللہ تعالیٰ روحوں کو ایک دم فنا کر کے پھر ان کی جدید تخلیق کرے گا یا یہ کہ وہ آسمانوں اور زمین کو سرے سے نیست و نابود کر کے پھر نئے طور پر ان کو وجود بخشے گا بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کو بدل دیا جائے گا ان کی شکل و صورت اور ہیئت ایسی نہ رہے گی، جو موجودہ ہے، کیا کوئی علمی تحقیق و تفتیش اس کا انکار کرنے کی جرأت کر سکتی ہے؟

اتنی بات ضرور ہے کہ قرآنی بیانات اور آثار سنت اس کی حقیقت کے اظہار میں خاموش ہیں، اسی وجہ سے اس کی حقیقت اور اصل حالت پردۂ خفا میں ہو گئی مختلف لوگوں نے اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی، اہل عقل و تجربہ نے اس حقیقت پر سے پوشیدہ پردے اٹھانے میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا، لیکن سب بے سود ثابت

ہو کر رہ گئے، بلکہ اس راہ کے سالک جس قدر اس کٹھن منزل میں قدم آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، اسی قدر ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور علم کی روشنی کے بجائے جہل کی تاریکیوں میں گھر گئے۔ اس کا اصل سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ناواقفیت اور آپ کے ارشادات سے روگردانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اگر آپ کی روشن کی ہوئی شمع کی روشنی میں کسی مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو منزل مقصود تک آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے اور یہی ایک تمام مشکلات اور پیچیدگیوں سے نجات پانے کی صورت ہے، لیکن جو لوگ اس آسان اور سیدھے راستہ کو چھوڑ کر خار دار وادی میں قدم دھرنا چاہتے ہیں ان کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ اللہ رب العزت نے ایسے ہی اصحاب کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ۔ (سورۂ ملک)	اور کہیں گے اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے۔

(۲) عبادات کے ذریعہ افراد کی ظاہری و باطنی اصلاح

مبداء فیاض کی جانب سے انسان کو عقل و شعور کی بے بہا قوت عطا ہوئی ہے، جس کے ذریعہ سے اس کو تمام مخلوقات پر برتری و شرف حاصل ہے، انسان اسی خاصہ کی وجہ سے دیگر حیوانات و جمادات سے ممتاز ہے اور عبادت الٰہی کا مکلف قرار دیا گیا ہے جیسا کہ اس کی طرف اشارہ فرمایا

گیا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ	ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر
عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	امانت پیش کی، اُنھوں نے اس کو اٹھانے
وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا	سے انکار کر دیا، اور اس سے ڈر گئے اور
وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	اس کو انسان نے اٹھا لیا، بے شک وہ
الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا	بے ترس اور نادان تھا، تاکہ اللہ
جَهُوْلًا لِیُعَذِّبَ اللّٰهُ	منافق مردوں اور عورتوں اور شرک
الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ	مردوں اور عورتوں کو عذاب کرے
وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ	اور اللہ ایمان دار مردوں اور عورتوں
وَیَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ	کو معاف کرے اور اللہ بخشنے والا
وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ	مہربان ہے۔
غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔	(سورۂ احزاب)

اس آیت میں مفسرین کے قول کے مطابق امانت سے مراد تکلیف کا قلادہ انسان کے گلے میں پہنانا اور اطاعت و معصیت کے نتیجہ میں ثواب و عذاب کا مرتب کرنا ہے، چونکہ انسان کی فطرت میں امانت کے اس بار گراں کو اٹھانے کی قابلیت و استعداد پائی جاتی تھی اس لئے اس کو یہ تکلیف دی گئی اور چونکہ زمین آسمان اور پہاڑوں میں اس کو برداشت کرنے کی قوت و تاب اور قابلیت و صلاحیت نہیں تھی، اس لئے ان کو معذور رکھا گیا اور ان کے کندھوں پر یہ بھاری بوجھ نہیں ڈالا گیا، اللہ تعالیٰ کا یہ جملہ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (بے شک وظالم و جاہل تھا) انسانی فطرت پر ایک بلیغ استدلال ہے، کیوں کہ ظالم وہی ہے جو عدالت

انصاف نہ کرے لیکن اس کے اندر عادل ہونے کی استعداد ہو، اور جاہل وہ ہے جو عالم نہ ہو، مگر اس کے اندر عالم ہونے کی قوت وصلاحیت پائی جاتی ہو، یہی حال انسان کا بھی ہے، اس کے علاوہ دوسروں کی دو قسمیں ہیں، پہلا گروہ وہ ہے جو سراپا عالم و عادل ہو، جس میں جہل وظلم کا ادنیٰ شائبہ تک نہ پایا جائے، یہ فرشتوں کا گروہ ہے، دوسرا طبقہ وہ ہے جس میں سرے سے علم و عدل نہ پایا جائے اور نہ اس میں اس کی استعداد ہو جیسے حیوانات جمادات۔

جب انسان تمام مخلوقات میں سے انتخاب کرلیا گیا ہے اور اس کو عقل و بصیرت کی روشنی عطا کی گئی ہے جس کے ذریعہ سے وہ بہت سے تاریک غاروں میں ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہ سکے تو آسمان وزمین کی عجیب و غریب چیزوں میں غور و فکر کرنے کا انسان ہی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کارخانۂ قدرت کے عجائب میں اپنی قوت فکر و نظر خرچ کرے، کائنات کی تمام چیزوں، آسمانوں، ستاروں، چاند، سورج، حیوانات، نباتات اور ان کے پوشیدہ اسرار معلوم کرکے اپنی زندگی میں ان سے کام لے جیسا کہ ان آیات جلیلہ سے واضح ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمان
وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ	اتارا، پھر اس کے ذریعہ سے تمہارے لئے
رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ	پھلوں میں سے روزی نکالی اور تمہارے
لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ	لئے کشتی کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے حکم سے
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَ	دریا میں چلے اور تمہارے لئے ندیوں کو

سَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دائبین وَسَخَّرَ لَکُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهارَ آتاکُم کُلِّ مَا سألتموہُ وَاِنْ تَعُدُّوا نِعمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھا۔ (سورہ ابراہیم)

مسخر کر دیا اور مسخر کر دیا تمہارے لئے چاند اور سورج کو دستور کے برابر اور مسخر کر دیا تمہارے لئے رات اور دن کو اور تم کو تمہاری خواہش کی ساری چیزیں دیں اور اگر اللہ کے احسان کو شمار کرنا چاہو تو پورا نہ کر سکو گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس وسیع کائنات کا حکمراں بنا کر اس پر اپنے احکام و حدود کی پابندیاں عائد کر دیں، اپنے احسانات کا شکر حقوق اللہ و حقوق العباد کی نگہداشت اور خدائے واحد ہی کی پرستش کرنے کو واجب قرار دیا اسی کو آنحضرت صلعم نے کس بلیغ انداز میں معاذؓ کو مخاطب فرمایا ہے۔

یَامَعَاذ ھل تدری مَاحَقُّ اللّٰہِ عَلیٰ عِبادہ وَماحق العباد علی اللّٰہ قال معاذ اللّٰہ وَرسولہ اعلم قال فان حق اللّٰہ علی عبادہ ان یعبدوہ ولا یشرکوا بہ شیئاً وَحق العباد علیَ اللّٰہ اَلّا یُعذب من لا یشرک بہ شیئاً۔

اے معاذ کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق اپنے بندوں پر اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے، معاذ نے جواب دیا اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں، آپ نے فرمایا اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی پرستش کریں، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ وہ کسی بندہ کو جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا، عذاب نہ دے۔

اللہ تعالیٰ نے عبادت کو دین اسلام کا جزوِ اعظم ٹھہرایا ہے اور عبادت کو ظاہری و باطنی ذرائع کے لئے حسن و جمال کا غازہ، تہذیبِ اخلاق و عادات

اور اصلاح حالات کا وسیلہ قرار دیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

وضو :-

ظاہری صفائی۔ (۱) چہرہ ہاتھ پاؤں جو ہر دم کھلے رہتے ہیں بسا اوقات دنیوی کاروبار میں مصروف رہنے کی وجہ سے گرد آلود ہو جاتے ہیں، جس سے ایک قسم کی خراش اور تکلیف محسوس ہوتی ہے، وضو کا مقصد یہ ہے کہ یہ سب دھل کے صاف ہو جائیں اور نماز بلا کسی تکلیف کے اطمینان دل سے ادا کی جائے۔

(۲) وضو حفظ ما تقدم کا بہترین ذریعہ ہے اور بہت ساری بیماریوں کے حملے کو روکتا ہے، جدید سائنس اور طبی اکتشافات سے یہ امر پایۂ ثبوت و تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ گرد و غبار کے ذرات جو فضا میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے رہتے ہیں ان کے اندر بے شمار جراثیم پرورش پاتے ہیں، چونکہ انسان کا چہرہ ہاتھ پاؤں اکثر کھلے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ ذرات ان پر جم جاتے ہیں، جن کے ساتھ ساتھ جراثیم بھی جسم میں سرایت کر کے مہلک امراض کا باعث ہوتے ہیں، وضو کرنے سے یہ اندیشہ جاتا رہتا ہے اور اعضاء بھی پاک صاف ہو جاتے ہیں۔

(۳) مشاہدہ کیا گیا ہے کہ انسانی بدن سے ہر وقت زہریلے مواد پسینہ کی شکل میں خارج ہوتے رہتے ہیں، بسا اوقات انہی بخارات کے چند زہریلے اثرات مسامات بدن میں جمع ہو جاتے اور خطرناک امراض کا پیش خیمہ ثابت ہوتے، اور صحت و تندرستی کا خاتمہ کر دیتے ہیں، اگر ان کی صفائی کا خیال رکھا جائے، بالخصوص کھلے ہوئے اعضاء کو

دھویا جائے، تو یہ خطرہ دور ہو جاتا ہے، چنانچہ وضو اس کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔

باطنی صفائی۔ وضو سے اعضاء کی نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی صفائی بھی مقصود ہے، اس سے اکثر و بیشتر ادنیٰ درجہ کے روحانی امراض کا ازالہ بخوبی ہو سکتا ہے، کیونکہ ہاتھ، زبان، ناک، کان وغیرہ سے جس قدر چھوٹے چھوٹے گناہ سرزد ہوا کرتے ہیں، وہ سب وضو کے ذریعہ سے ترتیب وار دھل جاتے ہیں، بلحاظ گناہ کے کثرت و تنوع کے اعضاء وضو کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے۔

پہلے چہرہ دھویا جاتا ہے، جس کے اندر زبان ہے ظاہر ہے کہ بہ نسبت اور اعضاء کے زبان سے بہت زیادہ گناہوں کا صدور ہوتا ہے، ناک اور آنکھ کے گناہ اس کے الگ بھگ ہیں، ان کے بعد ہاتھوں کے دھونے کا درجہ ہے کیونکہ زبان سے گفتگو کرنے اور آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی ہاتھ کو چھونے کا موقع ملتا ہے، سر چونکہ چہرہ کے قریب ہے اور چہرہ سے زیادہ گناہ سرزد ہوتے ہیں اس لئے صرف مسح کر لینا سر کی صفائی کے لئے کافی ہے، کیونکہ ایک گناہگار کے قریب رہنے والے سے خفیف گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے، اگر اس کو بھی دھونے کا حکم دیا جاتا تو ایک قسم کی تکلیف ہوتی۔

ابن عباسؓ نے اعضاء وضو کے اسرار پر کس قدر عارفانہ نکات میں روشنی ڈالی ہے۔

ہاتھوں کا دھونا جنت کے دسترخوانوں سے لذت یاب ہونے کے لئے، کلی کرنا پروردگار عالم سے شرف ہم کلامی حاصل کرنے، ناک میں

پانی لینا جنت کی روح پرور خوشبو سونگھنے، چہرہ کا دھونا کروئے جلال وجبروت کی طرف نظر کرنے، ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا کنگن پہننے سر کا مسح تاج زرنگار زیب سر کرنے، کانوں کا مسح مقدس کلام الہی کو سننے اور پاؤں کا دھونا جنت میں داخل ہونے اور فرش مخملین پر چلنے کے لئے ہے۔"

عام ظاہری نفاست۔ افراد کو عام ظاہری نفاست وصفائی کا خیال رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تاکہ میل کچیل، بدن کی بدبو اور گندگی کی وجہ سے نمازیوں اور رفقاء کو تکلیف نہ ہو، نیز اس کا لحاظ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اکثر دوست احباب سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے مجلسوں اور تقریبوں میں شرکت کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر ظاہری نفاست و نظافت کا خیال نہ رکھا گیا تو دوستوں اور اہل محفل کو تکلیف پہنچے اور ان کے دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہونے کا باعث ہے حالاں کہ انسانی اور اخلاقی فریضہ یہ ہے کہ ہردم مخلوق کی خیرخواہی اور ابنائے جنس سے ربط وضبط پیدا کرنے بالخصوص مقدس محفلوں میں شریک ہونے کا خیال رکھا جائے، نفس کے نشاط وسرور کا راز نفاست وپاکیزگی میں مضمر ہے کیونکہ انسانی نفس کو جسم سے گہرا تعلق ہے، جسم جن آثار و کیفیات سے متاثر ہوتا ہے، نفس پر بھی ضرور ان کا اثر پڑتا ہے، جسم میں اگر نظافت و نفاست ہے تو نفس میں نشاط و سرور پیدا ہوتا اور اس سے تمام کسل و ماندگی دور ہو جاتی ہے اس صورت میں اس کے لئے عبادت کا فریضہ ادا کرنا سہل ہو جاتا ہے اور وہ اپنی رضامندی اور شوق و وجدان سے یہ فرض ادا کرنے میں

محفوظ ہوتا ہے، جب وہ اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس پر اسرار الٰہیہ کا انکشاف ہوتا ہے اور اس مقام عرفان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، جہاں سے انوار و تجلیات ربانی کی بارش اس کے دل کی فضاؤں پر ہوتی رہتی ہے، اس کے بعد اس کو دنیوی امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس فریضۂ عبادت میں وجدانی و ذوقی کیفیت سے محفوظ ہوتے رہنے کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے، اب اس کے اس فرض کی ادائیگی اور "توجہ ذکر" کی راہ میں کوئی دنیوی طاقت اور انہماک حائل نہیں ہو سکتا۔

پانی سے ظاہری صفائی و نظافت حاصل کرنے میں اس طرف بھی لطیف اشارہ ہے کہ باطن کی صفائی و نفاست کی طرف توجہ کی جائے اور نفس کو فاسد عقائد اور ردی اخلاق کی گندگیوں سے پاک صاف رکھا جائے، اس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے الطہور شطر الایمان — صفائی و شائستگی نصف ایمان ہے —

اس لئے شارع نے ظاہری پاکی کی طرف شدت سے توجہ دلائی ہے تاکہ اس کے ذریعہ افراد کے نفوس میں باطنی صفائی کی جھلک پائی جائے اور وہ فاسد اخلاق کی تاریک سرحدوں کو پھاند کر تہذیب و شائستگی اور اخلاق و محاسن کی مقدس سرزمین میں قدم دھریں باطل عقائد کو دل و دماغ سے دور کر کے پاکیزہ جذبات کی پرورش کریں۔

نماز :-

انسان کی تخلیق جن عناصر سے ہوئی ہے وہ فنا پذیر ہیں، ان میں

ہر وقت تغیر و انحطاط کے آثار رو نما ہوتے رہتے ہیں آخر کار پندار و غرور کی رعنائیوں کا یہ بدست پیکر فنا کا تلخ گھونٹ پی لیتا ہے، اس کے حسن و جمال کا آفتاب قبر کے تیرہ و تاریک گوشوں میں دفن ہو جاتا ہے اور اس کے اجزا، بدن خاک میں مل کر ذرات کی شکل و صورت اختیار کر کے فضاؤں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اب ابدیت اور فضیلت و برتری اس جسم خاکی کو کیسے نصیب ہو سکتی ہے، جو کہ فنا کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے؟ پھر وہ کونسی لازوال شے ہے، جو سرمدی بقا و حیات کا مظہر اور روحانی لطافتوں اور ربانی تجلیات کا سرچشمہ ہے؟

ایک بجلی ہے جو قالب انسان کے رگ و ریشہ میں کوندتی پھرتی ہے۔ جس سے کار زار حیات سرگرم ہے اور وہ روح ہے، جو اس انسانی جسم میں جاری و ساری ہے، جو زندگی کا مبداء اور شعور و ادراک کا منبع ہے، یہی وہ روح ہے جو ہر دم مبداء فیاض سے فیوض و برکات حاصل کرنے کی آرزو مند رہتی ہے، یہی وہ بجلی ہے جو مظہر جلال و جبروت سے ہر لمحہ تڑپ اور چمک پیدا کر کے جسمانی خواہشوں کے خرمن پر گرنے کے لئے بے قرار رہتی ہے، اور یہی وہ جوہر فروانی ہے، جو خالق حقیقی سے کمال اتصال پیدا کرنے کی مشتاق رہا کرتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ انسان کس طرح اپنے خدا سے اتصال پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے طوفانوں میں گھرا ہوا، دن بھر دنیوی ہنگاموں اور کاروبار میں مصروف رہتا ہے، جب رات کو اپنے گھر لوٹتا ہے کچھ کھا پی لیتا ہے، اس پر مدہوشی اور بدمستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے تو آرام سے بستر پر دراز ہو جاتا ہے ورنہ اپنے ابنائے جنس کی صحبتوں سے

لطف اندوز ہونے کے لئے چلا جاتا ہے، جہاں کچھ ایسی ہنسی مذاق کی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جس سے چند لمحات کے لئے اس کے بشرہ پر اور رگ رگ میں سرور و نشاط کی لہریں دوڑ جاتی ہیں، مگر اندرونی قوتوں پر غفلت چھا جاتی ہے؟ اس کی روح مبداء فیاض سے کیوں کر فیض یاب ہو سکتی ہے جب کہ وہ زندان خاکی میں مقید اور قالب انسانی کی رگ و ریشہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے؟ دوستوں کی محفلوں میں شریک ہونے اور دنیوی کاروبار اور مشاغل میں سرگرم رہنے کی وجہ سے دن یا رات کسی لمحہ میں اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنے وجود ازلی کی طرف متوجہ ہو سکے۔

غرض یہ انسان اپنی زندگی کے منازل بسرعت و تدریج اسی طرح طے کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی عمر کے تقریباً سو مرحلے گزر جاتے ہیں اور وہ اس بے بسی و بے سروسامانی کے عالم میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر جاتا ہے کہ اس کی روح کو اپنے خالق حقیقی سے باریاب ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

روح کا اپنے منبع فیض سے اتصال پیدا کرنا زندگی کی سب ضرورتوں سے اہم ہے، بقاء دوام کی بنیادوں کو استوار کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنی توجہ روح کی طرف مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ روح جب تک انسانی جسم کے اندر جاری و ساری ہے، تمام کمالات و مقامات حاصل کیے جا سکتے ہیں، روحانی اصلاح و ترقی کی طرف توجہ کرنا خود انسانی زندگی کی تکمیل اور بقائے احسن کی دلیل ہے، جب انسان ہی اپنی روح سے بیگانہ رہا، اس کی حفاظت نہ کر سکا اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں

کوتاہی سے کام لیا، تو اس سے اس کی اس روح کا تعلق منقطع ہو گیا، جو فیضانی تجلیوں کا مظہر تھا اور اس کی وہ روح مردہ ہو چکی، جو کسی وقت بجلیاں بن کر پندار ہستی کے خرمن پر گرا کرتی تھی، ظاہر ہے کہ اس کے اثرات جسم انسانی میں یا خود انسان پر، جو روح کا مظہر ہے، کیا انقلابات و تغیرات رونما کرتے ہیں؟ انسانی عقل و شعور کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اس کے فکر و نظر کا توازن بگڑ جاتا ہے، اس پر انقباض و تکدر کی مختلف کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں، اس کو کسی چیز میں قناعت نہیں ہوتی، ذہن و دماغ کے گوشوں میں وحشت و حیرت کے بیابان سرگرداں نظر آنے لگتے ہیں، وہ وحشت و حیرت کے ان بنیادی اسباب پر بے بنیاد خیال آرائیاں کرتا ہے، ان کو دور کرنے کی بے سود تدابیر سوچتا ہے کبھی وہ خیال کرتا ہے کہ اُسے دنیوی ضرورتیں فراہم نہیں ہوئیں، اس نظریے سے وہ عزت اور شہرت کی چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے قدم آگے بڑھاتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے، حالاں کہ وہ درحقیقت ذلت اور مصیبت کے خطرناک تاریک غاروں میں گرتا جا رہا ہے، کبھی اس کے دل میں یہ گمان ہوتا ہے کہ اس نے دنیوی کاروبار میں زیادہ حصہ نہیں لیا اور دولت کے خزانے جمع نہیں کئے حرص و ہوس کی چنگاریاں اس کے دل میں بھڑک اٹھتی ہیں، وہ دنیا کمانے اور دھن دولت جمع کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے چنانچہ عزت و شہرت کے دیوتا اس کے قبضہ میں آجاتے اور دولت و ثروت کے بھوت اس کے سامنے ناچتے ہیں، جو اس کو تباہی و بربادی کی وادیوں میں لے جانے کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔

دولت و عزت حاصل ہونے کے باوجود اس کی سرگردانی نہیں جاتی

وہ سکون تلاش کرنا چاہتا ہے، لیکن کہیں نہیں ملتا، وہ اطمینان اور اصل خوشی کے لئے بے قرار رہتا ہے، مگر ہر قدم پر پریشانی اور مصیبت اس کا استقبال کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسی کشمکش کی حالت میں اس ہنگامہ زار دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، اس بیچارے کو اتنا پتہ تک نہ چلا کہ اگر اس کے ہاتھ میں ساری کائنات بھی سمٹ آتی اور دنیا بھر کی عزت اس کو حاصل ہو جاتی، تب بھی اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں کمی واقع نہ ہوتی اس کی حرص و آز کے طوفانی شعلے کسی طرح نہ بجھتے، بلکہ ہوس کے تند و تیز جھونکوں سے اور بھڑک اٹھتے اور اس کی ہستی کو جلا کر خاکستر کر دیتے۔

غرض کہ ان مشاہداتی کیفیات سے ظاہر ہے کہ مرکز وجود سے روح کا تعلق بہرصورت ضروری و لابدی ہے، خواہ اس کے لئے دن کے چند ہی لمحات کیوں نہ میسر آجائیں، اسی اہم مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف مذاہب نے روحانی قوتوں کو مادی طاقتوں کے تسلط سے رہائی دلانے کے لئے مختلف عبادات کے مختلف طریقے اور توجہ الی اللہ کے متعدد راستے ایجاد کئے، لیکن ان تمام میں زیادہ آسان اور زیادہ بلیغ و جامع طریقہ وہ ہے جس کو اسلام نے پیش کیا ہے جو "روحانی شاہراہ" کہلائے جانے کا مستحق ہے جس پر روح انسانی گزر کر اپنے خالق حقیقی سے اتصال اور راہ و رسم پیدا کر سکتی ہے۔

ایک سچا مسلم و مومن وضو کر کے قبلہ رو ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دل کی گہرائیوں سے "اللہ اکبر" کہتا ہے تو نہیں معلوم کہ اس کی آنکھوں میں کتنے جلوے سماتے ہوں گے۔ اور اس کی روح میں جلال و کبریائی کی کتنی

تجلیاں رقص کرتی ہوں گی!

خصوصاً اس وقت جب کہ کوئی شخص کسی ہولناک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو جس میں اس کی زندگی و موت کا سوال درپیش ہو بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو کر نستعین والے [illegible] پڑھتا ہے اور ماسوا اللہ کی تمام مرعوب کن طاقتوں کو دل سے نکال دیتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام قوتوں کا مظہر ہے، وہی کارساز حقیقی ہے میری پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے والا بھی وہی ہے، اس کے سوا میں کسی طاقت کے روبرو سر نہ جھکاؤں گا میں اس ذات واحد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا۔

جب اس طرح سے کوئی شخص ذوقی و وجدانی کیفیات کے ساتھ والہانہ طور پر عزم خالص کے ساتھ قدم بڑھاتا ہے تو اس کا دل شکوک و شبہات سے پاک ہو جاتا ہے، ربانی تجلیات اس کے دل پر جلوہ گر ہوتی ہیں، انسان اپنے دل کے اندر سکون و طمانیت کے وہ تمام سامان پیدا ہوتے دیکھ لیتا ہے، جو اس کی خوش گوار زندگی کی بنیاد ہیں، پھر جب اس کے بعد سورۂ فاتحہ اور چند آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے معانی و مظاہر کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے واسطۂ اتحاد و اتصال میں اور اضافہ ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں بارگاہ خالق سے قریب تر اور انسانیت کے مقام بلند پر پہنچا ہوا پاتا ہے

سکون قلب۔ انسان نیرنگیوں کا مجموعہ ہے اس پر تغیرات و انقلابات کے مختلف آثار طاری ہوتے رہتے ہیں، جب کبھی

[illegible] و دولت ہاتھ آتی ہے، تو گھمنڈ اور غرور میں ڈوب جاتا ہے اپنے جامہ سے باہر نکل کر سرکشی کرنے لگتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اگر تنگی و مصیبت میں [illegible] مضطر و پریشان ہو جاتا ہے، اس کے دل پر حسرت و مایوسی کے جذبات مسلط ہو جاتے، دنیا اس کی نظر میں تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس وقت اپنے خالق کو یاد کرتا اور اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر گریہ و زاری کرتا ہے اور پنج وقتہ نمازوں کو پابندی سے ادا کرتا ہے تو اس کی پریشانی زایل ہو جاتی ہے نفس میں طمانیت اور سکون کی حالت پیدا ہو جاتی ہے، وہ تنگی و مصیبت، کشایش و خوش حالی غرض کہ ہر خیر و شر پر رضا مند رہتا اور ہر امر میں پروردگار عالم کی مشیت و ارادہ کو مقدم سمجھتا ہے۔

خشوع و خضوع۔ حرص و آز کے برے جذبات دل سے دور ہو جاتے ہیں اور وہ تزلزل اور اضطرابی کیفیت، جو بندے کے دل میں خوف و ہراس کا باعث ہوتی ہے، جاتی رہتی ہے کیونکہ نماز میں گریہ زاری، مناجات کی وجہ سے رقت قلبی اور خشوع و خضوع کی لطیف کیفیات پیدا ہوتی ہیں، جن [illegible] کے اندر آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور [illegible] ن عزیز اور متاع گراں مایہ کو ایثار و قربانی [illegible] ہو جاتا ہے، جو دنیوی خواہشات اور حرص و آز کے جذبات کو فنا کر دیتا ہے۔

اصلاحِ نفس۔ نماز ہر قسم کی کدورتوں اور بری خواہشوں کا قلع قمع کرتی ہے، کیونکہ نماز میں چند ایسے جلالی و جمالی مناظر مثلاً تلاوت

قرآن، رکوع و سجود، تسبیح و تہلیل اور مناجات و دعا وغیرہ جمع ہیں جو ایک نمازی کو دنیوی افکار و مشاغل سے علیحدہ کرکے حضورِ الٰہی میں پیش کردیتے ہیں، نگاہوں میں خشیت ایزدی اور جلال و جبروت کے جلوے سمائے ہوئے رہتے ہیں، جن سے نفسانی خواہشات اور برے جذبات قریب آنے نہیں پاتے، گناہ کی رغبت خود بخود زائل ہوجاتی ہے، اسی کی طرف قرآن عزیز نے اشارہ کیا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ — بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

(سورہ عنکبوت)

اخلاق فاضلہ — انسانی زندگی کی تکمیل کا راز تہذیب اخلاق اور شائستگی نفوس میں مضمر ہے، اخلاق ہی وہ آئینہ ہے جس میں شخصیات کا عکس نمایاں ہوتا ہے، نماز کے ذریعہ سے جو کیفیات و تاثرات نفس پر مرتب ہوتے ہیں وہ تمام اخلاقیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

ادب — بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونے کا طریقہ، قیام و جلوس کی ہیئت، تلاوت و مناجات کے دوران میں کلام نہ کرنا، امام کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرنا، دل و دماغ کو اس کی قرارت کی طرف متوجہ کرنا، اس کے حرکات و سکنات کی پیروی کرنا یہ اور اس قسم کے آداب ہیں، جو انسانی نفس کے اندر ادبی کیفیات کا رنگ پیدا کرتے ہیں۔

تواضع — چہرہ انسان کے جسم میں حسن و جمال کا آئینہ اور شرافت و

عظمت کا آبگینہ ہے جس کو نماز میں زمین پر رکھنا پڑتا ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا انسان کیوں نہ ہو، اس کے ساتھ شانہ کو شانہ لگائے کھڑا رہنا اور امام کی ہر حالت میں اتباع کرنی پڑتی ہے، خواہ وہ مقتدی سے کتنا ہی کم مرتبہ کیوں نہ ہو، یہ وہ امور ہیں جو تواضع و انکسار اور اطاعت و انقیاد کی صفت پیدا کرتے ہیں۔

حلم۔ اپنی قوت و اقتدار کے جذبہ کو امام کے بالکل تابع کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر امام قرأت یا رکوع و سجود کو طویل کردے تو اس کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں، یہ ممکن نہیں کہ کوئی نماز کو چھوڑ کر امام کے دائرہ اطاعت سے باہر ہو جائے، ہر حالت میں صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے، یہ چیز نہ صرف نماز میں کام آسکتی ہے بلکہ اس سے زندگی کے آلام و مصائب کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

حیا۔ نماز کی دیگر شروط کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ کپڑے صاف ستھرے ہوں، جسم میل کچیل سے پاک اور ظاہری نفاست سے آراستہ ہو، یہ دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ کوئی پوشیدہ عضو کھلا تو نہیں ہے کسی قسم کی لغزش پیدا ہونے کا خطرہ تو نہیں غرض کہ یہ وہ احتیاطی تدابیر ہیں جو انسان کو حیادار بنانے کا ذریعہ ہیں. اور اس کے اندر حزم و احتیاط پیدا کرنے کی کفیل، یہاں تک نماز کی جمالیاتی تصویر کا ایک رخ پیش کیا گیا، جو انفرادی حیثیت سے افراد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اب تصویر کا دوسرا اجتماعی رخ۔

نماز باجماعت ——— میں پیش کیا جاتا ہے جو مجموعی طور پر جماعتی تشکیل و تنظیم اور ربط و اتحاد کے روح پرور مناظر پر روشنی ڈالتا

ہے تفصیل حسب ذیل ہے ۔

محبت و اتحاد کا مظاہرہ: یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے، ہر شہر والے اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دوسرے شہر والوں کے محتاج رہتے ہیں، ہر ملک میں مختلف انسانی گروہ پائے جاتے ہیں، سوسائٹی فقیر و تونگر، قوی و کمزور، تندرست و بیمار، عالم و جاہل سبھی قسم کے افراد سے عبارت ہے ——— جب مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ایک جگہ مجتمع ہو کر نماز ادا کرتی ہیں، تو ان کے آپس میں ربط و ضبط اور اتحاد و محبت کا نظام قائم رہتا ہے، غم خواری، ہمدردی اور انسانی فرائض کو بجالانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ کسی پر آفت و مصیبت آ پہنچی ہے تو دوسرا اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، دینی امور کے ساتھ ساتھ دنیوی کاروبار میں صلاح و مشورہ کیا جا سکتا ہے، معاشی و اقتصادی مسائل کو جانچنے کا موقع ملتا ہے ——— نمازیوں کی صورت حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو احساسات ابھرتے ہیں، مالدار غریبوں کی پرورش کرنے قوی کمزوروں کی دستگیری اور تندرست بیماروں کی غم خواری و ہمدردی کی طرف بالطبع مائل ہوتا ہے۔ یہ وہ احساسات ہیں جو نماز باجماعت کے ذریعہ پیدا کرائے جا سکتے ہیں، اس کے مظاہر حضرت عمر فاروق رضؓ میں کس درجہ پائے جاتے تھے اس کا اندازہ آپ کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے کہ ۔

"تم ہمیشہ نماز میں اپنے بھائیوں پر نظر رکھو، شاید کوئی بیمار نہ آسکے اگر وہ بیمار ہیں تو ان کی تیمارداری کرو اگر کوئی صحیح و تندرست

نہ آئین تو ان کو تنبیہ کرد"

مساوات - نماز باجماعت کا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے اندر حریت و مساوات کا احساس پیدا کرایا جائے ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام گروہ بلا امتیاز رنگ و بو امیر و غریب، تونگر و محتاج، خادم و مخدوم تمام کے تمام بارگاہ خداوندی میں شانہ سے شانہ لگائے، آستانۂ جمالِ قدس پر عجز و نیاز سے اپنی پیشانی جھکاتے ہیں، اکثر اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک وہ شخص جو دنیوی فضل و کمال اور مرتبہ و جاہ میں بڑھ چڑھ کر ہے اپنے سے کم مرتبہ شخص کو جب دیکھتا ہے کہ وہ برابر عبادت الٰہی کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے تو وہ اپنے آپ شرمندہ ہوتا اور اپنی سرداری اور جاہ و مرتبہ کو بھول جاتا ہے۔

اطاعت وانقیاد - نماز باجماعت میں آداب و آئین کی پابندی اور امام کی اتباع کرنی پڑتی ہے، جس سے جہاد کا جذبہ اور اولی الامر اور خلیفہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی عادت پیدا ہوتی ہے، جس طرح سے کہ ایک فوجی سردار جب وہ اپنے لشکر کو فوجی تعلیم دیتا ہے اور قواعد سکھاتا ہے، تو فوج پر اس کے ہر اشارہ اور ہر حکم کی تعمیل ضروری ہے اسی طرح مقتدیوں کو امام کی اتباع میں اس کے ہر اشارہ و فعل پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

مادی وروحانی اصلاح محبت و انصاف، حریت و مساوات اور ارشاد و تعلیم، جو قوموں کی زندگی کا اساس ہے، جس پر قوموں کے نظام عمل، معاملات، تجارت، زراعت، تہذیب و عمران غرض کہ

تکمیل حیات کے تمام ساز و سامان کا دار و مدار ہے، جس میں ہر خاص و عام کی صلاح و بہبود کا راز پوشیدہ ہے، یہ سب چیزیں نماز باجماعت سے حاصل ہوتی ہیں ــــــ ایک امیر جس کے پاس نوکر چاکر، مال و دولت، جاہ و حشمت غرض کہ دنیوی شان و شوکت کے سب سامان فراہم ہیں، ایک غریب و مفلس کے ساتھ جو بالکل نادار اور فلاکت زدہ ہے، شانہ سے شانہ ملائے، پاؤں سے پاؤں جمائے بارگاہ خداوندی میں عجز و نیاز کا مظاہرہ کرتا ہے اور اسے اپنی کسر شان اور کسی قسم کا ننگ و عار نہیں سمجھتا، قطع نظر اس کے اس سے بھی اعلیٰ مرتبہ والا جو سلطان یا حاکم کہلاتا ہے، جب مسجد میں غریب ادنی مرتبت انسانوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر امام کی اتباع کرتا ہے تو اس وقت تمام نفوس میں خشوع و خضوع اور جلال و جبروت کی عظمت و ہیبت کے جذبات مسلط ہو جاتے ہیں، رعایا میں عدل و انصاف اور محبت و اتحاد کا نظام قائم ہو جاتا ہے، اسی طرح دن میں پانچ مرتبہ مظاہرہ کیا جاتا ہے تو پروردگار عالم کی ربوبیت اس کی شان و عظمت کے مناظر نگاہوں میں سما جاتے ہیں، کسی کو ظلم و استبداد روا رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی اور کسی کی حق تلفی کا خیال تک دل میں نہیں گزرنے پاتا۔

صحیح شاہراہ زندگی۔ صفوں کی درستگی اور استقامت کی طرف شریعت نے جو توجہ صرف کی اور اس کی نگہداشت پر جو زور دیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر کام میں راستی، تمام حرکات و سکنات میں توازن و یگانگت ہو، ان کا مقصد و مدعا ایک، راہ عمل

ایک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تنظیم و اتحاد کی مضبوط زنجیر بن جائیں جس کو دنیا کی کوئی استبدادی قوت وطاقت درہم برہم نہ کر سکے، یہی نظام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ایک اہم راز ہے یہی وہ انسانی زندگی کی شاہراہ ہے جس پر گامزن ہو کر انسانیت کا مقام اور نصب العین حاصل کیا جا سکتا ہے، جس طرح سے ایک مسلمان کی نظر نماز میں ایک ہی مرکز کی طرف لگی رہتی ہے تمام حرکات و سکنات کا توازن ایک ہی اعتدال پر برقرار رہتا ہے، نظر نہ دائیں جانب مڑ سکتی ہے اور نہ بائیں طرف اسی طرح اس کا ہر کام خواہ دینی ہو یا دنیوی، راست اور مستقیم ہونا چاہئے۔ فکر و نظر کا مرکز اور مقصد و مدعا کا زاویہ صرف ایک ہی ہو اور وہ راہ حق میں استقامت و ثبات، اس کا جینا مرنا سب اسی کے لئے وقف ہو، جب اس طرح سے ایک نمازی پابندی کرنے لگتا ہے، تو اس کے دل میں سکون و وقار اور طمانیت پیدا ہوتی ہے، اس کی ہر سانس اور قول و فعل میں توازن اور یکسوئی کی جھلک پائی جاتی ہے، اس کا قدم جادۂ حق سے نہیں ڈگمگاتا اور اس سے جان بوجھ کر کوئی لغزش سرزد نہیں ہوتی، پھر تمام تر کامیابی اور فلاح و فوز کا سہرا اس کے سر ہوتا ہے

——— اصلاح نفس، حیا، صبر و تحمل، عزیمت و استقلال، انقیاد و ادب، مساوات، محبت و اتحاد وغیرہ یہ وہ اخلاق فاضلہ اور مہتم بالشان امور ہیں جو انسان کو نماز کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، انسانی زندگی میں اصلاح نفس اور توجہ الی اللہ کے لئے عبادت کا یہ طریقہ مشروع نہ ہوتا تو تمام اخلاق و فضائل کا خاتمہ ہو جاتا، حرص و ہوس

اوہام و مفاسد کے جذبات اذہان و نفوس میں جاگزیں ہو جاتے، طبائع میں باہم تنفر، حسد و بغض اور انسانیت سوز خواہشات پیدا ہو کر زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ نماز تمام برائیوں کو روکنے والی ہے، اس سے وہ تمام اخلاق و فضائل حاصل ہوتے ہیں، جن کا ذکر ابھی اوپر ہوا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں مشاہدات کی دنیا میں آ رہی ہیں، حالانکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ کتنے ایسے نفوس ہیں جو نمازیں پڑھتے ہیں اس کے باوجود وہ فسق و شر میں مبتلا ہیں، ان کی حالتوں میں ذرا بھر تغیر و تبدل نہیں ہوتا، ان کے نفوس و اذہان میں اصلاح و تزکیہ کے بجائے فتنہ و فساد، بغض و حسد کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ اوپر نماز کے جتنے محاسن و فضائل بیان کیے گئے اور جن عظیم الشان مقاصد پر روشنی ڈالی گئی، یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے، جب تک کہ نماز کے تمام شروط اور اس کے جملہ آئین و آداب کی پابندی نہ کی جائے، نماز کے مقاصد، اس کے ثمرات اور فوائد مترتب ہونے کے لئے حسب ذیل اصول پر کاربند ہونا ضروری ہے۔

اخلاص۔ انسان اپنے پروردگارِ عالم کی عبادت خلوص دل اور صدق نیت سے ادا کرے، جس کے اندر کسی دینی اور دنیوی غرض ملحوظ نہ ہو، عبادت کسی ثواب کی امید اور عذاب کے خوف سے نہ کی گئی ہو، اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی دخل ہو تو وہ اخلاص کے منافی ہے،

اس کی روشن مثال آنحضرت صلعم نے اس طرح سے دی ہے

لا یکون احدکم کالعبد السوء ان خاف عمل ولا کالاجیر السوء ان لم یعط اجرا لم یعمل۔

تم اس غلام بد باطن کی طرح سے نہ ہو جاؤ جو کسی دباؤ اور خوف کی وجہ سے کام کرتا ہے، اور نہ اس برے مزدور کی مانند، جس کو اگر اجرت نہ ملے تو کام کرنا چھوڑ دے۔

ایک مجمع میں ایک دیہاتی خاتون نے آکر پوچھا کہ بخشش کسے کہتے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا، اچھی چیز کو خرچ کرنا بخشش ہے، یہ سن کر خاتون نے کہا یہ تو دنیا میں ہوا، لیکن دین میں کیا چیز بخشش ہے جماعت نے جواب دیا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی بندگی بجالانا اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے احتراز کرنا یہی دینی جود وکرم ہے، خاتون نے پوچھا کیا تم ان چیزوں سے کسی معاوضہ کی امید رکھتے ہو؟ لوگوں نے کہا بے شک! کیوں نہیں؟ خاتون بولی کس لئے؟ لوگوں نے کہا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی، خاتون نے کہا سبحان اللہ! تم تو ایک نیکی اس وجہ سے کرتے ہو کہ تم کو اس کے بدلہ میں دس نیکیاں ملیں گی، بھلا اسی کا نام بخشش ہے؟ جماعت نے پوچھا یہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ خاتون نے کہا سنو! بخشش یہ ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح سے کی جائے کہ اس سے کسی معاوضہ جزا یا سزا کا خیال نہ ہو، یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ تم دل میں کچھ اور نیت کرکے عبادت کرو اور اللہ تعالیٰ تمھاری دل کی مراد کو سمجھ لے۔

ریاکاری کو دخل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اور کو شریک کرنے کا نام ریا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (سورہ کہف) اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

کمال توجہ۔ عبادت میں کمال توجہ سے مراد یہ ہے کہ دل میں اس اس امر کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہماری نظروں کے روبرو ہے ہماری ہر حرکت و سکون سے واقف ہے، ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز اس کی نگاہوں پر آشکار ہے، وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ موجود ہے، جب اس کا اعتقاد جازم نفس کے اندر جاگزیں ہو جائے۔ تو دل عظمت الٰہی اور اس کے خشوع سے لبریز ہو جاتا اور دنیوی تفکرات و مشاغل سے ایک دم منقطع ہو کر ربانی تجلیات کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

ذوق و وجدان۔ عبادت کے اندر ذوق و وجدان کو پورا دخل ہونا چاہئے، عبادت کے ادا کرنے کا ولولہ اور جذبہ ہر وقت دل کی گہرائیوں میں امنڈتا رہے، جب اس کا تصور آئے تو دل میں نشاط و سرور کی کیفیت پیدا ہو، روحانی لذت حاصل کرنے کے لئے بارگاہ ایزدی اور مرکز عبودیت کی جانب ذوقی و وجدانی جذب و کشش موجود رہے، ایسا نہ ہو کہ اس کو جبری فریضہ سمجھ کر ادا کیا جائے اور اس میں بے پروائی و بے توجہی سے کام لیا جائے۔

روزہ:-

انسان جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے، قدرت نے ان دونوں کے

درمیان مدت مقررہ تک رشتہ قائم رکھا ہے بعض انسانی طبقوں پر مادیت کا غلبہ ہوتا ہے، جس سے وہ رات دن جسمانی لذتوں اور رغبتوں کے نشہ میں ہمیشہ مدہوش رہا کرتے ہیں، ان کی انسانیت پر بہیمیت کے تاریک پردے پڑ جاتے ہیں، کھانے پینے اور عیش وعشرت کی خواہش ان کو اس قدر اندھا بنا دیتی ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چیز ان کی بے نور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتی، چند سال یونہی گزر جاتے ہیں اور انسان دنیاوی چیزوں کے نشہ میں چور رہتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے شباب کا رنگین زمانہ ختم ہو جاتا ہے بڑھاپہ خزاں بن کر چھا جاتا ہے، قویٰ میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا اور یہ مدہوش انسان بہت جلد جانوروں کی سی موت مر جاتا ہے، اس کو اپنی زندگی بھر میں کوئی ایسا نور نہیں ملا جو اُسے دوسرے عالم میں جب کہ وہ سراسر تاریکیوں میں گھرا ہوگا کچھ روشنی دے سکے۔

جس طرح انسانی اجسام بسا اوقات مادی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں، اس صورت میں وہ طبیبوں کے علاج کے محتاج ہوتے ہیں، جو انسان کی مادی بیماریوں کا علاج مختلف مفرد اور مرکب دواؤں سے کرتے ہیں، اسی طرح جب انسان روحانی امراض میں مبتلا ہو جائے، روح کی جلا اور صفائی جاتی رہے، دنیا فسق وفجور کے سیلاب میں غوطے کھانے لگے، شر و فساد کے جراثیم فضائے انسانیت میں پھیل کر مختلف مہلک اور خطرناک امراض پیدا کر کے زندگی خطرہ میں ڈال دیں اور مادیت پرستی کی زہر آلود وبائیں روحانیت کا

خاتمہ کردالیں، تو اس وقت انبیاء اطباء روحانی بن کر دنیا میں تشریف لاتے ہیں، مختلف روحانی نسخوں اور مفرد و مرکب ادویہ سے نفس کی بیماریوں کا علاج کرتے اور اس مزاج کو اعتدال پر قائم رکھتے ہیں جس سے ہستی کا کون و فساد اور عالم کا نظام وابستہ ہے۔

دنیا میں جس قدر مذاہب و ادیان آگئے تقریباً ان تمام میں یہی مقصد وحید کارفرما تھا کہ نفوس انسانی کی اصلاح اور ان کے اذہان کا تزکیہ کیا جائے، آخری شریعت آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بھیجی گئی اس میں ہر قسم کی بیماریوں کا مکمل علاج موجود ہے اسلامی احکام انسانی روح و جسم کی صحت و صفائی کو بحال رکھنے اور تزکیہ نفس کے لئے تیر بہدف ادویہ ہیں اور اسلام ان تمام مختلف مفردات کا ایک معجون مرکب ہے، روزہ اور نماز بھی اسی معجون کے دو اہم اجزاء ہیں، ان میں سے نماز اور اس کے مقاصد کا تذکرہ پہلے ہو چکا اب روزہ اور اس کے اہم مقاصد پہ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

محافظ روح - روزہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک روزہ دار طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک محض کھانے پینے سے اپنے نفس کو روکے رکھے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہر قسم کے شہوانی جذبات اور نفسانی خواہشات سے باز رہے، حدیث بھی اس مقصد کی صراحت اس طرح سے کرتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے آنحضرت ﷺ کا قول مروی ہے۔

"روزہ صرف کھانے پینے سے علیحدہ رہنے کا نام نہیں بلکہ

روزہ لغو اور بیہودہ امور سے بھی باز رہنے کا نام ہے، لہذا اگر کوئی برا کہے یا تم سے جہالت کی بات کرے تو اس کو کہہ دو کہ میں روزہ سے ہوں"

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے "جس نے جھوٹ بولنے اور جھوٹ کے مطابق عمل کرنے کو نہ چھوڑا خدا کو اس کے کھانے پینے سے کچھ سروکار نہیں"

ہم کو یہ حکم ہوا ہے کہ صبر و تقویٰ کے ذریعہ نفس کا مجاہدہ کریں، یہی ایک چیز روح کی حفاظت کر سکتی ہے، یہ محض اسی صورت میں ممکن ہے کہ زبان کو لغو اور فحش باتوں سے، چغلی، جھوٹ، ریا اور مکر و فریب سے محفوظ رکھیں، کانوں کو مکروہ باتوں کے سننے سے اور آنکھوں کو ایسی چیزوں کی طرف دیکھنے سے بچائے رکھیں، جو سراسر نفسانی خواہشوں کو ابھارنے کا باعث ہیں، نظر کو ابلیس کے زہر آلود تیروں سے تشبیہہ دی گئی ہے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں۔

النظر سهم مسموم من سهام ابلیس لعنه الله، فمن ترکها خوفاً من الله ا تاه الله عزوجل ایماناً تجد حلاوته فی قلبه	نظر ابلیس (اللہ کی اس پر لعنت ہو) کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے جو کوئی اللہ سے ڈر کر اس سے باز رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ایمان عطا کرے گا جس کی حلاوت سے وہ اپنے دل میں محظوظ ہوا کریگا۔

اسی مقصد کی طرف اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ	ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح سے کہ تم سے پیشتر اگلی قوموں پر

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ — فرض کیا گیا تھا اس لئے کہ تم
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (سورہ بقرہ) — پرہیزگار بن جاؤ۔

حدیث مقدس نے اس آیت جلیلہ کی مزید توضیح یوں فرمائی ہے

انما الصوم جنۃ فاذا — روزہ ڈھال ہے جب تم میں سے
کان احدکم صائما فلا — کوئی روزہ سے ہو تو لغویات زبان سے
یرفث ولا یجھل و ان — نہ نکالے اور نہ جہالت برتے، اگر اس سے
امرأ قاتلہ او شاتمہ — کوئی جھگڑا کرے یا گالی دے تو وہ اس سے
فلیقل انی صائم — یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔

روزہ انسان کے نفس اور روح کا محافظ ہے جس سے بری خواہشیں دب جاتی ہیں، سرکش نفس سرنگوں ہو جاتا ہے۔

انسان کا نفس جو برائیوں کی طرف آمادہ کرتا رہتا ہے، بجائے خود ایک شیطان ہے، جو قدم قدم پر اکساتا رہتا ہے، روزہ اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے،

آنحضرت صلعم نے کس لطیف انداز میں اس کی تشریح فرمائی ہے

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔

اذا جاء شہر رمضان — جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو بہشت
فتحت ابواب الجنۃ — کے دروازے کھل جاتے اور دوزخ
وغلقت ابواب النار — کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور
وصفدت الشیاطین — سب شیاطین جکڑے جاتے ہیں۔

اس اجمال کی مزید تفصیل یہ ہے کہ یہ امر واضح ہے کہ دنیا میں عام برائیاں اکثر اوقات جسمانی قوتوں کے چڑھاؤ سے سرزد ہوا کرتی ہیں

جو لوگ خوش حالی اور فراغت کی زندگی بسر کرتے اچھی اچھی غذائیں کھاتے رہتے ہیں، ان کے اندر بدمستی کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں؛ ان کا نفس حد اعتدال سے تجاوز کر کے اپنی من مانی خواہشات کو پورا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے، اندر ہی اندر بُرے جذبات کی پرورش کرتا اور ان کو بروئے کار لانے پر انسان کو برانگیختہ کرتا ہے جب ایسے لوگ روزہ رکھتے ہیں تو جسمانی قوت میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے نفس کو قابو میں رکھنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے جب قوتوں پر زوال واقع ہو جائے تو گناہوں میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پس جب انسان محض پروردگار عالم کے لئے بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرتے اور گناہوں کو ترک کرتے ہیں اور نفس کو اپنی آرزو پوری کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا تو ان کے لئے رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے، بہشت کے دروازے ان کے لئے کھل جاتے ہیں، دوزخ کے دروازوں کا بند ہونا بھی ظاہر ہے کہ جب گناہوں کے دروازہ کو کھولنے والی چیز ہی باقی نہ رہے، جو غضب الٰہی کی آگ کو بھڑکانے کا موجب ہے، تو دوزخ کے دروازے کس طرح کھلے رہ سکتے ہیں؟

شیاطین کے جکڑے جانے سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جب بنی آدم کے جسم میں توانائی و قوت اپنے شباب پر ہو، شکم سیری اور فارغ البالی کے تمام سامان فراہم ہوں تو گناہوں کی جانب رغبت پیدا ہوتی ہے اور رگوں، پٹھوں اور نس نس سے شیطانی تحریکات شروع ہوتی ہیں، مگر جب سارے جسم میں بھوک اور پیاس کا اثر ہو اور روزہ کی وجہ سے تمام شہوانی و حیوانی جذبات کا بازار سرد

پڑ جائے تو شیطان کو برائیوں پر آمادہ کرنے کا موقعہ ہی کب ملتا ہے گویا روزہ نے ان جذبات و تحریکات کو، جو اپنے اندر شیطانی غلبہ و جوش رکھتی ہیں، قید و بند میں کر دیا، انھیں ہتھکڑیاں پہنا دیں جس سے وہ اب ہر طرح مجبور ہو گئے۔

اسی چیز کو آنحضرت صلعم نے اس طرح بیان فرمایا ہے

ان الشیطان یجری من بنی آدم مجری الدم من العروق فضیقوا مجاریہ بالجوع	بے شک شیطان بنی آدم کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح دورہ کرتا رہتا ہے، پس تم اس کی گزر گاہوں کو بھوک سے بند کر دو۔

اسی قوت شہوانی کے سیلاب کو روکنے کے لئے اسلام نے نکاح کے باب میں یہ حکم دیا ہے جس شخص میں نکاح کرنے کی استطاعت نہیں ہے تو اس کو روزہ رکھ لینا چاہئے، اس سے معلوم ہوا کہ روزہ شہوتوں کو دبانے کا ایک بہترین ذریعہ تقوی و پرہیزگاری کا وسیلہ اور روح و نفس کا بے نظیر محافظ ہے۔

ریاضت نفس۔ انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا سمند ہمیشہ جوش زن رہا کرتا ہے، اس کے مطالب و مقاصد کا سلسلہ غیر محدود ہے اگر دنیا جہان کی بادشاہت بھی اس کو مل جائے پھر بھی اس کی حرص و طمع کی آگ نہ بجھنے پائے گی، دنیا میں اس کے ارادہ و اقتدار کی باگ اس کے قبضہ میں دے دی گئی ہے، اس کی زندگی کھانے پینے اوڑھنے اور دیگر جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا، حاکم مطلق بن کر رہنا، اپنا رعب و

اقتدار قائم رکھنا بھی انسانی جبلت کا خاصہ ہے، اس لحاظ سے ایک قوم کے افراد کے جذبات و مرغوبات مختلف ہوا کرتے ہیں، انسانی سوسائٹی محبت، اتحاد، مدافعت، اتفاق، ہمدردی اور ایثار وغیرہ کی محتاج رہتی ہے، اس اثناء میں مختلف مذاہب و مسالک رونما ہو جاتے ہیں، جس کے اغراض و مقاصد بھی مختلف اور متعدد ہوتے ہیں، اجتماعیت میں خلل اور فتنہ و فساد واقع ہو جاتا اور صفحۂ دنیا سے امن و سلامتی کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔

اسلام نے نفس کی ریاضت کے لئے روزہ کو فرض کیا ہے تاکہ نفس اپنی ان تمام قوتوں کو جادۂ اعتدال پر برقرار رکھے جن پر نفسانی خواہشوں کی وجہ سے زوال رونما ہو گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ روزہ سے نفس کی ریاضت کیوں کر عمل میں لائی جا سکتی ہے؟ اس کا آسان حل یہ ہے کہ تجربات و مشاہدات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کم کھانے پینے سے روحانی صفات و کمالات میں ترقی ہوتی ہے جسمانی خواہشات خود بخود گھٹتی جاتی ہیں، جسم پر روح کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور روح کا آئینہ، جو مادیت کے مکدر ہاتھوں سے زنگ آلود ہو چکا تھا، از سر نو ریاضت کی وجہ سے روشن و چمکدار ہو جاتا ہے، نفس، عقل اور ارادہ میں حیرت انگیز روحانی جلوے سما جاتے ہیں، چنانچہ مسیحی گروہ اپنے مبلغین کو اس وقت تک دور دراز ملکوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے نہیں بھیجتا، جب تک کہ ان کے نفوس بھوک کی ریاضت و مشقت برداشت کر کے صبر و تحمل اور ثبات و استقلال کا پیکر نہ بن جائیں۔

جب وہ اس منزل تک پہنچ جاتے ہیں اور عزیمت و استقامت جیسی شاندار صفات سے آراستہ ہوتے اور اپنی قوت ارادی کو قابو میں کرلیتے ہیں، تو اس وقت ان وحشی قبیلوں میں تبلیغ و اشاعت کے لئے بھیجے جاتے ہیں، جہاں ان کو ان کی ہیبت و سختی اور ان کی استبدادی و قہرمانی قوتوں کا کچھ خوف نہیں رہتا،

اسلام نے بھی اسی مقصد کو ملحوظ رکھ کر روزہ کو مشروع کیا گزشتہ اسلامی تاریخ بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام نے مصیبتوں اور شدتوں کو جھیلتے ہوئے جن ممالک پر فتح و کامرانی حاصل کی، وہ سب اپنی نفسانی ریاضتوں کا نتیجہ تھا۔

وہ کونسا انسان ہے جو اپنی زندگی میں صبر و ثبات اور عزیمت و ہمت جیسے اہم اسباب و آلات کا محتاج نہیں رہتا؟ ان تمام کے حاصل کرنے کے لئے ریاضت نفس کے سوا اور کیا ذریعہ ہے اور ریاضت نفس کے لئے روزہ سے بہتر کوئی اور موثر ذریعہ نہیں۔

قناعت۔ روزہ انسان کو قناعت کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص کفایت اور قناعت سے اپنی زندگی کے اوقات بسر کرتا ہے، کم تعداد میں غذا و خوراک استعمال کرنے کا عادی بن جاتا ہے، نہ صرف یہی بلکہ ہر چیز پر قانع رہتا ہے، ایسا شخص حریص اور لالچی نہیں ہوتا، اس کی نظروں میں مال و دولت کی کچھ بھی وقعت باقی نہیں رہتی، بخلاف اس کے جو شخص بھر پیٹ کھانے کا عادی ہے، وہ بندۂ شکم ہو جاتا ہے، جب کبھی کسی وقت کی غذا نصیب نہ ہو یا کھانے میں تاخیر ہو جائے تو بھوک سے بیتاب و بے قرار ہو جاتا ہے

جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کوئی چیز نہیں مل رہی ہے تو وہ ناجائز طور پر پیٹ بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور جرائم کا ارتکاب کرنے میں ذرا بھر نہیں جھجکتا۔

صبر و عزیمت۔ روزہ مشکلات و مصائب میں صبر و عزیمت سے کام لینے کا بہترین ذریعہ ہے، روزہ دار کھانے پینے کی چیزوں اور دیگر نفسانی خواہشوں سے اپنے آپ کو باز رکھتا ہے، عین بھوک اور پیاس کی شدت میں جب اسے کسی چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنی قوت ارادی سے کام لیتا ہے، نیز جب انسانی نفس کھانے پینے کی خواہش سے رکے رہتا ہے اور تھوڑا کھانے کی وجہ سے اُسے بھوک اور پیاس کی شدتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، تو اس کے اندر ایک طرح سے مصائب و شدائد کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اس کی قوت ارادی اس قدر مضبوط رہتی ہے کہ اس کا دل صرف کھانے کے ایک دانہ اور پانی کے ایک قطرہ کے لئے کتنی ہی خواہش کیوں نہ کرے، وہ شخص اپنے صبر و عزیمت کی سرحد سے ایک قدم بھی باہر نہ نکالے گا۔

عجز و نیاز۔ روزہ خدا تک پہنچانے کا آسان ذریعہ ہے، روزہ دار کا دل عجز و انکسار کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے کیونکہ نفس بھوک کی وجہ سے جتنا عاجز ہوتا ہے، اتنا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا جب اس کو اپنی بھوک اور پیاس کے رفع کرنے کے تمام ذرائع مسدود نظر آنے لگتے ہیں اور کھانے کے ایک لقمہ اور پانی کے ایک گھونٹ کے لئے دُنیا اُس کی نگاہوں میں تاریک ہو جاتی ہے تو اس کو لامحالہ

بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرنا پڑتا اور اپنی حاجت رفع کرنے کے لئے الحاح وزاری سے کام لینا پڑتا ہے، اس وقت اس کی دلی توجہ پروردگار عالم ہی کی طرف بندو رہتی ہے اور اس کا دل خشیت باری تعالیٰ میں ڈوب جاتا ہے۔

مجاہدۂ نفس۔ نفس کو اس کی خواہشات سے روکنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے، اس سے بڑھ کر جرأت و شجاعت کا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وہ معیار ہے، جس پر انسانی خوبیوں اور محاسن کے جوہر ابھرتے ہیں، اس کی طرف آنحضرت صلعم نے اشارہ فرمایا ہے

رجعنا من الجهاد الاصغر ہم چھوٹے جہاد سے بڑے
الی الجهاد الاکبر جہاد کی طرف لوٹے۔

یہاں کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کو جہاد اصغر اور نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنے کو جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

احساس ہم دردی۔ دنیا میں بہت سارے ایسے انسان موجود ہیں، جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں ہوتا، ایسے غریب اور فاقہ کش انسان بھی ہیں، جن کی زندگی افلاس و فاقہ کی وجہ سے دھندلکے میں پڑی ہوئی ہے، ایسے ہی غریبوں، محتاجوں اور فاقہ کش انسانوں کی تاریک زندگی کا تصور کرانے اور ان کے ساتھ ہم دردی و غم خواری کے جذبات و احساسات پیدا کرانے کے لئے روزہ شروع ہوا تاکہ روزہ دار کو یہ احساس ہو سکے کہ بھوک میں کیسی شدت ہوتی ہے، پیاس کی وجہ سے انسان کس قدر بے قرار ہو جاتا ہے فاقہ کشی میں کس قدر تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے

جب اس کے اندر یہ جذبۂ احساس پیدا ہو جائے گا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایک غریب اور فاقہ کش انسان کے ساتھ ہمدردی نہ پیدا ہو، بخلاف اس کے اگر کوئی شخص روزہ ہی نہ رکھے تو اس کو کیا معلوم کہ بھوک کیا چیز ہے؟ پیاس کی شدت و تکلیف کسے کہتے ہیں، بھوکے اور پیاسے انسان پر کیا کچھ مصیبت نہیں گذرتی، پھر وہ ایک مفلس اور فاقہ کش کی کس طرح حاجت پوری کر سکتا اور اس سے اظہار ہمدردی کر سکتا ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ آپ کس لئے بھوکے رہتے ہیں؟ حالانکہ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے، آپ نے فرمایا، اگر میں بھر پیٹ کھاؤں تو یہ ڈر ہے کہ کہیں بھوکے کی خبر گیری نہ کر سکوں۔

امانت و دیانت داری۔ روزہ وہ روحانی گراں مایہ امانت ہے، جو انسان کے تفویض کی گئی ہے بحالتِ صوم خلوت و جلوت کی مختلف صورتیں در پیش ہوا کرتی ہیں ان میں سے کٹھن اور دشوار منزلِ تنہائی اور خلوت ہے، یہی سب سے بڑی آزمایش گاہ ہے جہاں روزہ دار کو اپنی امانت اور دیانت داری کا امتحان ہر لمحہ دینا پڑتا ہے۔

مروت و حیا۔ امانت و دیانت داری کو خلوت و جلوت کے تمام لمحات میں ہاتھ سے نہ جانے دینا خود اس امر کی دلیل ہے کہ نفس کے اندر بڑی بڑی اہم امانتوں کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے، ایسا شخص لوگوں کے پاس قابل اعتماد ہے اور عزت و

وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق۔

لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہونے اور تنہائی کی حالتوں میں رہنے کے باوجود اس نے اپنی قوت ارادی کو قائم رکھا اور پروردگار عالم کی اس نازک اور گراں مایہ امانت کی پاسبانی میں سرمو کوتاہی نہیں کی، یہ خود اس کی کمال مروت، علو ہمتی اور فراوان حیاداری کی روشن علامت ہے، مروت نام ہے اس چیز کا کہ انسان اس کے ذریعہ سے بلند مراتب و کمالات حاصل کرے۔

حیاء کے تین مراتب ہیں۔

(۱) احکام و اوامر الٰہی کی پابندی، اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے احتراز، سر اور پیٹ کی خواہشوں کی حفاظت، دنیوی زیب و آرایش کو ترک کرنا اور مصیبت و موت کو یاد کرنا۔

(۲) لوگوں کی ایذا رسانی سے باز رہنا۔

(۳) خود انسان کا تنہائیوں میں اپنے نفس سے حیا کرنا اور ہر حالت میں اس کی حفاظت کرنا، جیسا کہ بعض حکماء نے کہا ہے۔

"اوروں سے حیا کرنے کی بہ نسبت تمھیں زیادہ تر خود اپنے نفس سے حیا کرنا چاہیے"

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

فسری کا علامی وتلک خلیقتی وظلمۃ لیلی مثل ضوء نہاریا

(ترجمہ) میرا ظاہر و باطن ایک ہے یہی میرا اخلاق ہے۔ میری رات کی تاریکی میری صبح کی روشنی کے مانند ہے۔

جس شخص نے حیاء کے یہ تین مدارج حاصل کر لئے اس کے

اندر تمام محاسن اور خوبیاں جمع ہوگئیں، وہ اخلاق فاضلہ کا بہترین نمونہ ثابت ہوگا۔

طبی اغراض ـــــــ طب جدید کے مشاہدات و اکتشافات بتارہے ہیں کہ بیماریوں کے اکثر و بیشتر جراثیم جو جسم انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں، روزہ ان کے وجود کو فنا کرنے کے لئے تیر بہدف علاج ہے، گویا روزہ بدن میں زہریلے جراثیم کے لئے تریاق ہے، یہی وجہ ہے کہ اطباء اکثر مریضوں کو روزہ رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سے طبی اغراض و مقاصد روزہ سے وابستہ ہیں۔

اصلاح معدہ۔ معدہ کو طب میں ام الامراض (بیماریوں کی جڑ) کہا جاتا ہے، اس لئے کہ اکثر بیماریاں زیادہ کھانے اور معدہ میں فضلات کے جمع ہونے سے پیدا ہوجاتی ہیں، دیگر اسباب سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بہ نسبت ان کے بہت کم ہیں اس لئے آنحضرت صلعم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

البطنة اصل الداء — شکم سیری بیماری کی جڑ
والحمية راس الدواء — اور پرہیز سب بیماریوں کی دوا ہے"

سال میں ایک مہینہ روزہ رکھنے سے معدہ تقریباً پاک ہوجاتا ہے اور جس قدر فضلات اس کے اندر جمع تھے وہ سب دور ہو جاتے ہیں۔

لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے

ہیں کہ بیٹا! جب معدہ بھر جاتا ہے تو قوتِ فکر کمزور پڑ جاتی ہے حکمت و دانش گونگی اور تمام اعضاء عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں۔

حسن بصری فرماتے ہیں کہ:۔

"ابنِ آدم مسکین ہے، ایک دن ضرور اس پر موت آئے گی جس میں اس کی آرزوئیں اور حسرتیں، خاک میں مل جائیں گی وہ صرف گوشت کے ایک لوتھڑے سے بات کرتا ہے، ان آنکھوں سے دیکھتا ہے جو چربی کا ایک ٹکڑا ہیں، ان کانوں سے سنتا ہے جو ہڈیوں سے بنے ہوئے ہیں، اپنی بھوک میں گرفتار پیٹ کا بندہ، نفع و نقصان، موت و حیات ان میں سے کسی چیز پر اس کو قابو نہیں"

دوسرا باب

افراد کے اندر جماعت کی صلاحیت پیدا کرنا

اس کے واسطے دو طریقے شریعت میں مقرر کئے گئے ہیں۔

(۱) زکوٰۃ ۔ (۲) حج ۔

ہم یہاں پہلے طریقہ کو ذرا وضاحت سے بیان کرتے ہیں ۔

زکوٰۃ :-

لفظ زکوٰۃ تزکیہ سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ پاک وصاف کرنے کے ہیں اور زکوٰۃ کا لفظ پاکی، نمو، اور ترقی کے معنیٰ پر اطلاق کیا جاتا ہے چوں کہ زکوٰۃ انسان کو بخل، گناہ اور عذاب سے نجات دلانے، پاک وصاف کرنے اور ترقی مال کا ذریعہ ہے، جس کی طرف قرآن عزیز میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ (توبہ)

ان کے مال میں سے زکوٰۃ لے کہ تو ان کو پاک کرے اور بابرکت کرے۔

— اس لئے اس عمل کا نام زکوٰۃ ہوا نیز صدقہ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل صدقہ دینے والے کے ایمان کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی صدق دلی اور خلوص نیت کی علامت ہے۔

انسان کی طبیعت میں مال کی محبت ایک مہلک مرض ہے اس کا علاج بخالت کو دور کرنے اور جود و بخشش کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔

وَمَنْ یُوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ	جو اپنے نفس کی بخالت سے بچتا ہے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔	وہی فوز و فلاح پانے والے ہیں۔

(سورہ تغابن)

نفس انسانی کے لئے بخل ایک خطرناک مرض ہے جو انسان کو خسیس و ذلیل بنا دیتا اور اس کے اندر دناءت اور کمینہ پن پیدا کر دیتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بخل اور بزدلی کو نہایت مہلک قرار دیا ہے۔

شر ما اعطی العبد شح	نہایت ہی بری چیز یہ ہے کہ
وجبن خالع	انسان کو بخل اور ہلاکت آفریں بزدلی ملے

زکواۃ کے اکثر و بیشتر مقاصد ایسے ہیں، جو انسانی سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور اس کی خوش حالی سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے ضمن میں وہ امور بھی آجاتے ہیں، جو خود افراد کی ذات سے وابستہ اور ان کی تہذیب و اصلاح سے متعلق ہیں، جن پر حسب ذیل بیانات بخوبی روشنی ڈالتے ہیں۔

ایثار و استقلال۔ دولت انسان کی محبوب ترین چیزوں میں سے

ہے، جیسا جیسا دولت ہاتھ آتی ہے، انسان اور زیادہ حرص وہوس کے تاریک غار میں گرتا جاتا ہے اس کا خرچ کرنا نفس پر بہت ہی شاق گزرتا ہے، حتیٰ کہ بعض ان صورتوں میں جہاں انسان کی زندگی اور موت کا سوال ہو، وہ سب چیزوں پر دولت کو ترجیح دے گا اور اپنی جان عزیز تک بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کرے گا زکوٰۃ ایسی ہی چیزوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے جس میں زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ثابت قدمی ظاہر ہوتی ہے جب اس نے ایک دشوار ترین چیز یعنی زکوٰۃ ادا کرنے پر قابو پا لیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر تمام باطل اور استبدادی قوتوں سے مقابلہ کرنے اور راہ حق پر ثابت قدم رہنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے خلاف، جو اُسے برائیوں کی طرف لئے جا رہی تھیں، جہاد کر سکے، قرآن عزیز نے اس ملکہ کو ثبات نفس سے تعبیر کیا ہے

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ	اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال
اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ	کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے خرچ
كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا	کرتے ہیں ایسی ہے جیسے بلند زمین
وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا	پر ایک باغ ہے اس پر زور کا مینہ
ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا	پڑا تو وہ باغ اپنا دو چند پھل لایا
وَابِلٌ فَطَلٌّ	اور اگر اس پر مینہ نہ پڑا تو پھوار
(سورہ بقرہ)	ہی کافی ہے۔

اسی زکوٰۃ کا خاصہ ہے کہ انسان کے اندر اپنی عزیز چیز کو قربان کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر اپنی جان عزیز کو بھی ایثار کرنے کا وقت آپہنچتا ہے تو کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔

ترقی مال۔ زکوٰۃ مال داروں کے مالوں کی حفاظت اور ان کی زیادتی کا موجب ہے، کیونکہ حاجت مند اور غریب انسانوں کو جب یہ اطمینان ہو جائے کہ مال داران کے لئے روپیہ صرف کرتا ہے تو اُن کی دعائیں اور تمنائیں اس کے وجود اور بقائے نعمت کے لئے وقف ہو جائیں گی، وہ ہر وقت اس کی خارجی آفتوں کے لئے سینہ سپر رہیں گے، زکوٰۃ میں مال داروں کی جانی و مالی حفاظت و ترقی کی طرف قرآن عزیز نے کس لطیف پیرایہ میں اشارہ فرمایا ہے

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ	جو لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ
اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ
كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ	جیسے ایک دانہ، جس سے سات
سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ	بالیاں اُگیں، ہر بالی میں سو دانے
مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ	ہوں اور اللہ جس کو چاہتا ہے
لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (سورہ بقرہ)	دو چند بڑھا دیتا ہے۔

نیز زکوٰۃ مال دار کے لئے اپنے فیاض ازلی کے شکریہ کا اظہار ہے، جس کے صلے میں مال دار ہر آفت اور زوال سے محفوظ رہتا اور اس کے مال میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ	اگر تم احسان مانوگے تو تمہارے لئے
وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ	اور بھی زیادہ دونگا اور اگر ناشکری کروگے

لَشَدِيْدٌ (سورہ ابراہیم) تو بے شک میرا عذاب البتہ سخت ہے

رفع حاجات۔ ہر سال زکوٰۃ کے ادا کرنے میں سوسائٹی کا توازن برقرار رہ سکتا ہے، انسانی ضروریات کی تکمیل انجام پاتی ہے، حاجت مند، غریب اور فاقہ کش انسان کی زندگی سنور سکتی ہے اور قرضداروں کا قرض ادا ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلعم سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں محبوب ترین شخص آپ کے نزدیک کون ہے؟ آپ نے جواب دیا "انفع الناس للناس" جو لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائے، پوچھا گیا یا رسول اللہ بہترین اعمال کیا ہیں؟ فرمایا ادخال السرور علی المومن۔ مومن کو خوشی سے سرفراز کرنا" پھر دریافت کیا گیا مومن کی خوشی کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اشباع جوعہ وتنفیس کربہ" (۱) اس کی بھوک رفع کرنا (۲) اس کی مصیبت کو دور کرنا اور (دادا دینے۔) (۳) اس کے قرض کو پورا کرنا۔

اصلاح معاش۔ یتیموں کی پرورش، غریبوں کی امداد اور حاجت مندوں کی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں، یہ چیز باہمی بغض وعناد کو دور کرنے، محبت وتعلق بڑھانے کا بہترین سامان ہے تنگدستی اور غربت وہ بری بلا ہے کہ جس سے انسان ہر قسم کے جرائیم کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہو جاتا قتل وخونریزی کرنے سے بھی نہیں رکتا، یہی چیز مالداروں اور محتاجوں کے درمیان پیدا ہو سکتی ہے، جب کہ مالدار

طبقہ اپنے فرائض انجام نہ دے تو مزدوروں کے دل میں بغض و نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے اور وہ اس کے زوال کی آرزو کرنے لگتے ہیں، باہمی کشمکش کے وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں، کتنی قومیں اس فریضۂ انسانی میں کوتاہی کرنے سے تباہ ہو گئیں ؟ اس چیز کے مفقود ہونے سے کتنی قوموں کو نکبت و زوال کا منہ دیکھنا پڑا ؟ اس سلسلہ میں دنیا کے ہر حصہ میں کیسی کیسی خوں ریز تحریکات پیدا ہونی شروع ہوئیں ؟ مال داروں کے خلاف کتنے مزدوروں اور بیکس انسانوں نے ہر زمانہ اور ہر سوسائٹی میں اپنی خوفناک صدائے احتجاج بلند کی جن کی دل تھرا دینے والی چیخیں اب تک فضائے بسیط میں گونج رہی ہیں جو اب تک بھی سرمایہ داروں کو تھپیڑے دے دے کر اور جھنجوڑ کر اپنی غفلت سے بیدار کر رہی ہیں ؟ یہ وہ بڑے تلخ نتائج ہیں، جو مال کی زکوٰۃ نہ نکالنے سے وقوع پزیر ہو رہے ہیں

تشکیل جمہوریت۔ اسلام نے ہمدردی و احساس کی روح پھونکنے بنی نوع انسان کے فقر و فاقہ، افلاس و غریب کا علاج کرنے اور ایک نظم و اتحاد قائم کرنے کے لئے نظام زکوٰۃ کی وہ انقلابی اسکیم دنیا کے روبرو پیش کی ہے جس سے عظیم الشان کام انجام پا سکتے ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ تشنۂ تکمیل رہنے نہیں پاتا، اس کا سب سے بڑا اور اہم مقصد یہ ہے کہ عالم اسلامی کی تمام کڑیاں مربوط و منظم رہیں، ایک ایسی جمہوریت تشکیل پذیر ہو، جس کو انفرادیت کا منتشر تخیل درہم برہم نہ کر سکے۔

قرآن مقدس کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے اکثر و بیشتر مقامات پر صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے' ان دونوں چیزوں پر بار بار دہرا کر جس قدر زور دیا گیا ہے' اتنا روزہ اور حج پر نہیں دیا گیا' یہ اس امر کا زبردست ثبوت ہے کہ انفرادی اصلاح کے لئے نماز سے بڑھ کر اور جماعتی اصلاح کے لئے زکوٰۃ سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہے' صلوٰۃ سے اگر روحانی اور انفرادی طور پر تزکیہ ہوتا ہے تو زکوٰۃ سے جماعتی زندگی خوش گوار اور خوش حال ہوتی ہے' ایک میں اگر یہ قابلیت ہے کہ وہ افراد کی ذہنیتوں میں نمایاں تغیر پیدا کر دے تو دوسری میں یہ قوت ہے کہ وہ سوسائٹی کی حالتوں میں انقلاب عظیم برپا کر دے اور ان کی زندگی کی اصلاح کرتے ہوئے ایک حد تک جماعتی توازن کو برقرار رکھے۔

اسلامی جمہوریت کی عظیم الشان عمارت' جن بنیادوں پر قائم ہے' ان میں سے ایک محکم بنیاد یہی زکوٰۃ ہے' اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد برپا ہوا یعنی نو وارد ان اسلام نے محض اس وجہ سے کہ ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا گیا' انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور مرتد ہو گئے تو ابوبکر صدیقؓ نے ان سے جہاد کرنے کے لئے فوج بھیجنے کا ارادہ کیا' حضرت عمرؓ درمیان میں حائل ہوئے اور کہا کہ آپ محض اس چیز سے کہ انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ان سے قتال کرنے کے لئے تیار ہیں' حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ سے انکار کرتے ہیں' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

زمانے میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا' اور زکوٰۃ دوں گا"
چنانچہ اس اہم فریضہ کی تکمیل کے لئے آپ نے ان سے جہاد کیا اور
کسی طرح اسلام کے اس رکن عظیم کو گرنے نہ دیا۔

وعید۔ جو لوگ اس فرض کی ادائیگی میں سستی اور کوتاہی کرتے
ہیں' مال جمع کر کے اس کو خرچ نہیں کرتے اور راہ حق میں دینے سے
پیچھے ہٹتے ہیں' ان کے بارے میں کس قدر سخت وعید آئی ہے۔

والذین یکنزون الذھب	جو لوگ سونا و چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو
والفضۃ ولا ینفقونھا	خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو
فی سبیل اللہ فبشرھم	دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو'
بعذاب الیم یوم یحمی	جس دن کہ اسی سونے چاندی کو دوزخ کی
علیھا فی نار جھنم فتکوی	آگ میں تپایا جائے گا پھر اسی سے
بھا جباھھم وجنوبھم	ان کے ماتھے کروٹیں اور پیٹھیں داغی
وظھورھم ھذا ما کنزتم	جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ
لانفسکم فذوقوا	یہ ہے جو تم نے اپنے لئے دنیا میں
ما کنتم تکنزون (توبہ)	جمع کر رکھا تھا تو اپنے جمع کئے کا مزہ چکھو۔

اس سختی کے ساتھ جو وعید آئی ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ
کے دینے میں انھوں نے سستی اور غفلت سے کام لیا اور نظام عالم کو
خراب کرنے کے باعث ہوئے' انسانی ضروریات و حاجات کی ذرا
بھر پروا نہ کی' انھوں نے فقر و فاقہ میں مبتلا انسانوں کو اپنی آنکھوں کے
روبرو دم توڑتے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھا' ٹس سے مس تک
نہ ہوئے' انھوں نے بھوکوں اور پیاسوں کو تڑپتے تلملاتے دیکھا' ان کی

کوئی خبرگیری نہ کی، ایک عالم کو انھوں نے ننگا پایا، لیکن ان سے نگاہیں پھیریں، نرم نرم گدوں پر بیٹھے ہوئے اونچے اونچے ایوانوں سے بیکس اور مظلوم انسانوں کی آہ و فریاد کا حسرت ناک منظر دیکھا لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی، یتیموں، بیواؤں اور مصیبت زدہ لوگوں کی بے قرار آہیں ان کے ظالم گلے میں باہیں ڈال ڈال کر انسانی رحم و ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھیں انھوں نے ان کی ٹھوکروں سے خبر لی، ایسے لوگ جو انسانی سوسائٹی کے حق میں زہریلے سانپ اور انسانیت کے جسم میں خطرناک جراثیم سے بھی بڑھ کر تھے، قیامت کے دن ان کی سزا بھی ان کے لائق تجویز کی گئی کہ وہی سونا اور چاندی، جس پر ان کو فخر و ناز تھا، جس کی وجہ سے انھوں نے ایک عالم کی زندگیوں کو پامال کر دیا تھا، آج گرم کرکے ان کی ان پیشانیوں پر داغ دئے جا رہے ہیں، جو مظلوموں اور محتاجوں کی حالت زار دیکھ کر بل کھا جاتی تھیں، ان کے ان پہلوؤں کو کباب کی طرح بھونا جا رہا ہے، جو کبھی نرم نرم ریشمی بستر پہ لیٹے ہوئے مزدور، مفلس اور فاقہ کش انسانوں کو فاقہ و افلاس کے انگاروں پر لوٹتے اور کروٹیں لیتے ہوئے دیکھا کرتے تھے اور ان کی ان پشتوں کو جلایا جا رہا ہے، جن پر عالم کے بیکسوں، محتاجوں اور غریبوں کے بے شمار وزنی بوجھ لدے ہوئے تھے، یہ تمام سزائیں ان کو محض اس وجہ سے دی جا رہی ہیں کہ انھوں نے انسانی حقوق کی نگہداشت نہیں کی، انھوں نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ زکوٰۃ کے مصارف کیا کیا تھے اور کتنے کام اس سے سنور سکتے تھے، ان کے پیش نظر زندگیوں کے یہ مناظر موجود تھے لیکن انھوں نے

ان کو غور سے نہیں دیکھا کہ

انما الصدقات للفقراء	زکوٰۃ جو ہے، حق ہے مفلسوں محتاجوں
والمساکین والعاملین	اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا
علیها والمؤلفة قلوبهم	اور جن کے دلوں کی تالیف منظور ہو اور
وفی الرقاب والغارمین	گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان
وفی سبیل الله وابن السبیل	بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے
فریضة من الله (توبہ)	مسافر کو، اللہ کی جانب سے مقرر کیا ہوا ہے

ان کو نہیں معلوم کہ زکوٰۃ نہ دینے سے کتنے محتاجوں کا گلا گھونٹ دیا، کتنے کام بگڑ گئے، کس قدر زندگیاں تباہ و برباد ہو گئیں اور کتنے انسانوں کا خون بہ گیا؟

درحقیقت اسلام نے نظام زکوٰۃ مقرر کر کے دنیا پر ایک ایسا عظیم ترین احسان کیا، جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، جب تک عالم اسلام اس پر کاربند رہا، اسلامی جمہوریت کی روح باقی تھی، اور جب سے مسلمانوں نے اس سب سے بڑے اسلامی اصول سے روگردانی کی، ان کی ساری کڑیاں درہم برہم ہو گئیں، اسلام نے جس اہم مقصد کو پیش نظر رکھ کر جمہوریت کی تشکیل کی تھی اور اس پر جس شاندار عمارت کو کھڑا کیا تھا، کیا اس کے اصول کو چھوڑ کر اپنے من گھڑت قومی چندہ یا "مہذب بھیک" کے ناپائدار ستونوں پر یہ بنیادیں کھڑی رہ سکتی ہیں؟

اسلام کے مبارک دور میں اس کا قائم کیا ہوا بیت المال تھا، جو محتاجوں، غریبوں، غلاموں، مسافروں، مصیبت زدہ انسانوں، یتیموں،

بیواؤں غرضکہ ساری خزاں رسیدہ زندگیوں کے لئے ابر بہار تھا۔ یہی وہ سرچشمۂ حیات تھا، جہاں سے زندگی کے چشمے پھوٹ کر ایک عالم کو سیراب کیا کرتے تھے تمام قومی ضروریات اور عظیم الشان کام سرانجام دئے جاتے تھے، اسی سے فقر و افلاس اور فاقہ و غربت کی بیخ کنی کی جاتی تھی، اب بھی اسلام کے اس بیش بہا اصول میں یہ لچک باقی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہر معاشی و اقتصادی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

اجتماعی پہلو اور دعوت فکر و نظر۔ اسلام نے جو نظام زکوٰۃ پیش کیا ہے نہ صرف عالم اسلام بلکہ ساری دنیا اس کے بتلائے ہوئے اصول پر عمل کرکے اجتماعی زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے۔

یہی اقتصادی اور اجتماعی مشکلات ہیں، جن سے قومیں دوچار ہوئی ہیں، قوموں کی تباہی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنا اقتصادی توازن کھو بیٹھتی ہے، جس سے زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، وہ سوسائٹی کے ربط و اتحاد کو قائم نہیں رکھ سکتی تاوقتیکہ اس کا مالدار طبقہ غریبوں محتاجوں اور مزدوروں کی خبرگیری نہ کرے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا اکثر و بیشتر حصہ خصوصاً یورپ، اسلام کے اس مقصد عظیم سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے اقتصادی و معاشی پیچیدگیوں میں گھرا ہوا ہے، سوسائٹی کا ضبط و نظم بہت ہی خطرناک اور نازک صورت اختیار کر چکا ہے، ان تمام خرابیوں کی جڑ وہ سرمایہ دار طبقہ ہے، جس پر دولت و سرمایہ داری کا جن سوار ہے اور بے شمار انسانی زندگیوں کو پامال کئے ہوئے ہے۔

یورپ اور امریکہ میں مزدوروں کی حالت ان غلاموں اور قیدیوں سے بدتر ہے، جو مشرقی ممالک میں ہیں، روزانہ دس گھنٹے پہاڑوں دریاؤں اور زمین کے اندر لگاتار کام کرتے رہتے ہیں، اس محنت و جفاکشی میں ان کے جسم کی ہڈیاں چور چور اور چہرے گرد و غبار آلود ہو جاتے ہیں، شام کے وقت ان کو اتنی اجرت نصیب ہوتی ہے کہ جو ان کی خوراک کے لئے بھی ناکافی ہے، پھر جب وہ اپنے گھر واپس ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ نہ تو بیوی اپنے کام سے فراغت پاکر آئی ہے اور نہ بچوں ہی کا پتہ ہے، پھر کچھ دیر بعد بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے کارخانوں میں سخت مزدوری کرکے اپنی ناکافی خوراک کے ساتھ ایک اندھیرے جھونپڑے میں جو قرون وسطیٰ کی یادگار معلوم ہوتا ہے، جمع ہوتے ہیں اور آدھ پیٹ کھانا کھاکر سو جاتے ہیں، پھر صبح سویرے اُٹھ کر حسب معمول مزدوری کرنے کے لئے چلے جاتے ہیں، غرض اسی طرح افلاس و غربت اور محنت و مشقت میں ان کی پوری زندگی بسر ہوتی ہے۔

یہ سب ان افراد کی خدمت بجا لانے کا فیض ہے، جو اونچے عالیشان محلوں میں رہتے ہیں، نفیس لباس پہنتے، ریشمی بستروں پر سوتے اور اچھی اچھی لذیذ غذائیں کھاتے ہیں، دن رات عیش و عشرت کی محفلوں اور رقص و سرود کی مجلسوں میں سرگرم رہتے ہیں، شراب کے رنگین جام جن میں مزدوروں کسانوں اور فاقہ مستوں کا خون جھلکتا اور رقص کرتا رہتا ہے، اپنے منہ سے لگائے رہتے ہیں، گویا یہ اپنی زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ "ہم ہی زندگی کی

لذتوں کے مستحق ہیں تم مرجاؤ فنا و برباد ہو جاؤ، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، ہمیں اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے دو، تمھیں جینے اور زندگی کی مسرت بخش گھڑیوں سے لطف اندوز ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

یہی حالت یورپ میں سرمایہ داروں کی ہے، ایک طرف مالداروں اور امیروں نے غریبوں اور مزدوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے، تو دوسری طرف اٹھارھویں صدی عیسوی میں اشتراکیوں کا گروہ سرمایہ داری کا سر کچلنے اور اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے نیست نابود کرنے پر تلا ہوا ہے اور لوگوں میں مساوات قائم کرنے، انسانی حقوق کو برابر برابر حصوں میں تقسیم کرنے کی آوازیں بلند کر رہا ہے، ایک طرف فوضویوں کی جماعت حکومتوں کے خلاف بغاوت پھیلا رہی ہے اور بآواز بلند پکار کر کہہ رہی ہے کہ حکومتوں کے تختے اُلٹ دو، ان کو دنیا سے فنا کے گھاٹ اتار دو، اس کی وجہ صرف یہی ہوئی کہ انھوں نے دیکھا کہ تمام بلاؤں اور انسانی مصیبتوں کا سرچشمہ صرف حکومتیں ہیں اور وہ انسانوں کو غلام بنا کر ان کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں تو انھوں نے ان کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ حکومت کے بڑے بڑے حامیوں اور رؤسا کو قتل کر دیا اور آئے دن خونی تحریکات برپا کر رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان خرابیوں اور بدنظمیوں کا سبب کیا ہے! کیا وجہ ہے کہ دونوں جانب سے خوفناک جنگ جاری ہے روز افزوں فتنہ و فساد کی چنگاریاں بھڑک رہی ہیں؟ کیا کوئی ایسی صورت نہیں جو اغنیاء، اشتراکیوں اور مزدوروں کے درمیان

اتحاد و تنظیم قائم رکھا جا سکے ؟

بیشک اس مشکل مسئلہ کا حل اور اس مرض کا واحد علاج ایک صرف ایک ہے، اور وہ زکوٰۃ ہے، یہی وہ حق انسانیت ہے جس کو مالدار سال میں ایک مرتبہ اپنے مالوں تجارتوں زمینوں میں سے فقراء و غرباء اور مساکین کو ادا کیا کرتے ہیں، یہ زکوٰۃ اسلام میں واجب اور فرض ہے یہاں تک کہ ابو بکرؓ نے فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ کا انکار کر بیٹھیں جس کو رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا اور زکوٰۃ لوں گا"

زکوٰۃ کا مسئلہ اجتماعی حیثیت رکھتا ہے، اسلام نے جو نظریات اس کی تشکیل و تنظیم سے متعلق پیش کئے ہیں، ایک طرح سے تمام اشتراکیوں اقتصادیوں اور عمرانیوں کے نقطہائے نظر سے ملتے جلتے ہیں، سب اس امر پر متفق ہیں کہ جو مال افراد قوم کے ہاتھوں میں متداول ہے، وہ سب مجموعی حیثیت سے قوم ہی کا ہے، لیکن اس پہلو سے وہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اس مال سے کس طرح استفادہ کیا جائے، اشتراکیین کہتے ہیں کہ تمام مال کو افراد کے ہاتھوں سے لے لیا جائے اور ایک جگہ جمع رکھا جائے جس کو جتنی ضرورت ہو، اسی کے مطابق تقسیم کیا جائے، اقتصادیوں کا گروہ اس نظریہ کے مخالف ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا خیال تسلیم کر لیا جائے تو بہت بڑے بڑے کام انجام نہیں پا سکیں گے، کیونکہ ایک بہت بڑا سرمایہ تلف ہو جائے گا، اس لئے ضروری ہے کہ چند ایسے اولوالعزم اور اونچے افراد کے ہاتھوں میں یہ مال دے دیا جائے، جس کو وہ

کارہائے نمایاں میں صرف کریں، عمرانیوں کا طبقہ اس امر کا قائل ہے کہ اجتماعی زندگی میں اغنیاء اور فقراء کا وجود بہر صورت ضروری ہے کیونکہ تہذیب و عمران کی ترقی کا دارو مدار انھیں پر ہے! ورنہ اونچے ارادوں کو ظاہر ہونے اور اولوالعزم انسانوں کو ابھرنے کا موقع نہیں ملے گا اور مقصد حیات فوت ہو جائے گا، چنانچہ اسلام کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ اس نے فرق مراتب اور طبقاتی نظام کو برقرار رکھا اور اس کے موافق اپنے قوانین و اصول دنیا کے روبرو پیش لئے۔ ایک طرف اقتصادیوں کو وہ پکار کر اس امر کی طرف دعوت دے رہا ہے کہ میں تمھارے مالوں کی حفاظت کرتا ہوں، دوسری طرف عمرانیوں کو کہہ رہا ہے کہ میں تمھارے اغنیاء و فقراء کے طبقات کو باقی رکھتا ہوں، تیسری طرف اشتراکیوں کو سمجھا رہا ہے کہ تم جو یہ دعوی کر رہے ہو کہ مال پوری قوم کا حق ہے اس میں کسی خاص فرد کا دخل نہیں، بیشک میں تمھاری اس تحریک میں تمھارا ہم نوا و ہم آہنگ ہوں، اس وجہ سے میں نے ان مالداروں کو برقرار رکھا ہے تاکہ یہ قوم کی عظیم الشان خدمتوں کو انجام دیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے ان پر یہ بھی واجب کردیا ہے کہ وہ فقراء و مساکین کے لئے سال میں ایک مرتبہ اس مال میں سے صدقہ یا زکوٰۃ کے طور پر کچھ حصہ نکال دیا کریں۔ تاکہ ان حاجت مندوں کی زندگی بھی اچھی طرح بسر ہو سکے!!!

اسلام میں فقر و افلاس کا علاج اور اس کا اقتصادی نظام

فقر و افلاس کا مسئلہ جو انیسویں صدی عیسوی میں اقتصادیات واجتماعیات کے ماہرین کا مرکز بحث و نظر بنا ہوا ہے ایک ایسی خوفناک صورت اختیار کر چکا ہے، جس کے تصور سے دنیا کا دل لرز رہا ہے، اس کے مسموم اثرات سے فضلائے عالم مکدر ہو گئے، جا بجا مختلف گروہ بن گئے، جس کی وجہ سے مزدور اور سرمایہ دار طبقہ میں ایک کشمکش اور طولانی جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بڑے بڑے عالی دماغ اور ارباب فکر چکر میں ہیں، لیکن اسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل ہی اس کی اہمیت و نوعیت کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس کے نتائج و عواقب پر نظر کرتے ہوئے اس نے اس مسئلہ کا وہ آسان حل پیش کیا جس کو موجودہ تخریبی نظام اور سطحی طرز معاشرہ ماننے سے انکار کرے تو کرے، لیکن موجودہ انقلابی آثار بتا رہے ہیں کہ قوموں کو ایک نہ ایک دن اپنی روش بدلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آئے گا انجام کار ساری دنیا کو اسلام کے اس تعمیری نظام اور درست طرز معاشرہ میں نجات اور بہبودی کی سبیل تلاش کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا،

کیا یہ حضور اکرمؐ اور اسلام کا عظیم الشان اقتصادی معجزہ نہیں ہے، کیا اسلام نے ایک ایسے خطرناک مسئلہ کی پیچیدہ گتھی کو نہیں سلجھایا؟ جس کا گمان بھی اس زمانے میں دشوار تھا؟ جس کے خطرات و نتائج سے

لوگوں کے اذہان نا آشنا تھے، حالانکہ ہر زمانے میں یہ چیز سوسائٹی کے لئے مہلک اور ضرر رساں تھی، مگر اسلام نے اس کی تمام خرابیوں اور نقصانات کو اول نظر میں سمجھ لیا تھا، پھر اس نے اجتماعی اضطراب کی صحیح تشخیص کر کے اس کا وہ نسخہ پیش کیا جس میں سوسائٹی کی مہلک بیماری کا علاج بدرجۂ اتم موجود ہے۔

اسلام کے اس اقتصادی معجزہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں مسئلۂ فقر و افلاس کی اجمالی تاریخ اور اس کی تشخیص و علاج پر علم اجتماع کے اصول و قوانین کی روشنی میں ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔

ارباب بحث و فکر نے ہر قدیم قوم کے عناصر کا جائزہ لیا تو ان کو دو طبقے نظر آئے، ایک مزدور دوسرا سرمایہ دار ان کے علاوہ انھیں کوئی تیسرا گروہ نہ ملا، ان میں ایک خاص چیز یہ نظر آئی کہ سرمایہ دار طبقہ وسیع حد تک خوش حال تھا،

مزدور طبقہ افلاس و تنگ دستی کا شکار ہو چلا تھا، جس کی وجہ سے اجتماعی بنیادیں کمزور پڑ گئی تھیں، عیش پرست اور خوش حال طبقہ اس سے نا آشنا تھا کہ کس جانب سے اس پر اس عمارت کا چھت گر پڑے گا۔

مصر کی سرزمین اپنے قدیم زمانے میں رشک فردوس بنی ہوئی تھی، وہاں کی پیداوار اس قدر تھی کہ اس کے دو چند باشندوں کے لئے بھی کافی ہو سکتی تھی، لیکن مزدور طبقہ نہایت پریشان حال تھا۔ اس کی زندگی افلاس اور تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی، اس لئے

کہ سرمایہ دار خوش حال گروہ تمام جائدادوں اور غلوں پر قابض تھا۔
جب اٹھارھویں صدی میں سرمایہ داری کا دور دورہ ہوا اور فقر و
افلاس کی گھٹائیں مزدوروں کی زندگیوں پر چھا گئیں تو انھوں نے
سرمایہ داروں کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا، مال داروں نے
انھیں بری طرح مصائب کے شکنجہ میں جکڑ دیا اور ان پر انسانیت
سوز مظالم ڈھائے۔

بابل اور نینوا کی سلطنت کا بھی وہی حال تھا جو مصر کا تھا،
غریب اور مزدور طبقہ کو ان کی زمینوں کے غلوں اور پھلوں میں کوئی
حصہ نہیں تھا حالانکہ زراعت کے ممالک بلحاظ پیداوار، نشو ونما اور
شادابی کے دیگر شہروں سے ممتاز تھے ایران کی بھی تقریباً یہی حالت
تھی۔

قدیم یونانیوں کا حال اس سے بھی بدتر تھا، ان کے ملکوں کی
بعض روایات ایسی ملتی ہیں، جن کے سننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے
ہو جاتے ہیں غریب اور مفلس جماعت سے بدترین کام لئے جاتے تھے
اس کے لئے ان پر کوڑے استعمال کئے جاتے تھے اور ادنیٰ غلطیوں پہ
جانوروں کی طرح سے ان کو ذبح کر دیا جاتا تھا۔

اسپارٹا کے بعض ملکوں میں سرمایہ دار طبقہ مزدوروں کے لئے
ایسی زمین چھوڑ دیتا تھا، جو ناقابل کاشت ہوتی اور پیداوار کی مطلق
صلاحیت نہیں رکھتی تھی، اس طرح وہ قسم قسم کے فقر و افلاس کی
مصیبتوں کا شکار تھے۔

اتھنس میں مال دار لوگ غریبوں پر اس حد تک حکومت

کرتے تھے کہ ان پر عائد کردہ لگان نہ ادا کرنے کی صورت میں ان کو غلاموں کی طرح فروخت کر دیتے تھے۔

روم جو شرایع و قوانین کا سرچشمہ اور فقہاء اور قانون دانوں کا مالک کہلاتا ہے، یہاں کے مال دار لوگ عوام پر بری طرح مسلط تھے اپنے لئے وہ اس قدر امتیازات اور مراتب مقرر کر چکے تھے کہ عوام کی ان کے نزدیک کوئی ہستی نہیں تھی، صرف ان کی اس قدر حیثیت تھی جیسا کہ ہندوستان کے برہمن طبقہ کے پاس شودروں کی ان سے سخت ترین کام لئے جاتے تھے جس کی وجہ سے بسا اوقات ان کو اپنا شہر اور اپنی جماعت چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں ہجرت کرنی پڑتی تھی۔

مشہور مورخ "علامہ میشلیر" نے سلطنت رومانیہ کے اسی پہلو کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "سلطنت رومانیہ میں روز بروز غریبوں کی تعداد میں فقر و فاقہ کی وجہ سے اضافہ ہوتا تھا اور سرمایہ دار طبقہ اور زیادہ مال دار ہوتا تھا، یہ اپنی زبان سے کہا کرتا تھا کہ اگر اہل وطن میدان جنگ میں جانے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں تو ان کو بھوکوں مر جانا اور ہلاکت کے گھاٹ اتر جانا چاہئے۔

جب دولت رومانیہ کا خاتمہ ہو گیا، یورپی ممالک اس پر قابض ہو گئے، تو مزدوروں اور غریبوں کی حالت اور بدترین ہو گئی، وہ اپنی جائداد سمیت چوپایوں کی طرح فروخت کئے جاتے تھے۔

جب انیسویں صدی کا ظہور ہوا، علوم اجتماعیہ کی پیداوار غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور لوگوں کے اذہان قوموں اور سوسائٹیوں کے

اتحاد و کشمکش اور یکجہتی و تفرقہ پردازی کے اسباب سے آگاہ ہوئے تو سبھوں نے فقر و افلاس کی متعدی اور مہلک بیماری کا احساس کیا اُنھوں نے سمجھ لیا کہ یہی چیز قوموں کے لئے آفات کا موجب اور اجتماعی بنیادوں کو کمزور کرنے کا باعث ہے۔

چنانچہ ایک گروہ نے یہ تحریک پیش کی کہ مال داروں کو غریبوں کے لئے اپنے مال سے صدقہ دینا چاہیے، مخالف جماعت نے اس کے خلاف آواز بلند کی کہ اس کے نتیجہ میں خود اعتمادی اور علو ہمتی کے جذبات فنا ہو جائیں گے، ظاہر ہے کہ بیکاری بڑھ جائے گی اور سوسائٹی کے لئے فتنہ و خلل کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ بعضوں نے یہ رائے پیش کی کہ ان کے لئے ہجرت کے دروازے کھول دئے جائیں اور اس کی طرف ان کو دعوت دی جائے تو کہیں اس پر اعتراض پیش کیا گیا کہ اس سے بہت سے خطرات لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔

آخرکار ان مختلف نظریات سے اتنا تو ہوا کہ انجمن ہائے امداد باہمی کی تشکیل وجود میں آئی، اس سے بہترین نتائج برآمد ہوئے، کیونکہ ان انجمنوں کے اندر اتنی صلاحیت تھی کہ وہ مزدوروں کی ضرورتوں اور ان کی کمزوریوں کی گہرائی تک پہنچ کر حکومتوں سے ان کے حقوق کا مطالبہ کریں اور ان کے وجود کے لئے بہترین اور مفید قوانین صادر کرنے کی سعی کریں اگر ان انجمنوں سے بے شمار پیچیدگیاں بڑھ گئیں اور جماعتوں میں ایک انقلاب رونما ہوگیا، چنانچہ یہ مسئلہ اجتماعی مسائل میں بہت ہی

اہم شکل اختیار کر چکا ہے اور ہر قسم کے طبقہ کا موضوع بحث بن گیا ہے، مشاہدہ کے لئے یہی کافی ہے کہ آج تین چار کروڑ مزدور بیکاری کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں، نہ ان کو کوئی کام ملتا ہے اور نہ ہی کھانے کا کوئی ذریعہ۔ حکومتیں مجبور ہو گئی ہیں کہ انکے لئے قوم سے مال لے کر کوئی روزگار کا دروازہ کھولیں۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیروں اور غریبوں پر خاص توجہ صرف کی اور آپ فقر کی بے حد قدر و وقعت فرماتے تھے، چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے

کاد الفقر ان یکون کفرا — ڈر ہے کہ کہیں فقر کفر نہ ہو جائے۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

اللھم انی اعوذ بك من الفقر — اے خدا میں فقر سے تیری پناہ میں آتا ہوں

کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آج فقر و افلاس کتنی زندگیاں تباہ و برباد کئے ہوئے ہے اور تہذیب کی بنیادوں کو کس حد تک ڈھانے پر آمادہ ہے؟

سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس معرکہ آرا مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟ اس نے ایک ایسا اقتصادی نظام ایجاد کیا ہے، جو تمام عمرانی اصول پر مشتمل ہے، جس سے فقر و افلاس کا ازالہ اور اس کے خطرناک امراض کا علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مال داروں کو اس امر پر مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے اموال سے صدقہ دیا کریں، صدقہ عرف عام میں زکوٰۃ کو کہتے ہیں اور زکوٰۃ ہر مال دار پر اجباری انکم ٹیکس ہے جو اجتماعی اغراض و مصالح کے لئے حکومتی اموال سمجھ کر سرمایہ دارو

حاصل کیا جاتا ہے' یہ وہ صدقہ نہیں ہو سکتا جو ہمتوں کو پست اور ارادوں کو سست کر کے کاہلی اور بیکاری کا سبب بنے' اسلام نے ان اموال میں تصرف کرنے کا حکم خاص کر حکومت کو عطا کیا ہے کیونکہ حکومت ہی اجتماعی حالات اور وقتی ضروریات و حاجات کے پیش نظر صرف کرتی ہے' سرمایہ داروں سے زکوٰۃ حاصل کرنے کا یہ وہ اصولی طریقہ ہے جس کی طرف آج تمام مغربی حکومتوں کو مجبور ہونا پڑا ہے' جو سرمایہ' میراث' اشیاء تجارت غرضکہ ہر چیز پر انکم ٹیکس عائد کر رہی ہیں' ان تمام سے مقصود غریبوں' حاجت مندوں اور مزدوروں کی حاجت روائی ہے' لیکن اسلام اس میدان عمل میں ان سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر نظام زکوٰۃ مقرر کر کے گوئے سبقت لے گیا ہے' درحقیقت یہ نظام سرمایہ داروں کی عیش پرستی اور ان کی خوش حالی کے خلاف ایک اصلاحی اور تردیدی صدائے احتجاج ہے۔

میشلیر نے یہ جو کہا ہے کہ ایک طرف مال دار لوگ ہر سوسائٹی میں بڑھتے جاتے تھے اور دوسری طرف مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا' یہ وہ مدافعانہ حرکت ہے جو ہمیشہ سے مال دار طبقہ کا خاصہ رہی ہے' جس کے نتیجہ میں اس کا مخالف گروہ بھی ہمیشہ اس کے خلاف اپنی مدافعت اختیار کرتا ہے' اسی باہمی کشمکش میں دونوں طبقات میں توازن برقرار رہتا ہے' اسلام نے جو نظام زکوٰۃ مقرر کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں محدود نہ کر دیا جائے' جس سے عام طبقہ مستفید ہونے سے محروم ہو جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے فقر و افلاس کی بیخ کنی کرنے اور

اس کے خطرات میں تخفیف کرنے کے لئے مذکورہ بالا حل کے ساتھ دیگر عمرانی اصول کو بھی نظر انداز نہیں کیا چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہجرت کی دعوت دی ہے۔

وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً (سورہ نسا)	اور جو شخص اللہ کے راستہ میں وطن چھوڑ دے تو اس کے مقابلہ میں بہت جگہ اور کشایش پائے گا۔

سوسائٹی کے تعاون باہمی پر خاص طور سے ترغیب دی ہے

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورہ مائدہ)	اور بھلائی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم امداد نہ کرو۔

اِن مشاہدات سے معلوم ہوگیا کہ اسلام نے فاقہ کو کم کرنے کے لئے ایسے اصول مقرر کئے اور ان تمام سے ایک ایسا محکم نظام پیش کیا، جس پر عمل درآمد ہوکر سوسائٹی میں منظم ادارہ کی تشکیل میں اقتصادی حرکت کی جا سکتی ہے، اس لئے زکوٰۃ فرض کرکے یہ احتمال رفع کر دیا کہ تمام سرمایہ محض چند افراد کے ہاتھوں میں جمع رہے، پھر ملکی سرمایہ پر سے غیر معمولی دباؤ کو کم کرنے کے لئے اور سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی اور اس سے اسی متعاون جماعت کی تشکیل کا نظریہ پیش کیا، جو سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان عافیت وصلح و امن سے زندگی کے نشیب و فراز کو

ہموار کرتی رہے۔

اس کے علاوہ اسلام نے اختیاری صدقہ پر بھی ترغیب دی ہے، اس طریقہ کے ایجاد کرنے میں اسلام ہی تنہا نہیں بلکہ اس نے تمام ادیان و مذاہب اور اخلاقی اصول و تعلیمات کو پیش نظر رکھا اور ان کی تائید کی' اس امکان کو دور کر دیا کہ یہ صدقہ سوسائٹی کے بعض طبقات کے لئے آرام پسندی کا باعث ہو' اس کا ثبوت یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس جب لوگ دور دور سے ہجرت کر کے آتے تھے اور ان کے لئے کوئی روزگار کی سبیل نہ تھی اور اس وقت امت اسلامیہ ابھی تکوینی مراحل سے گزر رہی تھی تو آپ ان کو مسجد میں ٹھہرنے کا حکم فرماتے' چنانچہ ان کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی' یہ جنگ کے موقعوں پر آپ کے ساتھ شریک ہوتے اور جنگ ختم ہونے کے بعد پھر مسجد میں چلے آتے' لوگ ان کے اخراجات برداشت کرتے تھے' جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور عرب کی سلطنت وسیع تر ہو گئی تو آپ نے یہ کہہ کر ان کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی کہ رسول اللہ صلعم نے تمہاری دیکھ بھال ایک ایسے زمانے میں کی جب کہ تمہارے لئے کوئی ذریعہ معاش نہ تھا' لیکن آج تمہارے سامنے وسیع حد تک روزگار کے بے شمار راستے کھلے ہوئے ہیں' اب تم اپنا فرض انجام دو اور اوروں کے ساتھ مل کر کام کرو۔

مخالفین اسلام کی یہ کس قدر بدذہنی اور جہالت ہے کہ انھوں نے اسلام کے اس نظام پر بلا سمجھے بوجھے اعتراض کیا ہے

اور اپنے دعوی میں یہ پیش کیا ہے کہ محمد صلعم، اپنے ابتدائی زمانے میں محرومی کی زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے صدقہ کی ترغیب دی لیکن ان کو نہیں معلوم کہ جس وقت آپ کے والد کا انتقال ہو گیا تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش کا ذمہ لیا، جو قریش کے سردار تھے، جن کا گھر محتاجوں، مسافروں اور مہمانوں کا مرجع تھا، ان کے انتقال کے بعد آپ کے چچا آپ کے کفیل بنے، جو کہ قریش کے مشہور سرداروں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، خود آنحضرت صلعم کبھی بیکار نہ تھے بلکہ آپ نے بچپن ہی سے تجارت شروع کی اور بعثت تک برابر یہ شریف پیشہ اختیار کئے رہے، یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ابتداءً آپ کی زندگی فاقہ میں بسر ہوتی تھی ... آپ خوش حالی سے بسر کرتے۔

کیا یہ تمام شواہد اسلام اور آنحضرت صلعم کے تفوق شان کی واضح دلیل نہیں ہیں؟ کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ قوموں کی تعمیر اور خاندانوں کی تشکیل و تنظیم کے عظیم الشان کارکن اور بانی کی حیثیت رکھتے ہیں؟ آپ نے اجتماعی طبقات کو تشکیل دینے اور اجتماعی اہم مسئلہ کو سلجھانے میں جو فکر و نظر صرف کی اور اقتصادی نظام پیش کیا، اس کے نقش قدم پر بیسویں صدی کی قوموں کو چلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں

دوسرا طریقہ **حج**:-

کعبۃ اللہ اور مقدس مقامات کی مخصوص افعال و اقوال

کے ساتھ زیارت کرنے کا نام حج ہے، اس کے چند اہم اجتماعی مقاصد ہیں۔

اخوت اسلامی۔ مذہب اسلام کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اکثر احکام و تعلیمات میں اخوت اسلامی کی جھلک پائی جاتی ہے، بیشتر اسلامی احکام میں برادرانہ تعلقات برقرار رکھنے اور ربط و اتحاد بڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے باہمی بغض و نفرت کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ۔ آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم پسپا ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (سورہ انفال)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لن تدخلوا الجنۃ حتی تؤمنوا ولن تؤمنوا حتی تحابوا — تم جنت میں ہرگز نہ داخل ہوگے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ اور مومن نہیں کہلاؤ گے جب تک کہ آپس میں اتحاد و محبت نہ پیدا کرو۔

پنج وقتہ نماز جمعہ اور عیدین میں ایک جگہ مجتمع ہونے کا مقصد یہی ہے کہ ایک شہر یا ایک محلہ کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور باہمی ربط و محبت میں اضافہ ہوتا رہے، شرعی اور اجتماعی ہر قسم کے ضروری مصالح وقتاً فوقتاً سوچا کریں، چوں کہ اجتماع کی اس نوعیت سے پورے اسلامی مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی، اس کا فائدہ کسی ایک شہر یا محلہ تک ہی محدود ہو جاتا ہے، اس لئے ایک ایسے

عام اجتماع کی ضرورت پیش ہوئی، جس میں روئے زمین کے تمام مسلمان ہر ملک و شہر سے ایک مقام پر جمع ہوں، جن کا مقصد ایک مذہب ایک اور خیالات ملتے جلتے ہوں، امت اسلامیہ کے علماء خطباء اور حکماء ان لوگوں کو، جو اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں آشنا کرائیں، ان کو اسلامی احکام و مقاصد سمجھائیں، اسلامی سلطنتوں اور ملکوں کے حالات دریافت کریں، وہاں کی قوم ملک و ملت کے اخلاق و عادات، علوم و فنون، کاروبار، دینی، سیاسی، اقتصادی حالات اور ہر قسم کے معاملات و امور سے روشناس ہوں، اجتماعی اہم مسائل پر تبادلِ خیال کریں، مصالح اسلامیہ اور غور طلب امور میں فکر و بحث سے کام لیں، باہمی تعاون کے نظریہ کے تحت ایک دوسرے کی حکومت و سلطنت کی بابت بلحاظ تجارت و زراعت، صنعت و حرفت اور طرز معاشرت وغیرہ کے معلومات حاصل کریں تاکہ کوئی ضرورت و حاجت تشنۂ تکمیل ہو تو باہمی امداد حاصل کی جائے۔

آثار ماضیہ کی یاد۔ مقدس و متبرک مقامات کی زیارت دل میں گزشتہ آثار و واقعات کی یاد تازہ کر دیتی ہے حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے جنت سے نکل کر دنیا میں آنے کی حالت ان کی گریہ و زاری اور توبہ و مناجات کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے حالات اور ان کے عرفانی واقعات کے نقش و نگار ذرہ ذرہ میں آشکار نظر آنے لگتے ہیں کہ کس طرح یہ آزمائشوں میں مبتلا کئے گئے

سے تھے، بیٹا باپ کے فرمان کی تعمیل کس خندہ پیشانی سے بجا لایا، کیوں کہ باپ نے بیٹے کو ذبح کر کے حکم خداوندی کی تکمیل کی تھی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر انوار و برکات کی وہ بارش برسائی کہ ان کی تکالیف دور ہو گئیں اور ان کی جگہ مسرت و اطمینان نے لے لی۔

زائر کی آنکھوں میں اسلامی تاثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے رسول اللہ صلعم کی ولادت باسعادت، دین اسلام کی نشو و نما، ہجرت کے مشاہدات، کفار قریش کے مظالم آنحضرت صلعم اور صحابہ پر، غرض کہ یہ اور اس قسم کے جملہ واقعات جن سے اسلامی عظمت و شان آشکار رہے، زائرین کے سامنے مجسم ہوتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام قوت و اقتدار سے نہیں پھیلا، بلکہ تائید ایزدی اس کے شامل حال تھی۔

کیا ان تمام واقعات کو زندہ کرنے سے زائرین کے دل و دماغ تاثرات کی گہرائی میں نہیں ڈوب جاتے اور اللہ کے احکام و اوامر کی بجا آوری کا اقرار اور آرزو ان کے دلوں میں نہیں پیدا ہوتی ان کے اخلاق و عادات اور زندگی میں حیرت انگیز انقلاب برپا نہیں ہو جاتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی باعظمت اور بلند نشانیوں کو دیکھنے اور گزشتہ آثار کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد نفس انسانی کے اندر اسلامی عظمت و احترام کا بے پایاں جذبہ پیدا ہوتا اور الٰہی جلال و کبریائی کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

اعتدال پسندی۔ انسانی نفوس بے جا زیادتی کرنے کے عادی رہتے ہیں، جن سے ان کو منع کرنا ہمیشہ ان پر شاق گزرتا ہے اس کے اندر جو فساد و نقصان ہے وہ انسانی اجتماع کی برداشت سے باہر ہے اس کی اصلاح دشوار ہو جاتی ہے اس لئے حکمت ایزدی اس امر کی داعی ہوئی کہ نفوس کو بے جا ظلم و زیادتی سے روکا جائے اور عدل و انصاف کے جذبات ان کے اندر پیدا کئے جائیں۔

اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انتہائی احترام و عظمت بجالانے کے لئے حج کے مواسم اور مقامات مخصوص کر دئیے اور احکام حج کو ادا کرنے میں دگنا ثواب اور ان کے ترک کرنے میں سخت عذاب مقرر فرما دیا تاکہ انسانی نفوس سرکشی اور ظلم سے باز رہیں اور عدل و احسان پر نظر رکھیں، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ شریعت نے زمانۂ حج کے درمیان سلے ہوئے کپڑے پہننے اور خشکی کا شکار کرنے کو حرام قرار دیا ہے، حال آں کہ یہ اوقات حج کے بعد مباح ہیں؟ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔

پہلا یہ کہ انسان بعض اوقات کسی حکم کی اس طرح پابندی کرے کہ وہ اس کی عادت ثانیہ بن جائے پس اگر وہ بعض اوقات یا مقامات میں سخت سزا کے خوف سے جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز رہے تو یہ اس کی ایک مستقل عادت بن جاتی ہے۔

دوسرا یہ کہ عقل مند شخص بگاڑ پیدا کرنے والی چیزوں سے پرہیز کرتا اور اپنے کام کو رخنہ انداز اسباب سے حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، بعض اوقات یا بعض مقامات میں جب یہ

امید رکھ کر عمل کرتا ہے کہ اس میں اس کو دگنا ثواب ملے گا تو گناہ سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا اور برائیوں کی وجہ سے کوئی بگاڑ پیدا کرنے سے احتیاط کرتا ہے، یہ حزم و احتیاط اس کو گناہوں سے دور رہنے اور جرائم کا ارتکاب کرنے سے ہمیشہ روکے رکھتی ہے اس کو ہر دم یہ خوف لگا رہتا ہے کہ اس کا قدم کہیں حدود اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے۔

یادِ محشر ۔ جب تمام مسلمان ایک مقام پر جمع ہوں گے ان کے دل باہمی خلوص و محبت میں ڈوبے ہوئے، خشیت و عظمت الٰہی سے لبریز ہوں گے بہت سارے ہاتھ اس شان سے بلند ہوں گے کہ زبانیں ذکر الٰہی میں مصروف اور دل مختلف دعاؤں اور مناجات میں مشغول رہیں گے، ہر شخص اپنی خلوص نیت اور نیک ارادہ کے مطابق اللہ کی رحمت سے فیض یاب ہوگا، بہت سارے بیم و رجا کے عالم میں سرگرداں ہوں گے، بعض اپنے گزشتہ گناہوں کی یاد سے لرزاں اور رحمت الٰہی کے طلب گار اور بعض اپنے افعال پر پشیمان، خشیت ایزدی سے ان کے دل لبریز ہونگے، اس میں قومی و نسلی رنگ و بو کی تمیز اڑ جائے گی، عالم و جاہل، امیر و فقیر اور ادنی و اعلیٰ سب کے سب برابر ہوں گے، یہ تمام مناظر عرصۂ محشر کی یاد تازہ کرتے اور قیامت کبریٰ کا ہولناک اور ہیبت خیز نقشہ آنکھوں کے روبرو پیش کرتے ہیں اور یہ آیت صادق آتی ہے۔

یوم یفر المرء من اخیہ و	اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں باپ
امہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ	ساتھ والی اور بیٹوں سے گریز کرے گا۔

کیوں کہ یہ اپنے مال، اولاد اور گھر بار کو چھوڑ کر آئے ہیں اور تمام طبقات ایک ہی لباس پہنے ہوئے، دنیوی تعلقات سے علیحدہ بلا امتیاز رنگ و نسل بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوئے ہیں سب کے سب اپنے گناہوں پر شرمسار اور رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں ——— !

تیسرا باب

جماعت کی اصلاح

اسلام نے جماعت کی اصلاح کے لئے دو طریقے اختیار کئے ہیں
پہلا طریقہ۔ صنف نازک کے ساتھ انصاف۔

اجمال

عورت کا درجہ قدیم قوموں کی نظر میں۔

اہل ایتھنس جو بلحاظ تہذیب و تمدن قدیم قوموں میں شمار کئے جاتے ہیں، عورت کو بیش پا افتادہ سامان خیال کرتے تھے، بازاروں میں اس کی خرید و فروخت کی جاتی تھی، اس کو شیطان سے بدتر سمجھا جاتا تھا، اس کو سوائے گھر کی تنظیم اور بچوں کی تربیت کے، باقی تمام انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا، انھوں نے مردوں کے لئے کئی عورتوں سے شادی کرنے کو جائز قرار دے رکھا تھا،

اسپارٹہ میں یہ حال تھا کہ یہاں قانوناً ایک سے زیادہ عورتوں سے

شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا تھا، باوجود اس کے ہر شخص متعدد بیویاں رکھے ہوئے تھا، نہ صرف یہی بلکہ یہاں کا قانون یہ تھا کہ عورت ایک سے زیادہ مردوں سے شادی کر سکتی ہے، بڑی بڑی عورتیں اس رذیل عادت کا شکار ہو گئی تھیں۔

سلطنت رومانیہ میں متعدد زوجات کا رواج قانونی طور پر نہ شروع میں تھا اور نہ آخر میں لیکن باوجود اس کے وہاں کے اکثر شہروں میں یہ رسم بکثرت عام تھی، یہاں کے حکمراں فالنتین دوم نے ایک حکم نافذ کیا، جس میں تمام رعایا کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی تھی، تاریخ سے یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ پادریوں اور رؤسا رکنیسہ نے اس بری رسم کے خلاف آواز بلند کی ہو، وہ اس کا انکار تو کیا کرتے، خود انھوں نے اسی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا، اس طرح سے متعدد زوجات کا رواج پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ جوسٹینان نے اس کے خلاف قوانین وضع کئے جس میں متعدد بیویاں کرنے کو ممنوع قرار دیا، مگر لوگ اس قدیم رسم کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ان سے اس قانون پر عمل نہ ہو سکا صرف طالب علموں کا ایک قلیل گروہ اس کا پابند تھا، جب جرمنی قبائل نے مغربی ممالک پر تسلط پایا، تو متعدد زوجات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، مگر اس میں ان کو کامیابی نصیب نہ ہوئی کیوں کہ بڑے بڑے رؤسا اور پیشوا اس کے عادی ہو چکے تھے قوم کے رہنماؤں نے پادریوں کی خاموشی اور چشم پوشی سے اس کو جائز قرار دینے میں تسامح برتا، یہ وہ حالات تھے جو اس رسم کو باقی

رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

بعض یہودی قبائل لڑکیوں کو خادم کے ہمپایہ شمار کرتے تھے، باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کو فروخت کردے، اور لڑکوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی چیز کی وارث نہیں ہوسکتی تھی —— جاہلیت میں بعض عربوں کے پاس جن پر اپنی ہمسایہ سلطنتوں کی عادات کے اثرات چھائے ہوئے تھے، عورت اس قدر گئی گزری تھی کہ وہ اس کو اپنے باپ یا اپنی بیوی کی میراث کا ایک جزو سمجھتے تھے، یہ قبیح عادت ترقی کرتے ہوئے یمن کے قبائل تک، جن میں یہودی اور عیسائی بھی شامل تھے، سرایت کرگئی۔

غرض کہ تمام انسانی سوسائٹی میں عورت کا درجہ نہایت انحطاط پذیر تھا، متعصب پیشوایان دین نے اس کو حد درجہ حقیر سمجھا اور اس کو شر و فساد کا سبب ٹھہرایا مگر انھوں نے اس امر کو فراموش کردیا کہ جس شر و فساد کو یہ عورت کی طرف منسوب کر رہے ہیں، یہ تمام اس وجہ سے پیدا ہو رہا ہے کہ سوسائٹی کی حالت گری ہوی تھی، اس زمانے میں ہر طرف یہی شور بپا تھا اور تجربات و مشاہدات سے ثابت ہوچکا تھا کہ تمام خرابیوں کی جڑ اور فساد کا سرچشمہ وہ بدنظمی اور خرابی ہے، جو قدیم حکومتوں اور شرائع میں رونما ہوگئی تھی، عورت کی قدر و قیمت بالکل گھٹ چکی تھی اس کے ساتھ حیوانوں کا سا سلوک اور برتاؤ روا رکھا جاتا تھا، وہ بیکس و مجبور کی طرح ظالموں کی استبدادی قوتوں میں گھری ہوئی تھی، غرض کہ ہر حیثیت سے عورت کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی، اسلام نے اس کو

استبدادیت اور مظلومیت کے پنجہ سے نجات دلائی، اس کے درجہ کو نہایت بلند کردیا، چنانچہ قرآن عزیز نے ببانگ دہل اعلان کیا!

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (سورہ بقرہ)

اور عورتوں کے لئے بھی وہی حقوق ہیں جیسا کہ دستور کے موافق مردوں کے حق ان پر ہیں، اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے۔

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے عورت کا نہایت ہی احترام کیا اور اس کو اس کے درجہ تک پہنچایا چنانچہ انھوں نے حضرت عائشہؓ کو از روئے تعظیم و احترام خواتین اہل جنت کی "پیش رو" سے موسوم کیا، اور ثابت ہو گیا کہ حضرت عائشہ تقویٰ و دیانت داری علم و فضل، صلاح و مشورہ اور پاک بازی میں عورتوں کے لئے بہترین نمونہ ہیں، آپ کے بعد بہت ساری خواتین نے آپ سے فیض حاصل کیا اور آپ ہی کے نقش قدم پر چل کر علم و فضل کے بلند مقام پر گامزن ہوئیں۔

دشمنان اسلام بے جا طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق چھین لئے اور اس کو وہ درجہ نہیں دیا جو اس کے لائق تھا، نیز پردہ، طلاق اور دیگر چیزوں کو ایک مشکل امر اور انسانی سوسائٹی کے لئے خطرناک سمجھا ہے، اگر یہ لوگ بنظر انصاف کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور سلف صالحین کی سیرت و آثار کو دیکھیں، تو لامحالہ ان کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام نے عورت کے ساتھ کتنا انصاف کیا اور اس کو مقام انسانیت کے کس رفیع درجہ پر

پہنچا دیا خصوصاً اس وقت، جب کہ عورت زہریلا سانپ اور بدتر شیطان سمجھی جاتی تھی، چین میں اس کو قید خانہ میں رکھا جاتا تھا، فارس میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، مصر میں اس کو حقیر جان کر انسانیت کے حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا، یورپ میں غلاموں اور خادموں کا ہم پایہ تھی اور ممالک عربیہ میں متاع میراث سمجھ کر تقسیم کر دی جاتی تھی، اب اگر اسلام نے اس کو مقام بلند تک پہنچا کر انسانی حقوق عطا کئے، اس کا احترام کر کے اس کو علم و فضل کے زیور سے آراستہ کیا ہے، تو انصاف کیا جائے کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف کیا ہے یا ان قوموں نے جو اس کو استبداد کے شکنجہ میں جکڑے ہوئی تھیں؟

اس سے بڑھ کر عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور انسانیت سوز برتاؤ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۵۸۶ء کو فرانس کے بعض ممالک میں اہل فرانس نے ایک عام جلسہ منعقد کیا، جس میں خاص طور پر اس مسئلہ پر بحث و تمحیص ہوتی رہی کہ عورت کو انسان شمار کیا جائے یا کچھ اور! آخر کار بحث اس امر پر ختم ہوئی کہ جلسہ نے یہ اقرار کر لیا کہ عورت انسان ہے، لیکن محض مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں اس زمانہ میں مبعوث ہوئے جب کہ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی عادت تھی، کوئی ملک بھی اس امر سے واقف نہ تھا کہ نظام جماعت میں عورت کا کیا درجہ ہے، عورت بیٹی ہونے کی حیثیت سے کیا حق رکھتی ہے، بیوی بننے کے وقت اس پر کیا ذمہ داریاں

عائد ہوتی ہیں، ماں کہلانے کے بعد اس کے کیا حقوق ہیں، یہ اور اس قسم کے جتنے امور ہیں ان پر شریعت اسلامیہ میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اس نے عورتوں کے وہ حقوق مقرر کر دئے جن سے انیسویں صدی عیسوی سے پیشتر بعض مغربی ممالک بالکل ناآشنا تھے۔

تفصیل

(۱) عورت اسلام کی نظر میں بحیثیت بیٹی کے

عرب جاہلیت میں یہ عادت تھی کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے، کیونکہ وہ اپنے گھر میں داماد کو دیکھنا نہایت معیوب سمجھتے اور اس کو اپنی خودداری اور غیرت کے منافی تصور کرتے تھے، جس کی توضیح قرآن پاک میں اس طرح کی گئی ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ	اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری
بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ	ملے تو سارے دن اس کا منہ سیاہ رہے
مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ یَتَوَارٰی	اور جی میں گھٹتا رہے اس بری ہوتی خوشخبری
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ	کی برائی کے مارے لوگوں سے چھپتا
بِہٖ اَیُمْسِکُہٗ عَلٰی ھُوْنٍ	پھرے ذلت قبول کرکے اس کو رہنے
اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ	دے یا اس کو مٹی میں داب دے سنو!
اَلَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ	وہ کس قدر برا فیصلہ کرتے ہیں۔

(سورہ نحل)

اسلام نے اس عادت قبیحہ اور انسانیت سوز حرکت کو ممنوع ٹھہرایا اور اس کے ذریعہ سے عورت کو زندگی کا حق عطا کیا، ادھر اس فعل شنیع پر سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے قیامت کے دن بدترین سزا کے دیئے جانے کی وعید سنائی۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ — اور جب کہ جیتی گاڑی گئی بیٹی کو
بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ — پوچھیں کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔

(سورہ تکویر)

اس کے بعد کوئی تعجب کا مقام نہیں اگر تاریخ کے صفحات عورتوں کے نمایاں کارناموں سے بھرے پڑے ہوں، اس لئے کہ یہ اسلام ہی کا فیض تھا جس نے عورت کو وہ مرتبہ عطا کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس جماعت کے ساتھ شریک ہو کر دین اسلام کی نشر و اشاعت اعلاء کلمۃ الحق میں جد و جہد صرف کرتے اور میدان جہاد میں وقت ضرورت مردوں کے دوش بدوش حصہ لینے کے قابل بن گئی،

(۲) عرب میں عورتوں اور بچوں کو وارث نہیں بنایا جاتا تھا صرف وہی لوگ ورثہ کے قابل سمجھے جاتے تھے، جو جنگ میں حصہ لے کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے، اسلام نے جس طرح مردوں کے ورثہ کے مسائل سمجھائے اسی طرح عورتوں کو بھی میراث کے حقوق عطا کئے، جو اس وقت کے عربوں کے لئے بہت ہی دشوار تھا، ابن عباس سے مروی ہے کہ جس وقت فرائض میراث کی آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بیٹی، بیوی، بیٹیوں اور والدین کے حصے بیان فرمائے تھے، لوگوں نے اس کو ناپسند سمجھا اور کہا بیوی کے لئے چوتھائی اور

آٹھواں حصہ اور بیٹی کے لئے نصف حصہ مقرر ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے کو بھی میراث کا حصہ دیا جائے گا، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرے اور جنگ میں حصہ لے اور نہ ان کے لئے مال غنیمت جائز ہو سکتا ہے!

اسی بناء پر اسلامی شریعت نے لڑکی کے لئے شادی سے قبل اس قدر حصہ مقرر کیا، جو اس کی زندگی کے لئے کافی ہو سکے تاکہ وہ اپنے بھائیوں یا رشتہ داروں پر بوجھ نہ بن جائے، یہ حصۂ میراث وہ ہے، جس میں کسی بحث و جدل کی گنجائش نہیں، چنانچہ قرآن حکیم نے فرمایا

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ (سورۂ نساء)	اللہ تعالیٰ تم کو تمھاری اولاد کے حق میں حکم کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے پھر اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لئے اس مال سے جو چھوڑ مرا، دو تہائی ہے اور اگر ایک ہی ہو تو اس کے لئے آدھا ہے۔

لڑکی کے لئے بہ نسبت لڑکے کے نصف حصہ مقرر کرنے میں یہ راز مضمر ہے کہ لڑکا تو شادی کرتا ہے اور اپنی میراث کے حصہ میں سے مہر ادا کرتا اور اپنی بیوی کا نان و نفقہ دیا کرتا ہے، اسکے علاوہ گھر کے ساز و سامان وغیرہ کی افزایش و آرائش جو ازدواجی زندگی کے لوازمات میں سے ہے، عورت پر ان میں سے کوئی چیز واجب نہیں بلکہ

مرد پر یہ سب ضروری اشیاء کی فراہمی واجب ہے، جیساکہ اپنی بیوی کا خرچ ضروری ہے۔

لڑکی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر سے مہر اور نان و نفقہ حاصل کرے اور اسی کو اپنی میراث کا حصہ سمجھے۔

یہاں سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ لڑکے کے مال و متاع میں مختلف طور پر نقص و کمی واقع ہو سکتی ہے اور لڑکی کا مال اس کے لئے محفوظ ہے، مرد اپنے گھر بار کی زندگی کو چلانے کا ذمہ دار ہے، کسب معاش کے لئے ہر قسم کی جدو جہد اور محنت و مشقت برداشت کرنا مرد کا کام ہے، اگر وہ اس طرح نہ کرے تو زندگی کی مشکلات میں ثابت قدم رہنے کی اس کے اندر طاقت نہ رہے، اس لحاظ سے لڑکے کو لڑکی پر میراث میں جو ترجیح و فضیلت شریعت نے دی ہے وہ معاشی و اقتصادی مصلحتوں کی بناء پر ہے اور ان ذمہ داریوں کی وجہ سے ہے، جو مرد پر عائد ہوتی ہیں، اس میں سراسر انصاف طبعی کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اب یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عورت کے بارے میں ظلم ہے یا اس کے کسی حق کو تلف کیا گیا ہے۔

(۴) لڑکا جب تک سن شعور کو نہ پہنچے اور کسب معاش کے قابل نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے اخراجات باپ پر لازمی ہیں، لڑکی کا نان نفقہ اس کے باپ پر اسی وقت تک رہتا ہے جب تک کہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ کر دی جائے اس کے بعد اس کی زندگی کے تمام اخراجات اس کے شوہر پر عائد ہو جاتے ہیں جب کبھی کسی مجبوری کی صورت میں اس پر طلاق واقع ہو جائے

اور وہ اپنے باپ کے گھر لوٹ آئے تو پھر اس پر اپنے باپ کی جانب سے نفقہ لازمی ہو جاتا ہے۔

باپ اسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ لڑکے کی طرح سے کمائے ہاں اگر وہ اتفاق سے اپنی ذات سے کوئی جائز پیشہ اختیار کرکے اور اس سے اس قدر روزی حاصل کرے، جو اس کی زندگی کی ضروریات کو کافی ہو سکتی ہے، تو اس کے باپ پر سے اس کے نفقہ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے، لیکن اگر اس کی کمائی اس کی حاجتوں کی تکمیل نہ کرے تو پھر وہی نفقہ واجب ہو جاتا ہے۔

(۴) شریعت کا قانون یہ ہے کہ جب لڑکی سن شعور تک پہنچ جائے تو نکاح کی صحت کے لئے اس کی رضامندی شرط ہے، کسی انسان کے لئے ہرگز یہ جائز نہیں کہ شادی بغیر اپنی مرضی کے یا عورت کی رضامندی کے کر سکے، افسوس تو یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان لڑکیاں اپنی حق رضامندی سے محروم ہو گئیں اور سولھویں صدی کے اواخر میں، مغربی لڑکیوں کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ نکاح اپنی مرضی کے مطابق کریں۔

(۲) عورت بلحاظ بیوی کے

(۱) جاہلیت میں لوگ بری طرح ناپسندیدہ طور پر عورتوں کو وارث بناتے تھے، مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ چاہے تو بلا مہر کے عورت سے نکاح کرے یا شادی کرکے مہر پورا کردے یا عورت پر شادی کو حرام کردے تاکہ اس کے مرنے کے بعد خود اس کا وارث

ہو جائے شریعت اسلامیہ نے اس ظالمانہ طریقہ کو باطل قرار دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا (سورۂ نساء)	ایمان والو! تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی میراث میں لے لو۔

(۲) عرب عورتوں کو چھوڑ رکھنے میں مختلف طریقے اختیار کرتے تھے، ایک وارث مورث کی عورت کو اس وقت تک شادی کرنے سے باز رکھتا جب تک کہ اس سے وہ میراث حاصل نہ کرلیتا، جو عورت کو مل چکی ہے، مرد اپنی لڑکی کو اس وقت تک محروم رکھتا جب تک کہ لڑکی کے سارے مال کا وہ مالک نہ ہو جاتا، ایک مرد اپنی مطلقہ عورت کو یونہی چھوڑے رکھتا تاوقتیکہ اس سے اپنی مراد حاصل نہ کرلیتا، ایک شوہر جو اپنی بیوی سے نفرت کرتا اور اس کے فراق کو اچھا سمجھتا تھا، بیوی کو معلق چھوڑے رہتا تھا، اس سے بُرا سلوک کرتا رہتا تھا، تاوقتیکہ وہ عورت مجبور ہو کر اپنا مہر نہ چھوڑ دے، اسلام نے ان تمام باطل طریقوں اور ظالمانہ سلوک سے باز رکھا۔

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ (سورۂ نساء)	اور تم ان کو اس واسطے روکے نہ رکھو کہ ان سے کچھ اپنا دیا ہوا لے لو۔

(۳) عورتوں کے ساتھ معاشرتی امور میں نہایت بُرے طور پر پیش آتے تھے، بودوباش، اختلاط اور نان نفقہ میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان عدل قائم

رکھنے کا حکم فرمایا۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ عورتوں کے ساتھ خوبی سے رہو۔

(نساء)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (نساء) اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔

(۴) جاہلیت میں یہ رسم جاری تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا جس پر وہ فدا تھا، تو اپنی بیوی پر فحش کاری کا الزام لگا دیتا تاکہ وہ اپنا مال متاع اس کو دے ڈالے، صرف یہی نہیں بلکہ وہ شخص اس کی آبرو ریزی کرنے کے ساتھ اس سے برے طور پر پیش آتا اور اس کا مال و اسباب لوٹ کر اپنی محبوبہ پر خرچ کرتا، اسلام نے اس قسم کی شرمناک حرکتوں اور بدتمیزیوں سے منع کیا!

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اگر تم ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو بدلنا چاہو اور ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی مت پھیرلو۔

(سورہ نساء)

پھر اس انسانیت سوز حرکت پر تہدید کی۔

اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ کیا تم اس کو ناحق اور صریح گناہ سے لینا چاہتے ہو؟

(۵) عورتوں کو مال و اسباب میں شمار کیا جاتا تھا، ان میں حسب دل خواہ تصرف برتا جاتا اور ان کے ساتھ نہایت بے دردی سے کام لیا جاتا تھا، شوہر اپنی بیوی کو کسی معاوضہ یا بلا معاوضہ دوسرے کے حوالے کر دیتا تھا، خواہ اس میں عورت کی رضامندی ہو یا نہ ہو۔

اسلام نے عورت کو ان تمام مصیبتوں سے نجات دلائی، اس کو دنیا کی نظروں میں عزت و احترام سے دیکھے جانے کے قابل بنا دیا، اس کو اس کے لائق حقوق دیے کہ عام رعایا میں اس کو شمار کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

كلكم راع ومسئول عن رَعيته، اَلاِمَامُ راعٍ ومسئول عن رعيته، والمرأة راعية في بيت زوجها ومسئولة عن رعيتها، وَالرجل راعٍ فِي اهله ومسئول عن رعيته، وَالْخادم راع في مال سيده و مسئول عن رعيته، كلكم راعٍ ومسئول عن رعيته

تم سب محافظ ہو اور اپنی رعایا کے جواب دہ، امام حاکم ہے اور اپنی رعایا کا جواب دہ، عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران کار ہے اور اپنی رعایا کی جواب دہ، مرد اپنے خاندان کا محافظ ہے اور اپنی رعایا کا جواب دہ، نوکر اپنے آقا کے مال کا رکھوالی ہے اور اپنی رعایا کا جواب دہ اور تم سب محافظ ہو اور اپنی رعایا کے جواب دہ۔

معترضین اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی نکال کر اس حدیث میں فکر و نظر سے کام لیں کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

عورت کو اس کی فضیلت اور برتری کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی گھریلو زندگی میں مرتبۂ حکومت عطا کیا ہے تو پھر انہیں یہ کہنے میں تامل ہوگا کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

شریعت اسلامیہ کی حسن و خوبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے رحم و انصاف کے نقطۂ نگاہ سے مرد و عورت کی طبعی قوتوں اور خصوصیتوں میں دیکھا کہ عورت میں نزاکت و لطافت کا پہلو حد درجہ نمایاں ہے اور مرد قوت و طاقت اور محنت و مشقت میں اپنے فطری قویٰ کے اعتبار سے ممتاز ہے، تو اس پر یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ اہم ذمہ داریاں اور بڑے بڑے حقوق کی نگہداشت مثلاً عورت کی ضروریات زندگی کی فراہمی، کسب معاش اور گھر کے اخراجات وغیرہ ان تمام فرائض کی تکمیل میں سرگرم رہا کرے، بخلاف اس کے عورت پر اس قدر ذمہ داریاں عائد نہیں کی گئیں، اس کے ذمہ جو کچھ حقوق و فرائض مثلاً بچوں کی پرورش گھریلو نظام کی دیکھ بھال وغیرہ سپرد کئے گئے ہیں، بہ نسبت مردانہ ذمہ داریوں کے سہل اور آسان ہیں، نیز مرد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ عورت کی حفاظت کرے، آفتوں اور مصیبتوں سے بچائے مرد پر مہر کو لازمی قرار دیا، جس کو وہ شب زفاف سے پہلے ادا کر دے، ہاں اگر میاں بیوی اس کی تاخیر پر متفق ہو جائیں تو جائز ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ایما رجل تزوج امراۃ علی ما قل من المھر او کثر	جس شخص نے کسی عورت سے کم و بیش مہر پر شادی کی اور اس کے دل میں

لیس فی نفسہ ان یودی الیھا حقھا لقی اللہ یوم القیامۃ وھو زان۔

اس کا حق ادا کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس کو دھوکا دیا اس کے بعد وہ مر گیا اور اس کا حق ادا نہ کیا تو قیامت کے دن زانی کی حالت میں اللہ سے ملے گا۔

اسلامی عطوفت و رافت کی یہ کس قدر بہترین مثال ہے کہ مردوں کے حقوق و فرائض کے مقابلہ میں عورت کی ذمہ داریاں بہت تھوڑی اور نہایت آسان ہیں، اس کے متعلق یہ احکام جاری کئے گئے ہیں کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں اس کی رضامندی کے خلاف کسی شخص کو آنے کی اجازت نہ دے اور سوائے شرعی ضرورت کے گھر سے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نہ نکلے، عورت کے جس قدر حقوق شوہر سے متعلق ہیں، ان میں کسی دشواری یا مشقت کو دخل نہیں ہے، بلکہ خود عورت کے جذبہ شرف کی حفاظت اور اس کی شان و وقار کو زیادہ کرنے کا باعث ہے۔

میاں بیوی کے اگر کوئی اولاد پیدا ہو تو ان کی کفالت اور اخراجات باپ پر واجب ہوتے ہیں، ماں اگرچہ دولت و ثروت میں بڑھ چڑھ کر ہی کیوں نہ ہو، اس پر کفالت اولاد کا فرض عاید نہیں ہوتا۔

شریعت نے مسلمان بیوی کی شخصیت پر خاص توجہ مبذول کی ہے جن حقوق سے ایک آزاد اور مستقل ارادہ شخص بہرہ مند ہوتا ہے عورت بھی ان سے برابر فائدہ حاصل کر سکتی ہے، یہ اپنی دولت و ثروت کی خود مختار و مالکہ ہے، قانون کی حدود میں رہ کر وہ اپنی مرضی کے مطابق

اس میں تصرف کر سکتی ہے، اگر وہ تجارت پیشہ ہے تو اس سے جو کچھ نفع ملے گا وہ اسی کا حق ہوگا، اس کے اندر اس کے شوہر کا کچھ دخل ہوگا اور نہ کچھ حصہ اُسے مل سکے گا، جس وقت شوہر فوت ہو جائے اس کی میراث میں سے عورت برابر حصہ لے گی۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ۔ (نساء)	تمہارے چھوڑے ہوئے مال میں سے ان (بیویوں) کے لئے چوتھائی حصہ ہے اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔

اسی طرح اسلام نے عورت کے لئے رضاعت اور اولاد کی پرورش کی جو مدت مقرر کی ہے، یہ اس مدت تک ادا کرنے میں مطلق اختیار رکھتی ہے اس کے لئے اسے کسی قضائی (عدالتی) رائے کی اطلاع کی ضرورت نہیں، اس کے لئے حق نفقہ لازمی قرار دیا ہے، نیز جس وقت شوہر کسی خبیث مرض میں مبتلا ہے تو عورت اس سے طلاق مانگ سکتی ہے اگر نکاح کے وقت مہر ادا نہیں کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں اس کے لئے مہر مثل دینا پڑے گا۔

(۳) عورت باعتبار ماں کے

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

الجنۃ تحت اقدام الامھات	جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک جوان شخص علقمہ نامی بہت سخت بیمار ہوگیا، اس کا مرض روز افزوں بڑھتا گیا، تیمار داروں نے اس کو لا الہ الا اللہ

کہنے کی تلقین کی، مگر وہ اپنی زبان پر قادر نہ ہوا۔ آنحضرت صلعم کو اس کی خبر دی گئی آپ نے دریافت فرمایا کیا اس کے ماں باپ ہیں؟ جواب دیا گیا کہ اس کا باپ مرچکا ہے ماں زندہ ہے اور بہت بوڑھی ہو چکی ہے، آپ نے اس کے پاس قاصد کو روانہ فرمایا، جب وہ آپ کے دربار میں حاضر ہوئی تو آپ نے اس کے بیٹے کا حال دریافت فرمایا، بڑھیا نے کہا وہ ایسی ایسی نمازیں پڑھا کرتا تھا اور ایسے ایسے روزے رکھتا تھا اور تمام روپے خیرات کر دیا کرتا تھا، جن کی تعداد اور وزن سے ہم ناواقف ہیں، آپ نے سن کر فرمایا تیرا اور اس کا کیا حال ہے؟ بڑھیا نے کہا میں اس پر بہت غضبناک اور کشیدہ خاطر ہوں فرمایا کس لئے؟ کہا وہ اپنی بیوی کو مجھ پر ترجیح دیا کرتا تھا اور اکثر چیزوں میں اسی کی اطاعت کرتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ماں کی ناراضگی اور غصہ نے اس کی زبان لا الہ الا اللہ کہنے سے روک دی ہے، پھر آپ نے بلال سے مخاطب ہو کر فرمایا جاؤ بہت ساری لکڑیاں جمع کرو تاکہ میں اس کو آگ میں جلا ڈالوں، بڑھیا نے کہا یا رسول اللہ میرے بیٹے اور میرے لخت جگر کو آپ میری ہی آنکھوں کے روبرو جلائیں گے میرا دل اس کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تو چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے تو اس سے راضی ہو جا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس وقت تک وہ اپنی نماز اپنے روزہ اور اپنے صدقے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، جب تک کہ تو اس سے ناراض اور کشیدہ خاطر ہے، بڑھیا نے اپنا ہاتھ اٹھا کے

کہا ہیں خدا کو، جو آسمان میں ہے اور آپ کو بھی اے اللہ کے رسول اور ان تمام کو بھی جو یہاں موجود ہیں، گواہ بناتی ہوں کہ میں اس سے رضا مند ہوگئی، اس کے بعد آنحضرت صلعم نے فرمایا! بلال! جا کر تو دیکھو کیا علقمہ اب لا الہ الا اللہ کہنے کی طاقت رکھتا ہے؟ شاید اس کی ماں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حیاء کرتے ہوئے اپنے ضمیر اور دل کے خلاف کہہ دیا ہو بلال تشریف لے گئے جب دروازہ کے قریب پہنچے تو علقمہ کو یہ کہتے ہوئے سنا لا الہ الا اللہ اور اسی دن علقمہ کی روح پرواز کر گئی۔

اس واقعہ سے واضح ہوا کہ افراد خاندان کے درمیان ماں کی کس قدر تعظیم و توقیر ہے اور اس کا درجہ کتنا بلند ہے؟

(۲) شریعت اسلامیہ نے یہ قانون مقرر کیا ہے اگر کسی ماں کا لڑکا فوت ہو جائے تو ماں کے لئے ایک معین میراث ہے تاکہ وہ اپنے بڑھاپے کے زمانے میں ہر قسم کی تکلیف و آفت سے محفوظ رہے جب کہ اس کی زندگی کا دارومدار اس کے لڑکے کی امداد ہی پر رہا ہو قرآن عزیز نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗ

اور میت کے ماں باپ کو اگر اس کے اولاد ہے تو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے اصل مال سے، جو چھوڑ مرا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے اولاد نہیں اور اس کے ماں باپ وارث ہیں تو اس کی ماں کو تہائی حصہ ہے پھر اگر میت کے

اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (سورۂ نساء)

کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ہے۔

(۴) عورت انسانی جماعت میں رکن ہونے کی حیثیت سے

اسلام نے عورت کو مرد کے ہم مرتبہ سمجھا، اس کو بھی وہی حقوق عطا فرمائے، جو مردوں کے لئے ہیں، دونوں پر فرائض واجبات اور احکام الٰہی کی پابندیاں عائد فرمائیں، دینی اعمال میں جو نتائج مترتب ہوتے ہیں، ان میں دونوں کا کوئی فرق نہیں رکھا،

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (سورۂ نساء)

جو شخص بھی نیک کام کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان رکھتا ہو، وہی جنت میں جائیں گے اور ان پر تل برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سورۂ نحل)

جو شخص بھی نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان رکھتا ہو تو ہم اس کو اچھی زندگی دیں گے اور ان کو ان کے بہترین کاموں کا بدلہ دیں گے

دوسری جگہ فرمایا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ

ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ (سورۂ آل عمران)

کہ میں تم میں سے کسی محنت کرنے والے کی محنت کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا، تم آپس میں ایک ہو۔

(۲) شریعت اسلامیہ نے مرد و عورت کو جماعتی حقوق میں برابر کا درجہ عطا فرمایا ہے، اقتصادی معاملات، تعزیرات و عقوبات طلب علم و فضل، غرضکہ ہر اس چیز میں جس سے نفسی، ذہنی، عقلی، بدنی اور دینی صلاح و فلاح وابستہ ہے، دونوں کے درمیان نظام مساوات کو برقرار رکھا ہے، عورت کے لئے یہ جائز قرار دیا ہے کہ اگر اس کی زندگی کا کوئی سہارا نہ ہو تو اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے وقار و شرف کی حفاظت کے لئے حلال روزی پیدا کر سکتی ہے اور اس کے لئے جتنے جائز طریقے اور ذرائع ممکن ہوں اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ تمام ذمہ داریاں اس وقت اُٹھ جاتی ہیں جب کہ اس کا کوئی سہارا اور اس کی زندگی کا کوئی مددگار و کفیل موجود ہو، کیونکہ اس کی موجودگی میں عورت کا کسب معاش میں مصروف ہونا نظام خانہ داری اور دیگر معاشرتی اہم امور میں خلل اندازی کا باعث ہے، ہاں اگر کوئی حرج واقعہ ہونے کا خطرہ نہ ہو اور عورت کی خواہش ہو کہ وہ بھی جائز طور پر کمائے تو اس کے لئے روا ہے۔

غرضکہ اسلام نے عورت کے لئے بھی وہ تمام جماعتی حقوق دئے ہیں، جو دیگر افراد کے لئے ہیں، جس طرح عورت کے بھائی شوہر اور باپ ملکیت میں تصرف کا حق رکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی اپنی ملکیت اور

مرضیّہ میں مختار ہے، اس کو اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرنے میں مطلق آزادی دی گئی ہے، عورت آقا اور سیدہ بن سکتی ہے کسی چیز کی مالک بن سکتی ہے اور غلام خرید کر آزاد کر سکتی ہے، اس کو جس شخص کے ساتھ چاہے عہد و پیمان اور معاملہ کرنے کا حق حاصل ہے، وہ زندگی کی پیچیدہ راہوں کو ہموار کرنے اور مناقشات و نزاعات کو رفع کرنے کے لئے اوروں کی طرف سے وکیل بن سکتی ہے ان تمام امور میں اس کے شوہر یا باپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کچھ رخنہ اندازی کریں یا عورت کو ان میں حصہ لینے سے باز رکھیں۔

(۵) مرد اور عورت کے درمیان موازنہ۔

(الف) مرد کی خصوصیات

(۱) ——— مبداء فیاض کی جانب سے مرد کے اندر چند ایسی استعدادیں اور قوتیں ودیعت کر دی گئی ہیں، جن سے وہ اپنی زندگی میں ہر قسم کے نمایاں کام سر انجام دے سکتا ہے اسی بناء پر اسلام نے امامت عظمیٰ کا بار صرف مرد کے کندھوں پر ڈالا ہے اور اس کو اسی کا حق قرار دیا ہے، کیونکہ مرد اپنی فطری قابلیتوں کی وجہ سے رعایا کی مختلف حالتوں پر فکر و نظر سے کام لیتا، اور سلطنت کے پیچیدہ اور مشکل امور کو سلجھا سکتا ہے، جنگی اور سیاسی انتظامات کو خوش اسلوبی سے انجام دیتا اور میدان جنگ میں وقت پڑنے پر دشمنوں سے مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے۔

اگر یہ شبہ پیش کیا جائے کہ مردوں ہی پر کیا موقوف ہے،

بعض عورتوں میں بھی امور سلطنت کو انجام دینے اور زندگی کے کٹھن مراحل طے کرنے کی صلاحیت موجود رہتی ہے کہ بعض تو ان میں سے وہ ہیں، جو بعض مردوں سے رائے و تدبیر، عقل و دانائی اور حسن فکر و نظر میں سبقت لے جا چکی ہیں ——— اس کا ایک جواب تو وہی ہے، جو ابھی اوپر تمہیداً پیش کر دیا گیا ہے، مختصر طور پر یہ ہے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا وہ بعض عورتوں کے متعلق تھا اور یقیناً ایسی عورتیں انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں، شرعی قانون میں اکثر و بیشتر احکام و قوانین کے لئے اکثریت اور سواد اعظم کا اعتبار کیا جاتا ہے

(۲) شریعت نے طلاق دینے کا حق مرد کے ذمہ کیا ہے نہ کہ عورت کے، اس لئے کہ مرد ہی پر مہر ادا کرنا اور معاشرتی سازو سامان اور نفقات کا فراہم کرنا لازمی ہے، یہ انصاف سے بعید تھا کہ ان حالات کے پیش نظر طلاق کی زمام اس کے ہاتھوں میں نہ دی جاتی ——— اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عورت طبعی طور پر نازک اور لطیف صنف کہلاتی ہے اس کی طبیعت بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے اس کے اندر انقیاد و اطاعت کا مادہ رکھا ہوا ہے۔ جس سے وہ بہت جلد کسی کے تابع و مطیع ہو جاتی ہے، اگر اس کے اختیار میں طلاق کی زمام دے دی جاتی، تو یہ امر خلاف فطرت و منافی حکمت ہوتا، کیونکہ وہ اس صورت میں جب کبھی ادنیٰ سبب یا معمولی واقعہ سے متاثر ہو گی تو اس عقدۂ زوجیت کو توڑ دے گی جب کبھی اس کو ادنیٰ تحریک پہنچے وہ اپنے جذبات سے بے قابو ہو جاتی ہے اور وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے جس کا

تصور بھی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس پر یورپ کے بے شمار واقعات وحادثات دلالت کرتے ہیں کہ مردوں کے مقابل عورتوں کو ہر چیز میں مکمل آزادی دینے کی وجہ سے سوسائٹی میں کس قدر فتنہ و فساد واقع ہو گیا اور زندگی کا نظام کس حد تک بگڑ گیا ہے یہ تمام فیوض و برکات نئی تہذیب کے لائے ہوئے ہیں جس میں عورتوں کو مردوں سے بھی کئی گنا بڑھا چڑھا کر انھیں کے ہاتھوں میں عقدۂ زوجیت کو بھی دے دیا گیا ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کو توڑ جوڑ سکتی ہیں ہم اس پر طلاق کے باب میں تھوڑی بہت روشنی ڈالیں گے۔

(۳) شہادت کے معاملہ میں رعیت نے دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام کیا ہے چنانچہ اس کی توجیہ خود قرآن عزیز نے اس طرح کی ہے۔

اَن تَضِلَّ اِحۡدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰهُمَا الۡاُخۡرٰى (سورہ بقرہ)	"تاکہ اگر ان دونوں میں ایک بھول جائے تو اس کو وہ دوسری یاد دلائے۔

عورت کی اس خصوصیت اور وصف پر قرآن حکیم نے جو روشنی ڈالی ہے وہ موجودہ علم اور تجربہ کے عین مطابق ہے۔ قرآن کے معجزہ ہونے پر یہ زبردست ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے مقامات پر جہاں تک مردوں کی نگاہ نہیں پہنچتی مثلاً ولادت، پردۂ بکارت کی پہچان اور ان تمام چیزوں میں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اسلام نے ایک ہی عورت کی شہادت پر اکتفا کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے شہادت کو اجتماعی زندگی میں جو اہمیت دی ہے وہ اس کے کمال فکر و نظر کی دلیل ہے یہی وہ شہادت ہے جس پر اکثر اجتماعی امور کی بنیاد قائم ہے۔ اگر اس کا تعلق ظاہری اثرات مثلاً حقوق اور سرمایہ داری سے ہو تو یہاں پر دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے مقابل لی جائے گی کیونکہ عورت کی قوت ذاکرہ طبعی طور پر کمزور واقع ہوتی ہے اکثر اوقات اس سے بھول چوک ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اس کمزوری اور نقص کی تلافی کر دی ہے — عورت کی طبعی کمزوری پر حکم لگانے میں صرف شریعت محمدیہ ہی نہیں بلکہ دیگر اقوام کے وضعی قوانین بھی اس کی تائید کرتے ہیں

چنانچہ رومانی قانون اس طرح ہے کہ عورت اپنی زندگی بھر کسی قسم کا تصرف کرنے کی اہل نہیں جیسا کہ ایک بچے میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی۔ عورت کے لئے یہ ضروری ہے کہ خاندان کے مربی اور سرپرست پر اپنے کاروبار سونپ دے۔

فرانسیسی قانون عورت کے حقوق کی اس طرح توضیح کرتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر معاملہ یا عہد و پیمان کرنے کی کسی طرح اہلیت نہیں رکھتی۔

اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عورت وضعی قوانین میں اپنی ذات کے لئے تصرف کا حق نہیں رکھتی جو اس طرح سے اپنے نفس کے لئے تصرف کرنے کا مالک نہ ہو وہ دوسروں کی ملکیت میں بھی کس طرح تصرف کر سکتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شہادت

وجہ ہے جس پر حکومت، معاملات اور تمام نزاعات و مناقشات کی بنا قائم ہے۔ تدالتی نقطۂ نگاہ سے یہ کسی طرح درست نہیں کہ عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے مساوی حیثیت رکھے۔

عورت کے حق میں علامہ پلینول کا یہ قول قابل غور ہے کہ

"جس عورت کا شوہر انتقال کر جائے تو اس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کرنے کا حق قریبی رشتہ داروں کی زیر نگرانی عورت پر فرض ہے بخلاف باپ کے کہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک اجنبی شخص کو اپنی اولاد پر وصی ٹھہرائے۔ ماں اس حق سے محروم ہے۔ ایک وہ عورت جو تجارت پیشہ نہیں ہے اگر تجارتی سند یا شہادت پیش کرے تو یہ مجہول و عدہ کے مساوی شمار ہوگی اس کے برعکس اگر کسی مرد سے یہ چیز صادر ہو تو ان پر یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے۔

(ب) عورت کی خصوصیات۔

(۱) اسلام نے مرد پر جہاد فرض کیا ہے عورت اس فرض سے مستثنیٰ قرار دی گئی ہے مگر جس وقت دشمن مسلمانوں کے شہروں میں چاروں طرف سے سیلاب کی طرح امنڈ آئے تو اس صورت میں مرد و عورت دونوں پر اس کی مدافعت ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ جان و مال اور ملک کی حفاظت اور مدافعت شوہر کی اجازت کے بغیر عورت پر فرض ہو جاتی ہے۔

(۲) اگر مسلمان اپنے دشمنوں کے کسی شہر پر قابض ہو جائیں تو

وہاں کی عورتوں پر جزیہ نہیں ہے بلکہ کافر مردوں پر جزیہ فرض ہے۔

(۳) شریعت مرتد عورتوں کو قتل کر دینے کے بارے میں خاموش ہے اگر مرد مرتد ہو جائیں تو ان کو قتل کر دینا ضروری ہے

(۴) ایک بالغہ اور عقل مند عورت پر جب دیت واجب ہو جائے تو اس سے کسی قسم کی دیت نہیں لی جائے گی، ہاں اس صورت میں جب کہ عورت قتل میں جو موجب دیت ہے حصہ لے تو اس سے دیت لی جائے گی۔

(۵) جب وقت محلہ والوں پر قسم کھانا واجب ہو جائے تو عورت سے قسم نہیں لی جائے گی۔

(۶) عورت پر جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے یہ صرف مرد پر واجب ہے۔

(۷) عورت جب بیوی بن چکی ہے تو اس کے اخراجات ازدواجی زندگی کے جملہ سازوسامان اور عورت کی ضروریات کی تکمیل صرف شوہر کے ذمہ ہے عورت اگرچہ حیثیت والی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ ماں بن چکی ہے اور اس کی اولاد بے روزگار اور مفلس ہے تو باپ پر سارے اخراجات عائد ہوتے ہیں ماں اس کی اجرت رضاعت اور اولاد کی پرورش سے ادا کر دیتی ہے عورت اگر لڑکی ہے تو اس کا خرچ باپ پر ضروری ہے باپ کے علاوہ اس کی پرورش میں اس کے رشتہ داروں کو بھی حصہ لینا چاہیئے تاوقتیکہ وہ سن بلوغ تک پہنچ کر ازدواجی زندگی کے رشتہ میں منسلک نہ ہو جائے۔ اس اثناء میں کسی کو یہ حق نہیں

پہنچتا کہ وہ لڑکی کو طلب روزگار کے لئے مجبور کرے۔

ان تمام بیانات سے واضح ہو چکا کہ شریعت اسلامیہ نے عورت کی نشو و نما اور اس کی تدریجی زندگی کے منازل کو ملحوظ رکھتے ہوئے باعتبار اس کے لڑکی ہونے کے زمانہ سے بیوی اور ماں بننے تک کے زمانے تک وہ حقوق مقرر کئے جو اس کے ہر دور میں کفیل بن سکتے ہیں اور وہ احکام پیش کئے جو عدل و انصاف، عطوفت اور رحم دلی پر شامل ہیں۔

(۶) اسلام میں عورتوں کے حقوق۔

عورتوں کے حقوق کی مزید تحقیق و توضیح کے لئے ہم یہاں پر مصر کے مشہور عالم اور اسلامی مفکر علامہ فرید وجدی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس کو انھوں نے حقوق نسواں کے نام سے اپنی کتاب "الاسلام دین عام خالد" میں لکھا ہے

اسلام نے عالم نسوانیت کے اندر جو حیرت انگیز انقلاب رونما کیا وہ مذہبی انقلابات کی تاریخ میں کہیں نہیں پایا گیا۔

ساتویں صدی بعد المسیح میں جبکہ حضور انور صلعم کی بعثت عمل میں آئی عورت ہر جگہ مظالم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ یورپ اس زمانے میں جہالت و تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔ یہاں عورت ایک قالب بے روح ہستی شمار کی جاتی تھی۔

روم کے باشندوں نے ایک بہت بڑا جلسہ منایا اس میں انھوں نے عورت کے حقوق پر بحث و تنقید کی۔ آخر میں یہ طے

پایا کہ وہ ایک بے جان قالب ہے۔ اسی وجہ سے وہ اخروی زندگی میں کوئی حصہ نہ پائے گی۔ وہ ناپاک ہے اس کو گوشت کھانے ہنسنے اور بولنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ اس کو اپنے تمام اوقات زہد و عبادت اور خدمت گزاری میں صرف کرنا ضروری ہے۔

اس کی زبان بندی کے لئے اس کے منھ پر ایک بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا جس کا نام انھوں نے (Muselliere) موزلییر رکھا تھا۔ عورت خواہ وہ اعلیٰ خاندان کی ہو یا ادنیٰ قبیلہ کی راستوں میں چلتے پھرتے وقت اپنے گھر میں رہنے کی حالت میں غرض کہ ہر صورت میں اس کے منھ پر لوہے کا تالا پڑا رہتا تھا — ان جسمانی عقوبات کے علاوہ عورت کے باطن کو بے شمار زہریلے تیروں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ اس کو بلحاظ باطنی یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ بنی آدم کو بہکانے کا ایک دل کش آلہ ہے۔ دلوں میں بگاڑ اور فتنہ و شر و فساد پیدا کرنے کے لئے شیطان اس کی خدمت حاصل کرتا ہے (ایک فرانسیسی رسالہ جلد نمبر ۱۱)

بلاد عرب میں عورت چوپایوں کے درجہ کے مساوی تھی۔ شوہر کو جہیز میں چوپائے کے ساتھ ورثہ میں عورت دی جاتی اور یہ اسی کی ملکیت قرار پاتی۔ عصمت ریزی اور فسق و فجور پر عورت کو مجبور کیا جاتا تھا۔ مرد کے لئے عورتوں کی کوئی قید نہ تھی، وہ جتنی عورتیں چاہتا اپنے لئے منتخب کر لیتا۔

اس وقت آج کل کی طرح سے عورتوں کو کوئی حق نہ ملتا تھا یہاں تک کہ اس کے والدین کی میراث سے بھی اس کو محروم کر دیا جاتا تھا۔

بہ شوہر کے حصہ میں محض چوپایہ سمجھ کر بھیج دی جاتی تھی۔

ایک قالب بے روح چوپایہ کس طرح میراث کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عربوں نے تغزل اور تشبیب کے بارے میں جتنے اشعار کہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ گوارا تھا کہ وہ اپنی اونٹنی اور گھوڑے کی تعریف کریں لیکن انھیں کبھی یہ منظور نہیں تھا کہ عورت کو تغزل اور تشبیب کا موضوع ٹھہرائیں۔

اسلام کی ظہور قدسی کے وقت عورت ایسے ہی مصائب و آلام کا شکار تھی۔ مگر اسلام نے اس کو نتیجۂ استبداد سے نجات دلائی اس کی حالت میں وہ انقلاب پیدا کیا جس کی نظیر کسی قوم کے انقلابات پیش نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطنت رومانیہ کے آخری دور میں عورتوں کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا تھا ممکن ہے کہ بعض لوگ اس دور کو ان کے لئے سنہری دور سے تعبیر کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دور عورتوں کے لئے تمام ادوار میں خطرناک اور ان کی حکومت کے لئے غیر مفید ثابت ہوا۔ اس زمانے میں رومانیوں کے نفوس ان کی حکومت کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ وہ ہمیشہ جسمانی لذتوں میں سرشار رہتے اور نفسانی خواہشوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا اور کوئی خواب نہیں دیکھتے اس شہوانی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے عورتوں کو مطلق آزادی عطا کر دی اس غرض کے لئے نہیں کہ ان کی انسانیت کا تقاضا یہی تھا

اور اس کے ذریعہ سے وہ اپنے محکم اصول پر قائم رہ کر انسانی کمالات حاصل کریں اور ترقی یافتہ صورتوں میں اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیں بلکہ انھوں نے ان کو اس لیے آزادی کامل دی کہ وہ ان کی شہوتوں کا آلہ اور اپنی نفسانی سیاہ کاریوں کا ذریعہ بن جائیں۔

انیسویں صدی کا دائرۃ المعارف کہتا ہے کہ

"جمہوریۂ رومانیہ کے ابتدائی ایام میں عورت اپنے گھر کی چار دیواری میں محصور تھی جس میں رہ کر کپڑے وغیرہ بنا کرتی تھی لیکن نفس پرستی کا سیلاب رفتہ رفتہ رومانیہ میں بڑھتا گیا یہاں تک کہ "کاتون" نے اس ہولناک حادثہ کی خبر دی جو تمام پر بدلیاں بن کر چھا جانے والا تھا تھوڑی مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ رومانیہ میں عیش پرستی نفس پروری اور فسق و فجور کی انتہا نہ رہی"

آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ

"کاتون" اپنے قانون کی مدافعت میں جو عورت کی عصمت ریزی کی ممانعت میں تھا کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس کی خطرہ اندیش اور ہولناک پیش گوئی ثابت ہو کر رہی چنانچہ سلطنت رومانیہ کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عورت کی حالت میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہو گیا اور وہ غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دی گئی جس میں وہ تقریباً ہزار سال تک رہی یہاں تک کہ علوم و فنون کا بازار گرم ہوا جس سے آہستہ آہستہ عورت نے پنجۂ استبداد سے رہائی حاصل کی رفتہ رفتہ اس کو اس درجہ پر پہنچا دیا گیا جس کو آج زمانہ دیکھ رہا ہے

اس سے بھی عجیب و غریب وہ انقلاب ہے جس کو اسلام نے عورتوں کی حالت میں رونما کیا۔ اس لحاظ سے نہیں کہ وہ شہوت پرستی اور نفس پروری کا نشانہ بنائی جائیں بلکہ یہ انقلاب اس حیثیت سے تھا کہ ان کے طبعی حقوق کو زندہ کیا جائے اور سوسائٹی میں ان کا خاص درجہ مقرر کیا جائے جس سے ان کی خصوصیات نمایاں ہوجائیں اور ان کے فطری جوہر چمک اٹھیں تاکہ سوسائٹی کے عناصر تکمیل پذیر ہوں اور اجتماعی ترقیوں تک رسائی حاصل کریں۔

اس مقصد کے لئے چند اصول مقرر کئے جن کو بنیادی عقائد کا درجہ دیا گیا ہے ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ مرد اور عورت وہ دو تکمیل پذیر عناصر ہیں جو خاندان کی ترکیب و تشکیل کے لئے وجود میں لائے گئے ہیں تاکہ دونوں باہمی اتحاد و محبت کے نظام میں منسلک ہو کر خوش گوار زندگی گزاریں جس کی طرف یہ آیت ہدایت کرتی ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً۔ (سورۂ روم)

اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس چین پاسکو اور تمہارے درمیان محبت اور مہربانی رکھی

چونکہ جنس لطیف صنف قوی ہی کا ایک جزو ہے اس لئے اس کے لئے بھی وہی اصول مقرر کئے گئے جو مردوں کی جنس قوی کے لئے ہیں۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ جو شخص بھی نیک کام کرے خواہ وہ

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔	مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو اچھی زندگی دیں گے اور ان کو ان کے بہترین کاموں کا بدلہ دیں گے۔

(سورۂ نحل)

اس اصول کی رعایت شریعت اسلامیہ نے اور مقامات پر بھی کی ہے چنانچہ عورتوں کو میراث کا مستحق ٹھہرایا۔ ملکیت کا حق میراث کا حق اور ان میں تصرف کرنے کا حق غرض کہ مدنیت وتہذیب کے وہ تمام حقوق دلائے جو مردوں کے لئے ہیں۔ تجارت، صنعت وحرفت وغیرہ جملہ قسم کے قابل برداشت پیشے ان کے لئے جائز قرار دئیے۔ زندگی کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں داخل ہونے سے اسلام نے منع کیا ہو۔ ہاں صرف ایک چیز کی ان کی ممانعت کی ہے اور وہ یہ کہ عورت مشغلۂ عام پر حسن وجمال کا مظاہرہ کرنے اور عصمت وعفت کے حدود سے باہر قدم دھرنے کی مجاز نہیں ـــــ کوئی عقلمند اور فہیم و باغیرت انسان یا ایسی قوم اس سے انکار نہیں کرسکتی کہ کسی زمانہ میں بھی عورت کے بارے میں انسانیت کا دائرہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی اسلام کے اس زریں اور پاکیزہ اصول کی مذمت کرنے کی جرأت کرے گا۔

اسلامی دیانت کا جب یہ عالم ہے کہ اس نے عورت کو انسان شمار کرتے ہوئے مردوں کے مقام پر مساوی طور پر کھڑا کر دیا ہے تو انصاف کے دامن کو تھام کر غور کرسکتے ہیں کہ اس نے عورت کو

ذہنی و عقلی قوتوں کی ترقی کے راستے کھول دئے یا ان کے سامنے کوئی دیوار کھڑی کر دی کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکیں جیسا کہ ایک صدی قبل ساری دنیا میں اگلی قوموں نے عورت کو آہنی دیوار میں مقید کر رکھا تھا اور اس کو سوسائٹی میں حصّہ لینے اور اعلیٰ تعلیم پانے سے ممنوع قرار دیا تھا۔

اسلامی تعلیمات کا تجزیہ و تحلیل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے عورت کے لئے تعلیم کو نہ صرف مباح و جائز قرار دیا بلکہ اس پر فرض کر دیا جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں۔

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ	علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کا فریضہ ہے۔

اس نص صریح سے یہ امر روشن ہے کہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے عام تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مردوں اور عورتوں کو مساوی تعلیم دینے کا اصول مقرر کیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر تعلیم صرف طبقۂ اغنیاء اور استبداد پسند قبائل میں محصور تھی۔ مگر اسلام نے تعلیم کی کوئی حد مقرر نہیں کی اور نہ اسے کسی خاص جماعت یا طبقہ کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ عورت اس باب میں مختار ہے کہ وہ انتہائی تعلیم کی حد تک رسائی حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ حدود شریعت سے باہر نہ ہو جائے۔ اسلامی خواتین کے تذکروں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے بعض عورتیں اعلیٰ ذہنی قابلیت اور علمی لیاقت سے اونچے مدارج پر پہنچ گئیں۔

کیا یہ مقام حیرت نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کے لئے

یہ جائز قرار دیا ہے کہ جب وہ علم کی ایک بڑی منزل طے کر لیتی ہے تو وہ فتویٰ اور قضا او عدالت کے امور انجام دے سکتی ہے اور خاندانی تعلیم و تربیت کی سرپرستی کر سکتی ہے۔

اس سے بڑھ کر حیرت اور تعجب کا مقام کیا ہوگا کہ اسلام نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ مسلمان عورتیں مسجدوں میں نماز ادا کیا کریں جہاں عامۃ مسلمین مساجد میں اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل اور سیاسی و اقتصادی مسائل پر تبادل خیال کرنے کے لئے اپنے سرداروں کی دعوت پر جمع ہوتے تھے تاکہ اجتماعی حوادث کی مدافعت کریں جو ان پر طاری ہوا کرتے تھے اس غرض کے لئے ان مجلسوں میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں ایک مرتبہ تو یہ حادثہ پیش آیا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ نے عورتوں کے مہر کی تجدید میں لوگوں سے مشورہ لینا چاہا جب منبر پر کھڑے ہوئے لوگوں کے روبرو اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے تو اتنے میں ایک عورت درمیان میں آئی اور اس بارے میں آپ سے بحث کی چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور عورت کی رائے پر اتفاق کیا۔

اسلام کے اس پیش ارتقائی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ خیال پیش کر سکتے ہیں کہ جب کوئی اجتماعی انقلاب کی ضرورت آپڑے خواہ وہ کسی زمانے میں کیوں نہ ہو اور ہم کو اس کی طرف دعوت دے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی عورتوں کو تشریعی صورتوں میں انتخاب کے حقوق دیں ؟

اسلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جس ارتقائی و انتہائی شکل تک عورت کے طبعی حقوق کا احترام کیا اور جس مکمل پیرایہ میں عورت کی تصویر پیش کی آج تک اس قسم کا تخیل اور احترام کا یہ جذبہ کسی مہذب و متمدن قانون دان کے دل و دماغ میں نہیں گزرا۔

عورت اسلام کی نظر میں جب کہ وہ بیوی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے صرف اس امر کی مکلف قرار دی گئی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی آبرو کی حفاظت کرے اور یہ سمجھ کر اس کی شرعی اطاعت کرے کہ وہ خاندان کا طبعی سرپرست و نگران کار ہے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت کو نہ تو شوہر اور اپنی اولاد کی خدمت کا مکلف ٹھہرایا ہے نہ خود اپنے نفس کی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد کی اور ان کی پرورش کی بھی ذمہ دار نہیں ہے لیکن مرد پر یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی عورت کے لئے خدمت گار مہیا کرے اگر وہ غریب ہے تو یہ خود عورت کی ضرورتوں کی تکمیل کرے گا۔ اگر مرد و عورت کے کوئی اولاد پیدا ہو تو مرد کا فریضہ ہے کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو وہ کسی مرضعہ کا انتظام کرے اگر ماں خود دودھ پلائی اور پرورش کے لئے آمادہ ہو جائے تو رضاعت کی دگنی اجرت ہوگی ہاں اگر مرد غریب اور نادار ہے تو شریعت نے اس پر سے یہ قانون اٹھا لیا ہے۔

مسلمان عورت اپنی شادی کی وجہ سے اپنے مالی استقلال کا حق نہیں کھو سکتی اپنے املاک میں تصرف کرنے میں مطلق آزاد ہے اس پر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے اقتصادی معاملات میں شوہر

کی رائے کی پابند ہو۔ وہ اگر چاہے تو اپنی ملکیت کو فروخت کر سکتی ہے یا اس کو کسی اچھے مصرف میں لگا کر اس سے منافعہ حاصل کر سکتی یا اس کو رہن رکھ سکتی ہے ان تمام میں اسی کے شخصی ارادہ کو دخل ہوگا۔

یہ وہ حقوق ہیں جو آج تک اجنبی قوموں کی عورتوں کو حاصل نہ ہو سکے۔ کیوں کہ ان کی عورتوں پر شادی کے ساتھ ہی یہ پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں کہ وہ محض اپنے شوہر کے احکام کے تحت اقتصادی تصرفات کا حق رکھتی ہیں۔ اپنے املاک کو شوہر کی تصدیق یا اجازت کے بغیر نہ رہن رکھ سکتی ہیں نہ فروخت کر سکتی ہیں بلکہ کوئی چیز خرید بھی نہیں سکتیں اس لیے کہ قانون ہی اس قسم کا ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی کے املاک میں وہ حقوق حاصل ہیں جو بیوی کے والدین اور اس کے رشتہ داروں کو حاصل نہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ قانون عورتوں کی غلامی کے لیے تاریک زمانے کی ایک یادگار ہے۔

شریعت اسلامی نے مسلمان عورتوں کے حقوق کا جو تصور پیش کیا ہے آج تک کسی مفکر و فلسفی کے وہم و گمان میں بھی نہ گزرا ہوگا۔ اسلام نے یہ حقوق محض اپنی بزرگی اور بلندی جتلانے کے لیے نہیں بلکہ عورت کو غلامی کی مضبوط زنجیروں سے آزاد کرانے اور مظالم و آفات سے نجات دلانے کے لیے عطا کئے ہیں۔

اسلام نے عورت کو مرد کی رفیقۂ حیات شمار کیا ہے اور اس کو علمی حیثیت سے وہ حقوق دئے ہیں جو عالم اسلامی میں محقق ہیں اور

جن پر تمام علماء و فقہاء کا اجماع ہے۔

جب ایک فلسفی و مفکر یا ماہرِ علم الاجتماع کی نظر محض تشریعی و اجتماعی نقطہ سے اسلامی حقوقِ نسواں پر پڑتی ہے تو اس کی حیرت و تعجب کی انتہا نہیں رہتی کہ ان حقوق کا سرچشمہ عرب کے وہ ممالک ہیں جہاں عورت بے انتہا مصائب و آلام کا شکار تھی۔ اس کی وہ بری گت بنی تھی کہ دنیا کے کسی اور ملک میں اس کے مماثل نہ تھی۔ عورتوں کے بارے میں اسلام کے یہ وہ زریں آئین و اصول ہیں جن کے مشابہ اور ہم آہنگ حقوق وہ ترقی یافتہ قومیں بھی پیش نہ کر سکیں جو تشریعی ارتقا کے ادوار سے گزر چکی ہیں ——— !!!

(۷) تعددِ ازدواج۔

مخالفین اسلام نے تعدد ازدواج پر گوناگوں اعتراضات کیے ہیں۔ اور اس کو خلاف فطرت اور خلاف معاشرت ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم اور بے شمار مباحث پر حاوی اور مستقل تالیف کا محتاج تھا اس لیے میں نے اپنی کتاب "تعدد ازدواج" میں جو زیرِ تالیف ہے تاریخ و تحقیق اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اس کے مختلف پہلوؤں پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث و تنقید کی ہے اور مخالفین کے شکوک و شبہات کو پیش کر کے فرداً فرداً ان کا ازالہ کیا ہے یہاں مقاصد اسلام سے متعلق اس کے چند ابتدائی مباحث بالاجمال

پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ اس کی مشروعیت میں اسلام کا مقصد و منشا پورے طور پر واضح ہو جائے۔

تاریخی پس منظر۔

تہذیب و تمدن کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے انسان کی شادی کی نوعیت کیا تھی مرد و عورت کے تعلقات کس طرح قائم ہوتے تھے؟ اس کا جواب تاریخ کی ورق گردانی سے یہ ملے گا کہ ایسی کوئی جماعت اور قبیلہ نہ پایا جائے گا جس میں سے اکثر و بیشتر افراد نے ایک ہی عورت پر اکتفا کیا ہو۔ تاریخی واقعات و حالات سے یہ امر پائے ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ بعض وحشی قبائل میں یہ رسم جاری تھی کہ مردوں کے لئے عورتیں عام ہو گئیں تھیں۔ حق انتخاب بھی مردوں کو حاصل تھا۔ دونوں میں شادی بیاہ کے معاملات و تعلقات باہم رضامندی سے طے پاتے تھے ماں ہی گھر کی ملکہ کہلاتی باپ کا کوئی شمار و اختیار نہ تھا۔ جیسا جیسا انسان ارتقا کے منازل طے کرتا گیا لوگ اس باہمی اختلاط اور میل جول کے نقصانات سے بھی واقف ہوتے گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ میں اختصاص کی جو صورت درپیش ہوتی وہ یہ تھی کہ ایک قبیلہ کی عورتیں اس قبیلہ کے مردوں کے ساتھ خاص ہو جاتی تھیں دوسرے قبیلے کو ان میں مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ زمانہ ترقی کرتا ہوا یہاں تک پہنچا کہ ایک مرد کئی عورتوں کو بلا تعین عدد اپنے لئے خاص کرنے لگا پھر ایک ایسا دور آیا جس میں مرد و

عورت کی تاریخ میں ایک انقلاب رونما ہوگیا۔ اس دور جدید میں باپ گھر کا سرکار اور مالک و مختار شمار ہونے لگا۔ ماں کی ہستی صرف اس قدر تھی کہ وہ گھر میں اولاد کی پرورش کرنے اور گھریلو انتظام کرنے کے لئے مخصوص تھی۔

دنیا کے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کل دنیا کے ہر خطہ میں تعدد ازدواج کا رواج پایا جاتا ہے امریکہ آسٹریلیا، کلدانیہ، جزائر سوماترا، شمالی اور جنوبی امریکہ کے وحشی قبائل اس کے پابند نظر آتے ہیں۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو تعدد زوجات کو عین فطری اصول و قوانین کے مطابق تسلیم کرنے والے اشخاص بکثرت نظر آئیں گے اس کا ثبوت اس سے ہوسکتا ہے کہ بہت سی قومیں تعدد ازدواج کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہیں لیکن غربت اور تنگ دستی کی وجہ سے ان کے اندر اتنی طاقت اور حیثیت نہیں کہ اس کو عملی جامہ پہنا سکیں جیسا کہ افریقہ کے بعض قبائل کا حال ہے۔

یہی حالت ہندوستان اور دیگر قبائل کی بھی ہے کہ یہاں بظاہر تعدد زوجات پر بہت کم عمل درآمد کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں کیونکہ کچھ تو افلاس و غربت اور کچھ تو رسم و رواج کی پابندیاں اس میں سد راہ ہیں بخلاف اس کے آسٹریلیا اور دیگر جزائر میں یہ عارضی امور تعدد زوجات میں کسی طرح حائل نہیں ہوسکتے کیونکہ وہاں کی عورتیں خود اس لائق ہیں کہ مردوں کے دوش بدوش محنت مزدوری کرکے روزی پیدا کرلیتی ہیں ان میں

اتنی صلاحیت و طاقت ہے کہ وہ مختلف صنعتوں سے اپنی اولاد کی
پرورش کر سکتی ہیں۔

ہمارے اس بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر قبیلہ تعدد ازواج کا پابند ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان افراد کے ساتھ مخصوص ہے جو مالدار و ذی ثروت ہیں غریب و نادار طبقہ اس سے زیادہ متمتع نہیں ہے۔ ملک کے رؤساء امراء ہی ایک سے زیادہ عورتیں کرتے ہیں۔ یہی حال جاپان کا بھی ہے کہ تمام خاص و عام اعتقاداً اس کو مانتے ہیں مگر بادشاہوں اور امیروں کے علاوہ اس پر عمل کرنے کے لئے کسی کی ہمت نہیں بڑھتی۔

سوماترا میں تو یہ قانون مقرر ہے کہ مرد متعدد عورتیں کرنے میں مختار ہے لیکن یہ قانون صرف رؤسا و اغنیاء کے ساتھ مخصوص ہے ہر کس و ناکس کو اس پر عمل کرنے کا حق حاصل نہیں۔

تعدد زوجات کے اسباب

یہ عادت طبعی اسباب کی بنا پر وقوع پذیر ہوئی ہے کہ بعض قبائل میں بعض افراد جسمانی قوت میں امتیازی شان رکھتے ہیں وہ اپنے قبیلے میں زیادہ بہادر اور جنگجو خیال کئے جاتے ہیں۔ اسی امتیاز کی وجہ سے یہ ایک سے زیادہ عورتیں کرنے کی طرف قدرتی اور طبعی اسباب کی وجہ سے رغبت رکھتے ہیں خواہ یہ عورتیں اپنے قبیلے سے ہوں یا اجنبی خاندان سے تعلق رکھیں

ان لوگوں کے نزدیک کسی عورت کو زبردستی اپنا بنا لینا فخر و مباہات اور مجد و شرف کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ جس شخص کے پاس جس قدر زیادہ عورتیں ہوتیں وہ اتنا ہی بہادر، شجاع اور صاحب اقتدار تصور کیا جاتا۔ اکثر عالی ہمت بہادر ایک سے زیادہ عورتیں کرنے پر آمادہ رہتے تھے اس کا ثبوت یہ ہے کہ حبشی قبائل کے لوگ اس شخص کو قابل احترام اور لائق تعظیم متصور کرتے جو سب میں زیادہ بیویاں والا ہوتا۔

ایک سیاح عورت لکھتی ہے کہ "امریکہ میں میکسیک کے بادشاہوں کے خلفاء اور مقربین کا یہ اعتقاد تھا کہ عورتوں اور لونڈیوں ہی کی کثرت سے وہ بلند مراتب اور عالی مقامات حاصل کر سکتے ہیں" ——— برٹن بیان کرتا ہے کہ "افریقہ کے بعض قبائل میں زیادہ عورتیں رکھنے والا قابل فخر و مباہات گردانا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک ایک شخص ۱۲ سے ۳۰۰ سو عورتوں تک اپنے لئے اختیار کرتا ہے"۔

ان تمام بیانات و تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ اس طریقۂ طبعی کے رائج ہونے کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف پہلو اختیار کر چکا تھا۔ زیادہ تر اس کا سبب عورتوں کی تعداد پر فخر و ناز کرنا ہے کیونکہ ان کی تعداد سے مرد کی قوت اور پھر اس کے غنا و ثروت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہر قوم میں فخر و عزت کا سرمایہ شمار کئے جاتے ہیں۔

ایک لاطینی مورخ ٹاسٹ کہتا ہے کہ "قدیم جرمنی قبائل ہی تھے

جن کے پاس تعدد زوجات کا رواج نہ تھا" ــــــ فرانس کا مشہور سائنس دان مانٹسکو کہتا ہے کہ "میرو ونجیین کے بادشاہاں جنھوں نے پانچویں صدی سے لے کر ۷۵۲ء تک فرانس پر حکومت کی، ایک سے زیادہ بیویاں کرتے تھے اور اس کو اپنی شان و شوکت کا باعث خیال کرتے تھے۔"

اس کے علاوہ اور بھی اقتصادی اسباب ہیں جو تعدد ازواج کا باعث بنے من جملہ ان کے یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے یہ دشوار تھا کہ وہ گھر کے کام کاج کے ساتھ دوسرے امور بھی انجام دے ــــــ اوقیانوس میں کلدانیہ جدیدہ کے امیروں کی عادت تھی کہ وہ دس سے لے کر تیس عورتوں تک نکاح کرتے تھے تاکہ امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ کھیتوں اور باغوں کے کام بھی انجام دے سکیں ــــــ یہ ایسا اقتصادی سبب تھا جس نے افریقہ کے اکثر بیشتر لوگوں کو تعدد ازواج پر آمادہ کر دیا کیونکہ وہاں دور دور تک عورتوں ہی کے معاملات اور کاروبار پھیلے ہوئے تھے پانی سینچنا، کھیتوں کی دیکھ بھال، باغوں کی سرسبز و شادابی کا خیال رکھنا وغیرہ اس قسم کے بے شمار کام ان کے تفویض تھے۔

جنوبی افریقہ میں کفار کے جو قبائل بستے ہیں، یہ عموماً اپنی عورتوں کو چوپایہ کے مماثل سمجھتے ہیں اور ان سے سخت سے سخت محنت و مشقت کے کام لئے جاتے ہیں ایک انگریزی سیاح خاتون نے وہاں کے قبیلہ کے کسی فرد پر اعتراض کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تو اپنی عورت سے اتنی سخت محنت کا کام لیتا ہے اس نے جواب دیا اس سے

میں یہ کام کیوں کروں جبکہ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا ہے"

مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سوڈان میں عورتوں کا کوئی مرتبہ نہیں ان کو حیوانی خواہشات کے پورا کرنے کا آلہ سمجھا جاتا ہے اس کے ساتھ نہ اچھا سلوک کیا جاتا اور نہ محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔۔۔

ایک سیاح خاتون موشرو جس نے سوڈان میں کئی سال تک قیام کیا بیان کرتی ہے کہ حبشی قومیں اپنی عورتوں کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کرتی ہیں ان کے نزدیک عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے وہ اپنے چشم دید واقعات میں بیان کرتی ہے کہ "میں نے یہاں پر کسی ایک کو بھی اپنی عورت سے محبت کرتے ہوئے اور اس سے مہربانی و کرم سے پیش آتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ ان کی لغت میں محبت کا لفظ ہی نہیں جو عشقیہ جذبات و احسات کی تعبیر کر سکے"

فزیالوجی کا ایک مشہور انگریزی عالم لارڈ ایمری کہتا ہے کہ امریکہ میں ہانسٹ ایک شہر ہے جہاں کے قبائل کے مردوں اور عورتوں میں تھوڑا بھی میل ملاپ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق و محبت سے ایک دم نا آشنا ہیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے کافروں کا حال ہے۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ سوڈان میں مرد عورت سے شادی تو کر لیتا ہے لیکن شادی کے بعد عورت کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا۔

اس انفرادی تعداد سے تعدد زوجات پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ یہ واقعات لاعلمی اور جہالت کی بنا پر سرزد ہوئے

کرتے ہیں۔

تعدد ازواج کے شائع ہونے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ لوگ اس کو دینی مصلحتوں میں شمار کرتے تھے چنانچہ شیبوی کے قبائل کا یہ عقیدہ تھا کہ زیادہ بیویاں کرنے والا ان کے معبود روح اکبر کے نزدیک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے"

توریت میں تعدد ازواج کی طرف صراحتاً یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہر شخص کے لئے مباح ہے کہ وہ جنگی قیدیوں میں سے جتنی لونڈیاں چاہے رکھ سکتا ہے اور جب چاہے ان کو چھوڑ سکتا ہے۔

قدیم مصریوں کا یہ حال تھا کہ ان کے نزدیک تعدد ازواج کو اختیار کر لینے میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ یہ چیز نہ تو اخلاق انسانی کے مخالف تھی اور نہ فطری والہی اصول کے ساتھ تصادم پیدا کرتی تھی۔ اس کی شہادت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے قوانین اس سے خالی نظر آتے ہیں ان میں اس کی مخالفت میں کسی قانون کی تصریح نہیں پائی جاتی۔ تمام کا یہی عقیدہ تھا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ برکت و ثروت عطا کرتا ہے وہ کثیر تعداد میں بیویاں اور لونڈیاں رکھتے ہیں۔

ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ تعدد ازواج کا مسئلہ ان قبائل کے مردوں ہی کے پاس مسلم نہیں بلکہ ان کی عورتوں نے بھی اس میں خاص دلچسپی لی ہے۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ شمالی امریکہ میں قبائل کوش کی عورتیں تعدد زوجات کو ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی ہیں بلکہ اس کو اپنے حق میں ایک مفید اور بہترین

ذریعہ سمجھتی ہیں۔ اس کا بیشتر سبب یہ ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کے بارے میں لوگوں کے خیالات و نظریات بے حد خراب تھے عورت ان کے نزدیک چوپایہ سے بدتر سمجھی جاتی تھی اور اس کو بہت سے مشکل اور دشوار ترین کام سپرد کئے جاتے تھے اس لئے اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے وہ خود یہ چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ اور مددگار عورتیں بھی ہوں جو اس کے مشکل کاموں میں وقتاً فوقتاً امداد بہم پہنچاتی رہیں۔

اسلام اور تعدد ازدواج۔

اسلام سے پیشتر جاہلیت کی حالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ نکاح ہی خاندان اور گھرانے کی تکوین و بنیاد کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا مرد خاندان کا رئیس اور اصل سمجھا جاتا تھا لیکن ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی کوئی حد مقرر نہ تھی مختلف مردوں کا ایک عورت کو رکھنا نہایت برا سمجھا جاتا تھا اور اس کو زنا میں شمار کیا جاتا۔ زنا اکثر لونڈیوں کے ساتھ کیا جاتا اور آزاد عورتوں سے کم سرزد ہوتا۔ مردوں کے لئے زنا معیوب نہیں تھا البتہ عورتوں کے حق میں مذموم تھا۔ تعدد زوجات کا اس قدر رواج تھا کہ ایک مرد قبیلہ کی عورتوں کو بلا تعیین وحد اپنے لئے مخصوص کرلیتا تھا۔ ان سے اولاد بھی پیدا ہوتی تھی۔ یہ عادت نہ صرف عرب میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں عام رواج پا چکی تھی چونکہ عرب میں جنگ و جدال کا میدان ہمیشہ گرم رہا کرتا تھا اور

لاکھوں جانیں تلف ہو جاتی تھیں اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کی تعداد گھٹ گئی تھی اور عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا۔ عرب ہی پر کیا موقوف تقریباً تمام قوموں کی یہی حالت ہے جہاں خوں ریز جنگیں ہوا کرتی ہیں۔

اسلام کا ظہور بھی عرب کی اس سرزمین میں ہوا جو متعدد خون ریز جنگوں سے لالہ زار ہو چکی تھی۔ عرب ہی کی قوم میں ابتداً پھیلا پھولا جن کے نفوس پر تعدد زوجات، زناکاری اور مختلف فسق و فجور کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ اسلام نے جاہلیت کی بری رسموں کے دور کرنے کے لئے اپنا تدریجی اصلاحی نظام اختیار کیا اس نے اولاً زناکاری کو عورتوں، مردوں حتیٰ کہ لونڈیوں پر حرام اور ممنوع قرار دیا چونکہ عرب کے لوگ ان ممنوعہ افعال کے عادی ہو چکے تھے اور اسلام کے ان سخت احکام کی پابندی کو برداشت نہ کرنے کا امکان قوی تھا اس لئے تعدد زوجات کی اس نوعیت کو جو جاہلیت میں رواج پا چکی تھی ناجائز قرار دے کر اس کو اس قدر محدود کر دیا کہ جس میں محصور رہ کر ہر شخص اپنی صورت حال کے مطابق عمل درآمد کر سکتا ہے۔ اسلام تمام قوموں کے لئے تا ابد پیغام حیات بن کر آیا تھا اس نے اپنے عام فطری اصول کے مطابق قوموں کی خصوصیات، زمانے کی ضروریات اور مردوں کی فطری غیر معمولی قوی کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعدد زوجات کو ایک تنگ دائرہ میں برقرار رکھا۔

وجہ جواز

اس میں شک نہیں کہ اجتماعی نظام اور خاندانوں اور قبیلوں کی سعادت کا انحصار ایک بیوی اور شوہر پر ہے کہ دونوں اپنے فرائض و واجبات کو محبت و اخلاص کے ساتھ انجام دیں — پھر مخالفین کا یہ قول بھی درست ہے کہ ازدواجی تعلقات کو برقرار رکھنے اور زندگی کی ارتقائی حد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مرد کا ایک ہی عورت کو انتخاب کرنا شرط ہے — لیکن سوال یہ ہے کہ بعض اجتماعی صورتوں اور طبعی حاجتوں میں جن سے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کو سابقہ پڑتا ہے ایک انسان اپنی مصلحتوں پر نظر رکھتے ہوئے ایک سے زیادہ عورتوں کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ بعض اوقات ازدواجی نظام درہم برہم سا ہو جاتا ہے اور ربط و ضبط کے وہ امکانات جن سے میاں بیوی کی خوش گوار زندگی عبارت ہے آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتے ہیں، ایسی صورتوں میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ کیا کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کے فرد نے آج تک اس خصوصیت پر قناعت کی ہو کیا یورپ میں کوئی جگہ ایسی ہے جہاں زناکاری نہ پھیل گئی ہو؟ ہر انسان اپنے اقتضائے طبعی پر ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتا کیونکہ عورت پر مختلف حالات و تغیرات طاری ہوتے رہتے ہیں جن سے وہ ہر حالت میں مرد کی صحبت کے لائق نہیں رہتی خصوصاً اس وقت جب کہ

مرد کی جسمانی قوتیں اوروں کی بہ نسبت عروج پر ہوں؟ اس کے علاوہ
نسل کی برآمد کے لئے عورتوں میں ان کے ہر زمانہ میں استعداد باقی
نہیں رہتی۔ عورت مرد کی صحبت کے لائق اسی وقت ہوسکتی ہے
جب کہ وہ حمل حیض، نفاس اور حالت مرض سے پاک صاف
ہو۔ نیز اس کا کیا جواب دیا جاسکتا ہے ایک شخص شادی کرتا
ہے اتفاق سے عورت بانجھ نکلتی ہے۔ یا عورت بڑھاپہ میں
قدم رکھ چکی ہے اور مرد میں اتنی طاقت ہے کہ وہ دوسری
عورت سے نکاح کرکے اپنی اولاد اور سابقہ بیوی کی پرورش
کرسکتا ہے۔ یا یہ کہ وہ اتنا قوی و توانا ہے کہ اس کو ایک عورت
کافی نہیں ہوتی یا عورت مرد سے متنفر ہے ان تمام صورتوں میں
کیا زندگی کا توازن نہیں بگڑ جائے گا کیا تعدد ازواج کو بند کرکے
زنا کا دروازہ نہیں کھول دیا جائے گا۔ ان مشکلات کا واحد حل
صرف یہی ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی جائے۔
عورت اگر بانجھ نکلے اور مرد خصوصیت کے ساتھ بادشاہ یا
رئیس ہو تو وہ دوسرا نکاح کرسکتا ہے تاکہ اس کی اولاد اس کے
منصب اور جائداد کو سنبھالے اس طرح سے نسل کا سلسلہ بھی منقطع
نہ ہوگا۔ مرد اگر دوسروں کی بہ نسبت بلحاظ اپنی قوتوں کے بڑھ چڑھ کر
ہے اور صرف ایک عورت اس کے لئے کافی نہیں ہے تو وہ
دوسری بیوی کرلے یہ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ بغیر دوسری
شادی کے زناکاری اور فسق و فجور میں مبتلا ہوکر انسانیت سوز
حرکات کا مرتکب ہو جائے جیسا کہ آج کل یورپ کا حال ہے اور

نیز ان ممالک کا جہاں تعدد ازدواج کو شرعاً و قانوناً ممنوع قرار دیا گیا ہے جس سے زنا اور فحش کاری کا رواج عام ہوگیا اور سوسائٹی میں ایک خلل عظیم واقع ہوگیا ہے۔ اس کا سبب اور اسباب کے قطع نظر مردوں میں کمی اور عورتوں میں زیادتی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

ان تمام مفاسد اور برائیوں کا استیصال کرنے اور اجتماعی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اسلام نے تعدد زوجات کو مباح قرار دیا اور اس کے جواز کے لئے چند شروط عائد کردئے کہ جب تک اس اسباب نہ پائے جائیں ہرگز وہ جائز نہ ہوگا۔ جن میں سے چند اسباب یہ ہیں۔

(۱) وہ اہم تغیرات جو عورت پر طاری ہوتے ہیں جن سے مرد اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکتا۔ یا عورت کسی مہلک مرض میں گرفتار ہو اور اس سے نجات پانے کی سبیل نہ ہو۔

(۲) مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عورتیں بہ نسبت مردوں کے تعداد میں زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ اکثر یہ پیش ہوتی ہے کہ مختلف زمانے میں مختلف قوموں میں اکثر و بیشتر خوں ریز جنگیں پیش آیا کرتی ہیں، مردوں کی بے شمار جانیں تباہ ہوجاتی ہیں۔ اگر ہر مرد ایک ہی عورت پر اکتفا کرے تو عورتوں کی کافی تعداد باقی رہ جائے گی جن کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا لامحالہ وہ زناکاری اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوجائیں گی۔

(۳) ان حالات میں سے جو عورت کو لاحق ہوتے ہیں۔

بعض وہ ہیں جو اس کے نسلی پیداوار کے سلسلہ کو ایک دم بند کر دیتے ہیں نسل کی پیداوار کا مسئلہ مختلف حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے انفرادی صورتوں میں جہاں حکومتی، معاشرتی و اقتصادی مسئلہ در پیش ہو وہاں اس کی ضرورت کس قدر درپیش ہوتی ہے اس پر ہر زمانہ کے واقعات و حالات شاہد ہیں۔ اجتماعی پہلو سے دیکھا جائے تو اس کی شان ہی جداگانہ ہو جاتی ہے قوموں کی عظمت و وقار کا مسئلہ موجودہ دور بلکہ ہر زمانے میں بلحاظ سیاسی، معاشی، اجتماعی حقوق و ضروریات کے اقلیت و اکثریت پر منحصر ہوا کرتا ہے مسلمانوں کی قوم کو دنیا کی قوموں میں ممتاز قرار دینے اور اس کو سربلند کرنے اور اس کی عظمت و شان کو بڑھانے کے لئے اسلام نے ان حالتوں میں جن میں نسلی برآمد کا سلسلہ موقوف ہو جائے تعدد ازدواج کو جائز قرار دے کر ایک اجتماعی ضرورت کی تکمیل اور قومی مشکل مسئلہ کا حل پیش کیا ہے۔

تعدد ازدواج قوموں کی طبعی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کس قدر مفید اور اہم ہے اس کا اندازہ مشہور محققین و مبصرین کے ان اقوال سے ہو سکتا ہے شہرۂ آفاق متمدن عالم ہربرٹ اسپنسر اپنی کتاب علم الاجتماع میں لکھتا ہے " تعدد زوجات قوموں کے لئے بے حد مفید ہے" آگے چل کر کہتا ہے۔

"جب کسی قوم پر کوئی ایسی حالت طاری ہو مثلاً جنگوں اور خوں ریزیوں کی وجہ سے اس قوم کے اکثر مردوں کی جانیں تباہ ہو جائیں اور اُن عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے

جن کے شوہر مر چکے ہیں یا مردم شماری میں اناث کی زیادتی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نسل میں انحطاط واقع ہو جائے گا"

اک اور مشہور عالم لیشٹنن کہتا ہے کہ

" اہل کفر کے مردوں کی تعداد عورتوں سے بہت کم ہے اس لئے کہ مرد پہلی خوں ریز جنگوں میں کثیر تعداد میں مر چکے ہیں۔ یہاں سے تعدد زوجات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے"۔

مشہور و معروف فلسفی و محقق سر طامس مور سوسائٹی کی متعدی بیماریوں کے لئے یہ نسخہ تجویز کرتا ہے۔

" مرد کے لئے ایک سے زیادہ عورتوں کو مباح کر دیا جائے یہی ایک دوا ہے" جو تمام مہلک امراض کے حق میں تریاق ہے اور یہی وہ تیر بہدف نسخہ ہے جو سوسائٹی کے زہریلے جراثیم کو تباہ کر دیتا ہے۔ یورپ میں سب سے بڑی بیماری اور متعدی بلا یہ ہے کہ یہاں کے مردوں نے محض ایک عورت پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہی وہ تحدید ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنے اور برسر بازار زنا اور فحش کاری کرنے غرض کہ دنیا بھر کی برائیوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بننے کے لئے آمادہ کر دیا ہے اگر یہی حال رہا اور تعدد ازدواج کو مباح قرار دینے کے لئے کوئی قانون نافذ نہ ہوا تو اس طوفان بدتمیزی کے اور بڑھ جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ افسوس اگر اس مسئلہ کو پہلے ہی سے مباح قرار دیا جاتا تو آج اس قدر لاوارث اولاد جو حرام کاری کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے ابنائے قوم و وطن کے لئے

باعث ننگ و عار اور انسانیت کے دامن پر بدنما داغ ثابت نہ ہوتی۔"

ہم تعدد ازدواج کے دیگر پہلوؤں پر اپنی مستقل تالیف میں مزید روشنی ڈالیں گے۔ یہاں بالاجمال اس کے چند اسباب اور مجموعی پہلو پیش کئے گئے ہیں۔

(۸) آنحضرتؐ کے تعدد زوجات کے اسباب

آپ کے متعدد بیویاں کرنے کے دو اسباب ہیں۔

(۱)۔ عام (۲)۔ خاص

عام اسباب

(۱) آنحضور اکرم صلعم ساری دنیا کے لئے پیغام حیات بن کر تشریف لائے تھے۔ آپ کی رسالت و نبوت تمام مردوں اور عورتوں کے لئے عام تھی۔ بعض احکام ایسے ہیں جن میں مرد اور عورت، دونوں شریک ہیں اور بعض ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ چوں کہ آنحضورؐ کو دنیا میں زیادہ مدت تک نہیں رہنا تھا ادھر اسلامی احکام و تعلیمات کی فراوانی تھی اس لئے آپ کی تبلیغ کی آواز کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچانے اور آپ کی تعلیمات و ارشادات کو عام کرنے کے لئے طبقۂ ذکور و اناث میں سے بے شمار افراد کی ضرورت تھی تاکہ ایک قلیل مدت میں آپ کا تبلیغی پروگرام سرانجام پائے ـــــ اس کے علاوہ عورتوں کے بعض احکام و مسائل ایسے ہیں

جن میں عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے دریافت کرنے میں شرم و حیا مانع ہوتی ہے اس پر حضرت عائشہؓ کی یہ روایت روشنی ڈالتی ہے کہ اسماء بنت یزید انصاریہ نے نبی کریم صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر سوال کیا کہ یارسول اللہ میں غسل حیض کس طرح کروں! آپ نے فرمایا ایک روئی کا ٹکڑا رکھ لے اور وضو کرے۔ اس کے بعد آپ نے شرم و حیا سے اپنا روے مقدس پھیر لیا۔ حضرت عائشہ پاس ہی تھیں اسماء کا دامن پکڑ کر کھینچا اور آنحضور کی مراد کو سمجھایا۔

انہی ضروریات کے مدنظر یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ رسول اللہ سے طبقۂ نسواں کے کثیر افراد احکام اناث سے واقف ہوں اور دوسری عورتوں تک ان کی تبلیغ کریں۔ اس بلند پایہ مقصد کے لئے آنحضور اکرمؐ کی ازواج مطہرات سے بڑھ کر اور کون اہل ہوسکتے ہیں اس لئے کہ رسول اللہ کی غرض و غایت کو بغیر کسی شرم و حجاب کے یہی معلوم کرسکتی ہیں۔ جس کی طرف آنحضرت کا یہ ارشاد مقدس اشارہ کرتا ہے۔

خذوا نصف دینکم عن ھذہ الحمیراء۔

اس سے آپ کی مراد اپنی زوجہ مبرأۃ صدیقیہ ہے۔

(۲) مقاصد نبوت میں سے یہ بھی اہم مقصد تھا کہ آنحضور صلعم تمام خاندانوں اور قوموں کے درمیان ایک رابطۂ اتحاد پیدا کردیں اور دلوں میں ربط و محبت کی وہ چنگاریاں روشن کریں جو جلوہ گاہ قدس تک والہانہ اڑتی ہوئی پہنچیں اس میں کس کو شک ہوسکتا ہے کہ باہمی تعلقات اور ربط و ضبط کو قائم رکھنے کے لئے رسم دامادی ہی

سب سے بڑا محکم سبب ہے۔ دینی دعوت کو پھیلانے اور تبلیغی فریضہ انجام دینے کے لئے ابتداءً خاندانوں اور رشتہ داروں کو زیادہ کرنے کی حاجت پیش آتی تھی تاکہ وہ باہم شریک کار اور معاون و مددگار ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ رسالت کی آواز کو گوشے گوشہ میں بلند کریں دشمنان اسلام کی استبدادی قوتوں ان کی طوفانی بغاوتوں اور فتنہ خیزیوں کا مدافعانہ مقابلہ کر کے اعلاء کلمۃ اللہ میں ہر قسم کی قربانیاں پیش کریں۔

رسول اللہ کا بنی المصطلق کے سردار کی صاجزادی سے عقد کرنا کس قدر مفید ثابت ہوا کہ بنی مصطلق اس کی وجہ سے آزاد ہو گئے اور اسلام قبول کر لیا جن کی تفصیل ابھی آنے والی ہے نیز اس امر پر آنحضورؐ کا ارشاد بھی روشنی ڈالتا ہے جو آپ کے صاجزادہ ابراہیم کے حق میں فرمایا گیا تھا کہ

لو عاش لوضعت الجزیۃ عن کل قبطی۔ — اگر صاجزادہ ابراہیم زندہ رہتا تو میں ہر قبطی سے جزیہ لینا موقوف کر دیتا۔

اس کا معنیٰ یہ تھا کہ ابراہیم کے رشتہ دار اور ننھیال اس سے شاد و خرم ہو کر اس کا احترام و توقیر کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیتے اور میں ان پر سے جزیہ کی قید اٹھا دیتا۔

اس کی زبردست تائید کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی روابط و تعلقات کو بڑھانے اور سمدھیانہ نتیجہ سے فائدہ اٹھانے کی خاطر متعدد بیویاں کیں اور زیادہ تر تعدد کا سبب بھی یہی تھا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کی اکثر زوجات

مطہرات قریش یعنی سادات عرب میں سے تھیں۔

اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ مسلمان اپنے نبی کی طرف منسوب ہونے اور آپ سے تقرب حاصل کرنے کو قربت الہی اور شرف و منزلت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جو شخص آپ سے سمدھیانہ تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا وہ اپنے آپ کو بہترین فرزندوں اور خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتا۔

جس وقت آنحضور صلعم نے حضرت عمر فاروق کی صاحبزادی کو جدا کر دیا اس وقت حضرت عمر کو کتنا رنج نہیں ہوا اس حسرت و تاسف کے عالم میں فرمایا کہ اللہ کو اس کے بعد عمر کی پرواہ نہ ہوگی۔ اور عمر سے رنج و غم دور نہ ہوگا تا وقتیکہ وہ لوٹا دی نہ جائے ——— حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنحضرتؐ سے کئی طرح سے قریبی تعلق رکھتے تھے ایک طرف تو آپ قریبی رشتہ دار اور دوسری جانب آپ کو فاطمۃ الزہرا کی وجہ سے شرف حاصل تھا ان وجوہ کی بنا پر مزید مجدد شرف حاصل کرنے کے لئے حضرت علی نے آنحضرت صلعم سے یہ تمنا ظاہر فرمائی کہ ابوطالب کی صاحبزادی اور اپنی ہمشیرہ ام ہانی سے عقد کر لیں۔ آپ نے محض اس وجہ سے انکار فرما دیا کہ آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اپنے ابناء کی خدمت میں رہنے سے حقوق رسول میں کوتاہی نہ کر بیٹھے۔

کیا ان تمام مشاہدات سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا آنحضورؐ کی غرض و غایت تعدد ازواج سے یہ تھی کہ اپنے خاندانی روابط کو بڑھا کر دین اسلام کی خدمات اور تبلیغی فرائض میں تعاون

و امداد حاصل کی جائے۔

خاص اسباب

سیدہ جویریہؓ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی صاحبزادی ہیں ان کے باپ نے اسلام لانے سے قبل رسول اللہ سے جنگ کرنے کے لئے بے شمار لشکر جمع کر دیا تھا جب دونوں جماعتیں مڈبھیڑ ہوئیں تو آنحضور نے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دی انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جنگ کرنے پر اڑے رہے آخر کار جنگ کی اور شکست کھا گئے ــــ مال غنیمت اور قیدیوں میں سے جویریہ جو اس وقت برہ کے نام سے موسوم تھیں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئیں۔ انھوں نے ان سے مکاتبہ کر لیا۔ اب جویریہ کی نظروں میں سوائے رسول اللہ کی ذات مقدس کے دوسرا کوئی معین و دستگیر نہیں رہا۔ آپ کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر اپنا حسب و نسب بیان کرتے ہوئے آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ جب آنحضور اکرمؐ کی نگاہوں میں جویریہ کے خاندان کی شان و شوکت، قوت و اقتدار اور ان کی سیادت و عزت کا نقشہ پھر گیا اور پھر یہ کہ وہ ان محاسن کے باوجود اپنی غفلت اور غلط روش کی وجہ سے کس طرح مغلوب ہو گئے ہیں تو آپ نے جویریہ اور ان کے خاندان کے ساتھ بہترین سلوک اور برتاؤ کیا۔ ان پر جو فدیہ تھا اس کو آپ نے ادا کر دیا۔ اور جویریہ سے شادی کر لی۔ مسلمانوں نے بنی مصطلق کو باہم تقسیم کر دیا تھا جویریہ کے

ساتھ حضور کے عقد کا منظر دیکھا تو کہنے لگے۔ رسول اللہ صلعم کے سسرال والے غلام بنائے نہیں جا سکتے چنانچہ انھوں نے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ بنی مصطلق نے اسلامی رواداری اور مسلمانوں کی شان فراخ دلی کا جب یہ روح پرور نظارہ دیکھا تو اس شکریہ میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قید و بند سے آزادی اور کفر و ظلمت کی ذلت سے نکالا اسلام قبول کر لیا۔

حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی مبراۃ سے عقد کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے باپ صدیق اکبرؓ رسول اللہ صلعم سے شدید تعلق رکھتے اور آپ کے دل میں تقرب نبوی کا ہمیشہ والہانہ جذبہ جوش زن رہتا تھا۔ یہ عقد خود مبراۃ اور صدیق اکبر کی خنکی چشم اور دیگر رشتہ داروں کے لئے فخر و مباہات کا باعث ہوا عبداللہ بن زبیر مبراۃ جو ان کی خالہ ہوتی تھیں فخر کیا کرتے تھے۔

فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی سیدہ حفصہؓ کا شوہر جنگ بدر میں زخمی ہو کر انتقال کر گیا تھا۔ اس وقت رسول اللہ کی صاحبزادی سیدہ رقیہ جو حضرت عثمان کی زوجیت میں تھیں وفات پا چکی تھیں حضرت عمر نے اپنی صاحبزادی کے عقد کا پیغام حضرت عثمان کے نام بھیجا چونکہ آپ حضور کی دختر بلند اختر سے عقد کرنے اور اس مجدد شرف کو باقی رکھنے اور ذوالنورین کا معزز خطاب حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے اس لئے آپ نے انکار کر دیا مگر اس حقیقت کا اظہار نہ کیا جس کی وجہ سے حضرت عمر پر آپ کا یہ انکار بہت شاق اور ناگوار گزرا۔ اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی لیکن مشیت ایزدی یہ تھی کہ حضرت عثمان کو حضرت عمر کی صاحبزادی سے بہترین بیوی اور عمر فاروق کی صاحبزادی کو حضرت عثمان سے بہترین شوہر عطا کرے ۔

سیدہ صفیہ حی بن اخطب کی صاحبزادی تھیں جو بنو نضیر کا سردار تھا صفیہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ قید ہو کر آئی تھیں رسول اللہ نے دحیہ کلبی کو اجازت دی کہ ان لونڈیوں میں سے کوئی ایک اختیار کرے انھوں نے صفیہ کا انتخاب کیا لوگوں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ یہ تو اپنی قوم کی سردار ہیں سوائے آپ کے کسی اور کے شایان شان نہیں ہیں ۔ کیونکہ آپ بڑے مہربان اور دیا والے ہیں خصوصاً اس شخص کے ساتھ جس کو ذلت و رسوائی کے بعد عزت حاصل ہوئی ہو ۔ چنانچہ آپ نے ان کے علاوہ دوسری لونڈی اختیار کرنے کا حکم دیا اور خود آپ نے سیدہ صفیہ سے مسلمانوں کی آرزوؤں کو بر لانے کے لئے عقد کر لیا ۔

جحش اسدیہ کی صاحبزادی سیدہ زینب سے شادی کرنے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ شرعی قانون اور رسول اللہ کے نقش قدم پر چلا جائے ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۔

(۱) شریعت الٰہیہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ جاہلیت کے رسوم و آداب کی اصلاح اور ان کے عقائد فاسدہ میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو چند ایسے اسباب و حوادث جمع کر دئے جاتے ہیں جو ان کے باطل رسوم و عقاید کے

چھوڑنے کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں یا یہ کہ پیشوائے دین عالم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان عادات و رسوم کو اولاً مخالف یا موافق عملی جامہ پہناتے ہیں اور مسلمان اس کے بعد سے آپ کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں۔ اس طرح سے اقتداء اور تتبع کے لئے ایک صحیح راہ عمل متعین ہو جاتی ہے

اس قانون پر بے شمار مشاہدات و واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں من جملہ ان کے یہ ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلعم اور کفار مکہ کے درمیان غزوۂ حدیبیہ میں صلح کے لئے عہد و پیمان لکھا جا چکا تو آپ نے مسلمانوں کو قربانی کرنے اور سر منڈھوانے کا تین مرتبہ حکم فرمایا لیکن کسی نے بھی اس پر عمل نہ کیا۔ آنحضور کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی اسی غضبناک حالت میں اپنی بیوی ام سلمہ کے پاس تشریف لائے۔ ام سلمہ نے آپ سے کچھ دریافت کیا آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر فرمایا مسلمان ہلاک ہو گئے میں نے انھیں قربانی اور سر منڈھوانے کا حکم دیا تھا مگر انھوں نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی یہ سن کر ام سلمہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ پہلے آپ اس فرمان کی ابتداء فرمائیں چنانچہ آپ نے اپنے اونٹ ذبح کئے اور اپنا سر منڈھوایا جب مسلمانوں نے حضور کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو آپ کی اقتدا میں جلدی جلدی قربانیاں کرنا اور سر منڈھوانا شروع کیا۔

جاہلیت کی خوں ریزیوں اور سود کو موقوف کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع

دن علی الاعلان خطبہ میں فرمایا "جاہلیت کا سود باطل کردیا گیا ہے جس پہلے سود کو میں وضع کرتا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ جاہلیت کے تمام خون معاف کردئے گئے ہیں جس پہلے خون کو میں معاف کر رہا ہوں وہ عامر بن ربیعہ کا خون ہے"۔ یہ اور اس قسم کے بیشتر واقعات ہیں جہاں پر اقدامی طرز عمل اختیار کیا گیا ہے اس لئے کہ شریعت میں قول سے بڑھ کر عمل اور کردار کو بڑی اہمیت اور قوت حاصل ہے اور ہر جگہ یہی دستور قائم رکھا گیا ہے تاکہ تنفیذی امر کی صورت میں ظاہر ہوا کرے۔

(۲) ان عادات میں سے جو عرب کی طبیعتوں میں گھر چکی تھیں اور جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں ایک اہم "پسرگیری" کی بھی تھی۔ جب کوئی شخص کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا (تبنیٰ) تسلیم کرلیتا تو وہ حقیقی بیٹے کے قائم مقام سمجھا جاتا۔ اس کی بیوی "پسرگیر" پر حرام ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتقاد کو باطل قرار دینے کے لئے حضور اکرم کو اسوۂ حسنہ ٹھہرایا چنانچہ آپ نے پہلے یہ تدبیر کی کہ اپنے غلام زید کو آزادی عطا کی اور ان کی شادی میں سعی فرمائی۔ زید بلحاظ عرفی مجدد شرافت اور حسب و نسب کے زینب کی کسی صورت سے برابری نہیں کرتے تھے' اس لئے زینب اور ان کے بھائی عبداللہ کو یہ عقد ناگوار تھا۔ خود زینب نے غیر کفو تبنیٰ کی زوجیت سے انکار کردیا۔ اسی سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ
أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ
الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا

کسی ایماندار مرد اور عورت کے لئے
یہ جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کے
رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو
ان کو اپنے کام کا اختیار ہو اور جو شخص
اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا
ہے تو وہ صریح چوک کر راہ بھٹک گیا۔

(سورۂ احزاب)

نافرمانی اور مخالفت سے ڈر کر دونوں نے اللہ اور رسول کے فیصلہ پر رضامندی کا اظہار کیا۔ مگر زینب اس اختلاط کو دل ہی دل میں ناپسند سمجھتی تھیں زید سے ان کو نفرت سی ہو چلی تھی۔ زید نے جب یہ دیکھا کہ ان کے لئے زینب کے دل میں کوئی جگہ نہیں زید کے غلام ہونے کی وجہ سے زینب اپنے آپ کو عالی مرتبہ خیال کرتی ہیں اور رسول اللہ کی اس نصیحت کی نافرمانی کر رہی ہیں جس میں آپ نے ان کو اپنے شوہر سے دلی ربط و اتحاد قائم رکھنے کا حکم فرمایا تھا تو زینب کے جدا کر دینے کو مناسب سمجھا اور اس کے لئے رسول اللہ سے اجازت طلب کی آپ نے فرمایا تم اس رشتۂ نکاح کو مضبوطی سے تھامے رہو اور اللہ سے ڈرو۔ مگر آپ کو حضرت زینب سے عقد کرنے کا خیال پیدا ہو چلا تھا لیکن آپ نے اپنے دل میں اس کو پوشیدہ رکھا اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ مبادا لوگ یہ کہہ بیٹھیں کہ محمدؐ نے اپنے فرزند کی بیوی سے شادی کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دلی رازوں کو معلوم کر لیا اور آپ کو یہ حکم

فرمایا کہ اپنے دل سے لوگوں کے خوف کو نکال ڈالیں۔ اور اللہ سے ڈریں۔

وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاہُ — اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ (احزاب)

حضرت زید کو اس عقد و ارتباط میں ذرا بھر لطف باقی نہ رہا تو انھوں نے زینب کو طلاق دے دی۔ رسول اللہ نے ان کی شرافت کی حفاظت کا خیال کرتے ہوئے شادی کرلی۔ اس کی توجیہہ اللہ تعالیٰ نے کس لطیف پیرایہ میں بیان فرمائی ہے۔

لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ — تاکہ مسلمانوں پر اپنے پالکوں کی بی بی کو کرلینے میں کوئی گناہ نہ ہو جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کریں۔ (سورۂ احزاب)

یہ وہ حقیقت کبریٰ ہے جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے کیا جس کو قرآن نے پیش کیا کیا بیان خداوندی کے بعد کسی اور وضاحت کی ضرورت باقی رہتی ہے؟

کیا ان حقائق کے موجود ہوتے ہوئے تعصب زدہ اہل مغرب کے یہ اعتراضات و شبہات بعید از انصاف نہیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے وہ خصوصیت روا رکھی جو نہ اپنی امت کے لئے ہے اور نہ جس کو شرعی قانون اجازت دیتا ہے چنانچہ آپ نے چار سے بڑھ کر شادیاں کیں حالانکہ یہ چیز (حاشا وکلا) جلال نبوت کے ہرگز شایان شان نہیں۔" غرض کہ جان بوجھ کر

یہ لوگ اس قسم کی افترا پردازیاں کرتے ہیں جو عدل و انصاف کے سراسر منافی ہیں۔ اگر یہ لوگ تاریخ کے صفحات الٹ کر چشم بصیرت وا کر کے دیکھتے تو اصل حقیقت ان کے سامنے ظاہر ہو جاتی اور اس انسانی اجتماعی سبب کی گہرائی تک پہنچ جاتے جو رسول اللہ کو تعدد زوجات کے لئے پیش آیا۔

مخالفین کی نگاہوں میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسول اللہ صلعم نے پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے اس وقت عقد کیا جب کہ ان کی جوانی کا آفتاب ڈھل چکا تھا اور وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکی تھیں اور آپ سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ آپ نے خدیجہؓ کے ساتھ اخلاص و محبت اور حسن وفاداری کے ساتھ پچیس سال تک خوش گوار زندگی بسر کی۔ جس زمانے میں کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا تھا حضرت خدیجہ آپ کی بہترین مددگار ثابت ہوئیں۔ آپ نے ان کے ساتھ نہایت استقامت و تمکنت سے طویل مدت گزاری جیسا کہ مخالفین کو اس کا اعتراف ہے۔ اس اثناء میں آپ نے کوئی شادی نہیں کی حالانکہ اگر آپ چاہتے تو اس سے بہتر نکاح کر سکتے تھے آپ کی قوم کا گمان بھی یہی تھا کہ اس کے علاوہ آپ کو شادی کا حق حاصل ہے مگر آپ نے حضرت خدیجہ کی وفات تک حسن وفاداری کا ثبوت دیا جب وہ فوت ہوئیں تو آپ کو شدید غم لاحق ہوا حتیٰ کہ ان کی سال وفات کو عام الحزن (سال غم) کے نام سے موسوم کیا۔ اپنی زندگی بھر ان کی

یاد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کے بعد سودہ بنت زمعہ سے جو بیوہ ہو چکی تھیں نکاح کیا سودہ سکران بن عمرو کی بیوی تھیں جو حلقہ بگوش اسلام ہو کر کفار کی پے در پے [illegible] سے نجات پانے کے لئے بلاد حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو سودہ بیوہ ہو گئیں ان کا کوئی معین و مددگار نہ تھا۔ آنحضورؐ نے ان سے شادی کر لی جو ان کی معاونت اور حمایت کا باعث ہوئی۔ آپ نے ان سے شادی کر کے اس شخص کی وفاداری کا ثبوت پیش فرمایا جنھوں نے اسلام اور عقیدۂ حق کی خاطر گھر بار کو چھوڑ کر اپنی زندگی فدا کر دی تھی جس کے ساتھ ان کی زوجہ نے بھی راستہ کی دشواریوں اور طوفانی حوادث کو برداشت کیا صرف اس بنا پر کہ ان کی بیوی نے اپنے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کی تھی انھوں نے ہولناک فتنوں میں ان کو مبتلا کر دیا تھا۔

اسلامی شان و منزلت کو دوبالا کرنے کے لئے آنحضورؐ نے شادیاں کیں اس کی تائید اس سے ہو سکتی ہے کہ آپ نے حضرت میمونہ سے نکاح کیا جب کہ ان کی عمر تقریباً پچاس برس کی ہو چکی تھی۔ یہ شادی خالد بن ولید کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب ہوئی۔ یہی وہ اسلامی غازی اور بطل اعظم تھے جنھوں نے روم و فارس کی سلطنتوں کے تختے الٹ دئے اور اسلامی شان و شوکت کا سکہ تمام کفار کے دلوں پر بٹھا دیا۔

آنحضورؐ کے تعدد زوجات کی وجہ سے ایک فیض یہ پہنچا

کہ آپ کے ازواج مطہرات کے رشتہ داروں کی زندگی کو جو کس مپرسی اور فاقہ و افلاس میں بسر ہوتی تھی خوش گوار بنانے کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ ان کی بھوک پیاس دور کرنے کے اسباب جمع ہو گئے اور ان کو امن اور چین کی گھڑیاں نصیب ہوئیں۔

متعصب گروہ کا اعتراض یہ ہے کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعدد زوجات کو عملی جامہ پہنا کر اوروں کے لئے مثال ثابت ہوتے یا اس عادت کو باقی رکھنے کی اجازت دیتے۔ آپ پر تو یہ امر واجب تھا کہ ہر طرح اس خلاف فطرت قانون کا قلع قمع کر دیتے۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کوئی شادی نہیں کی ہے۔

معترضین نے تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر اعتراض تو کر دیا لیکن اس امر کو ایک دم فراموش کر دیا کہ قدیم و جدید ماہرین اجتماع نے اس کے بارے میں کیا نظریات و خیالات پیش کئے ہیں کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قوموں کے حالات و عادات پر زمان و مکان کے تغیرات اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں افکار و آراء میں تغیر و انقلاب ہوا کرتا ہے۔ انسان ابتدائے آفرینش سے تدریجی ارتقائی منازل و ادوار سے گزرتا رہا ہے اس اصول کے ماتحت جو اسباب و حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے کے مطابق تھے یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کی فضاء کے بھی موافق ہوں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرت مسیحؑ نے تمام کے اذہان و عقول کو

آسمانی حکومت کی طرف متوجہ کیا جس کے سامنے اجتماعی علاقات اور حسب و نسب کے اعتبارات کو کوئی وقعت نہیں دی۔ چنانچہ مسیحیت نے اپنے ابتدائی نشو و نما کے ظہور کے وقت شادی کی شدت سے مخالفت کی اور اس کو ناپسندیدہ امر ٹھہرایا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات جاگزیں کرا دی کہ مرد و عورت کا میل جول اگرچہ ایک مقدس چیز ہے لیکن یہ روحانی فضا کے لئے بالکل ناموافق ہے اس کے بعد سے غیر شادی شدہ شخص بہ نسبت اس شخص کے جس نے شادی کر کے اپنے آپ کو پستی کے غار میں ڈھکیل دیا کئی گنا ترقی یافتہ شمار کیا جانے لگا۔

اسی کے مشابہ وہ اعتقاد ہے جس کو ہندوستان کے قدیم علماء اور پیشواؤں نے اختیار کیا تھا کہ انسان اس وقت تک علوم و معارف کو حاصل نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ جمیع خاندانی تعلقات و روابط سے دست بردار نہ ہو جائے کیونکہ یہ گوشہ نشینی اور تنہائی کی سکون پرور گھڑیوں سے نکال کر زندگی کی پریشان کن الجھنوں میں پھنسا دینے کا باعث ہیں۔ یہی خیالات قدیم پیشوایان ادیان سے منتقل ہو کر ان کی بعد کی نسلوں کے دل و دماغ میں پرورش پانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتقاد کہ شادی نہ کرنے سے انسان مفکر بن سکتا اور ترقی کے انتہائی مدارج حاصل کر سکتا ہے صریح اور فاش غلطی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یہی نظریہ صحیح ہوتا تو شادی شدہ اہل کمال کی یہ تعداد معدوم ہو جاتی اور کمال زندگی کا مفہوم تمام تعلقات و روابط بشری سے علیحدگی ہوتا۔ حالانکہ یہ چیز فطری

ضروریات کے سراسر مخالف اور انسانی آبادی کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہر دور کے لئے چند عادات و اخلاق ہوتے ہیں جو اس کی فضا اور ماحول کے ساتھ مختص ہیں ایک زمانے میں کسی قوم کے جو حالات و مصالح ہیں ان کا دوسرے زمانے میں دوسری قوموں کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ موجودہ زمانے پر قیاس کرتے ہوئے گزشتہ دور پر حکم لگانا کس قدر انصاف سے بعید ہے۔ زمان و مکان کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان پر عمل کرنے سے افکار و آرار کی عظمت و شان گھٹ نہیں جاتی کیا یہ کہنا گمراہی اور بدیہی جہالت کی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ایسے خواب دیکھے جن کی تعبیر کچھ نہیں؟

اس سے بڑھ کر فساد اعتقاد کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کی زندگی موجودہ زمانے کے حالات پر قیاس کرتے ہوئے بالکل علیحدہ تھی؟ بیشک ان اولوالعزم پیغمبروں کی زندگی عبرتوں اور نصیحتوں سے معمور تھی جو ان کے زمانے کی قوموں کے لئے مشعل ہدایت اور نمونۂ عمل تھی۔ یہ حقیقت ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے انسانوں کے لئے نبی بنا کر مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ آپ کی ذات انسانی نشو و ارتقاء کی روشن مثال ہے۔ یہ امر مشیت ایزدی کے منافی تھا کہ اس اجتماعی حالت میں یکبارگی تغیر پیدا کر دیا جاتا جو حضور اکرم کی بعثت کے وقت تھی

نیز یہ چیز بھی قانون قدرت کے خلاف ہوتی اگر اس زمانے کی قومی، سیاسی اور اجتماعی حالات میں ایک دم تبدیلی پیدا کردی جاتی بلکہ ہرحال میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا کہ حسب ضرورت زمانہ عمرانی، تہذیبی اور اجتماعی حالتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے تدریجی انقلاب کا نظام پیش کیا جائے اور بتقاضائے انسانی کی رفتار کے مطابق آئینی محکم اصلاحات نافذ کی جائیں۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی نہایت ضروری ہے کہ یہ آیت کریمہ

لا یحل لک النساء من بعد	(اے نبی) تیرے اس کے بعد عورتیں کرنا
ولا ان تبدل بھن من	حلال نہیں اور نہ یہ کہ ان کے بدلے اور
ازواج ولو اعجبک حسنھن	بیویاں کرے اگرچہ تجھے ان کی صورت
(سورۂ احزاب)	بھلی معلوم ہو۔

جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید بیویاں کرنے اور ان کو طلاق دینے کی ممانعت کی گئی ہے اس وقت نازل ہوئی جب کہ فریضۂ تبلیغ کی تکمیل ہوگئی اور اسلام کی نشرواشاعت کا حق پورا ہوگیا اور تعدد زوجات سے جو مقصد تھا وہ حاصل ہوگیا لیکن حضور کی امت کے لئے تعدد ازواج کے احکام باقی رکھے گئے اور ان کو اس میں آزادی دی گئی کہ وہ حدود شریعت میں رہ کر اسلامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے مصالح و ضروریات کے مطابق چار شادیاں کرسکتے ہیں۔

(۹) طلاق :-

تجربات اور مشاہدات سے معلوم ہوا ہے کہ طلاق کشیدگی پیدا کرنے اور زندگی کو تلخ بنانے والے اسباب سے نجات پانے کے لئے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس پر واضح دلیل و برہان قائم ہو چکی ہے کہ شریعت اسلامیہ نے طلاق کے باب میں جو اصول و احکام پیش کئے ہیں وہ دیگر ادیان و شرائع کی بہ نسبت انسانیت سے قریب تر اور عدل و انصاف کے معیار پر پورے اترتے ہیں گزشتہ قوموں نے عورت پر کسی صورت میں بھی طلاق لینے کو حرام کر دیا تھا۔ یہی حالت سلطنت رومانیہ کے دور تک باقی رہی ازدواجی زندگی کے تعلقات کمزور پڑ گئے اور طلاق عام ہو گئی تھی۔ قدیم ایتھنس اور عبرانی قوانین بھی اسی قسم کے نافذ کئے گئے تھے۔

ہم یہاں پر طلاق کی مزید تاریخی تشریح کرتے ہیں۔

طلاق کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی عورت سے ناراض ہو جاتا تو اس کو اس کے گھر واپس بھیج دیتا تاکہ یہ جہاں چاہے چلی جائے۔ عورت کا کوئی حق نہیں تھا جب یہ گھر سے نکال دی جاتی تو تمام حقوق سے محروم رہ جاتی۔

جب یونانی قوم برسر اقتدار ہوئی اور اس کی تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی تو طلاق بھی بغیر کسی قید اور شرط کے عام ہو گئی۔ بعد رومانیوں کے نزدیک طلاق کا اعتبار تکوین عقد ہی سے ہو جاتا

یہاں تک کہ اگر دونوں طرف سے عدم طلاق کی شرط لگا دی جاتی تو وہاں کی عدالت اس عقد ہی کو باطل قرار دیتی تھی۔

رومانیہ کی پہلی نسلوں کے پاس دینی شادی میں طلاق حرام تھی اس کے مقابل شوہر کو اپنی عورت پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ جس کی حد نہیں۔ اگر عورت کوئی گناہ کرے یا اپنی اولاد کو مار ڈالے، یا گھر کی کنجیاں لٹکا دے، یا شراب پی لے تو ان تمام صورتوں میں شوہر کو اس کے قتل کر دینے کی اجازت حاصل تھی ـــــ بعد کی نسلوں میں دیانت لوٹ گئی اور طلاق کو عام شہری قانون کے مطابق مباح کر دیا۔

جب موسوی مذہب کا ظہور ہوا تو اس نے ایک حد تک عورت کی ازدواجی اصلاح کی، اس کے لئے طلاق کو نہایت وسیع حد تک جائز کر دیا۔

عورت اگر کوئی جرم یا برا فعل کر بیٹھتی تو مرد شرعی طور پر اس کو طلاق دینے پر مجبور کیا جاتا اگرچہ وہ اس کے جرم کو درگزر کرنا چاہے۔ اسی طرح یہ قانون بھی تھا کہ اگر عورت مرد کے پاس بیس سال تک رہی اور اس سے کوئی اولاد نہ پیدا ہوئی تو مرد کو طلاق دینے پر مجبور کیا جاتا خواہ وہ اس کو چھوڑنا بھی پسند نہ کرے۔

مسیحی مذہب نے سوائے ان صورتوں کے جن میں کوئی جرم یا گناہ ثابت ہو جائے عورت پر طلاق کو حرام قرار دیا ہے یا یہ کہ اگر عورت بانجھ ثابت ہوتی ہے تو نسل کی برآمد کے لئے اس کو طلاق دی جا سکتی ہے۔

جاہلیت عرب میں لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ سراسر بے انصافی کرتے تھے۔ مرد شادی کرنے کے بعد بعض حالات میں عورت کو نہ تو پوری طرح اپنی بنا کے رکھتا نہ اسے کلی طور پر آزاد کر دیتا بلکہ اس کو یونہی معلق چھوڑے رکھتا تھا۔ اسلام نے ان کی ان جاہلانہ رسموں کا خاتمہ کر دیا اور عورتوں کے بے شمار حقوق اس مسئلہ میں بیان کئے۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھا بیٹھتے ہیں۔ ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے اسی عرصہ میں اگر وہ ملاپ کریں تو اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے، اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو بیشک خدا خوب سنتا جانتا ہے اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ اپنے نفس کو تین حیض تک روکے رکھیں اور ان کو حلال نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں بشرطیکہ وہ اللہ اور قیامت پر ایمان بھی رکھتی ہوں اور ان کے خاوند اگر اچھی طرح رکھنا چاہیں تو اس

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ
بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا
مِمَّا آتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ
يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ
اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا
افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُوْدُ
اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا
وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ
مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا
غَيْرَهٗ

(سورہ بقر)

عرصہ میں ان کو واپس لینے کے زیادہ مستحق ہیں
اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسا کہ
دستور کے موافق مردوں کے حق ان پر ہیں
اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت بھی ہے
اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ وہ
طلاق (کہ جس کے بعد رجوع کر سکتے ہو)
دو ہی ہیں (دو بار تک) دستور کے موافق زوجیت
میں رکھے یا اچھی طرح سے چھوڑ دے اور جو کچھ
ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس
لینا تم کو حلال نہیں۔ مگر جب کہ زوجین کو ڈر
ہو کہ احکام الٰہی قائم نہ کر سکیں گے پس اگر تم
کو یہ خوف ہو کہ وہ دونوں خدا کے حکموں کو
قائم نہ رہیں گے تو اس بات میں ان پر بھی
گناہ نہیں کہ عورت مرد کو کچھ دے کر پیچھا
چھڑا لے۔ یہ خدا کی باندھی ہوئی حدیں
ہیں۔ پس ان سے تجاوز نہ کرو اور جو خدا کی
حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں
پھر اگر اس کو (تیسری) طلاق بھی دے دی تو
اب وہ عورت اس کو حلال نہ ہو گی جب تک کہ
وہ کسی اور سے نکاح نہ کرے گی

اسلام نے طلاق کے امکان کا اقرار کیا ہے اور اُسے تمام حلال

چیزوں میں نہایت ناپسندیدہ حلال ٹھرایا ہے۔ محض اس پہلو پر نظر کی گئی کہ جب میاں بیوی کے درمیان اس حد تک اختلاف اور ناراضگی کے اسباب پیدا ہو جائیں جن سے ان کی زندگی تلخ ہونے لگے خاندانی تعلقات کی بنیادیں کمزور پڑ جائیں اور محبت و اتحاد کی کشش باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں جدائی کے سوائے کوئی چارہ نہیں کیونکہ زندگی نام ہے کشش اور محبت کا اس لحاظ سے اسلام نے طلاق کو جو مشروع قرار دیا ہے وہ بہت ہی مصیبتوں سے نجات کا بہترین طریقہ ہے ——— دیگر مذاہب میں طلاق کی جو نوعیت ہے اسلام نے اس کے تمام باطل طریقوں کا رد کرتے ہوئے طلاق کے محکم اصول نافذ کئے طلاق کی حالت میں عورت کی حفاظتِ حیات کے جملہ سازو سامان مہیا کر دئیے۔ شوہر پر یہ احکام واجب کئے کہ وہ اپنی عورت کو اگر چھوڑنا چاہے تو پسندیدہ اور احسن طریقے سے چھوڑے۔ اس کے سامان اور مال و متاع کو چھیننے کی کوشش نہ کرے اس کے ذمہ جو مہر رہ گیا ہے ادا کر دے عورت کی عدت کے ایام پورے ہونے تک اس کے جملہ اخراجات برداشت کرے۔ جب اس کی عدت ختم ہو جائے تو اس کو دوسری شادی کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں رہتا۔ عورت اگر حیض کے جاری نہ ہونے کا دعوی کرے تو اس کا اعتراف کرنے تک مرد کو نان نفقہ دینا ضروری ہے ——— یہ وہ مختلف طریقے ہیں جو عورت کی زندگی کی حمایت کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ زوجیت کے مرتبہ و شان کو بلند کیا جائے۔ عورت کو حقیر

سمجھنے یا اس کو حقوقِ انسانیت سے محروم کرنے سے احتراز کرایا جائے اور طلاق کو بازیچۂ اطفال بنانے سے روکا جائے۔

حکومت اسلامیہ کے یہ قوانین دیگر مذہبی و حکومتی آئین و اصول سے ممتاز ہیں۔ اس لئے کہ اسلام نے اجتماعی قوانین اور قوموں کی ضروریات و مصالح کے پیش نظر طلاق کو ایک دم حرام قرار نہیں دیا بلکہ اقتضائے طبیعت کے طور پر بعض خاص حالتوں میں یا مخصوص شرطوں کے ساتھ جائز رکھا ہے۔

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان (بقرہ)

وہ طلاق (کہ جس کے بعد رجوع کر سکتے ہیں) دو ہی ہیں (اس میں) دستور کے موافق زوجیت میں رکھے یا اچھی طرح سے چھوڑ دے۔

اگر اس آیت کریمہ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ طلاق کو دو مرتبہ مشروع کرنے میں مقصد یہ ہے کہ مفاہمت اور باہمی صلح کی راہ تلاش کرنے اور اپنے امور پر غور و فکر صرف کرنے کا موقع دیا جائے اس کے علاوہ شریعت نے طلاق سے پیشتر جو عدالتی قانون نافذ کیا ہے اس سے بھی یہی مقصد ہے کہ دونوں رشتۂ ازدواج کو توڑنے اور طلاق پر پیش قدمی کرنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لیں۔ عدالتی فیصلہ یا قانون سے مراد یہ ہے کہ اسلام نے یہ وصیت کی ہے کہ طلاق واقع ہونے سے قبل شوہر اور بیوی اپنی کشیدگی و اختلاف کی اصلاح کے لئے کسی سلیم الطبع شخص یا قاضی کے پاس رجوع ہوں تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے اس کے باوجود اگر اصلاح کی کوئی سبیل نہ پیدا ہو تو اب طلاق کا قصد کریں یہی ایک طریقہ ہے جو ان کو باہمی کشمکش سے

نجات دے سکتا ہے۔

شرعی نقطۂ نگاہ سے اسلام نے طلاق کے دائرہ کو نہایت تنگ کر دیا ہے حتیٰ کہ اس کو ابغض حلال (بدترین حلال) کہا ہے۔ نیز یہ طلاق دو مرتبہ ہے۔ اس سے قبل کہ طلاق ہو عدالتی فیصلہ کی جانب توجہ کرنی چاہیئے۔ عورت شرعی اسباب کے تحت طلاق لینے کا حق رکھتی ہے۔ یہ تمام قوانین اس لئے ہیں کہ جب تک طلاق کے اسباب و شروط پورے طور پر نہ جمع ہو جائیں طلاق پر پیش قدمی کرنا خاندانی سعادت کے لئے ناگوار اور اولاد کی تربیت میں برے اثرات پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس کے علاوہ بعض فقہاء کی نظر میں مرد کا بغیر انتہائی اشد ضرورت کے اپنے تسلط و اقتدار کی بناء پر طلاق پر اقدام کرنا سراپا باطل ہے۔ کیونکہ جمہور فقہاء کے نزدیک طلاق مباح ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ اس طلاق کو جو شرعی شروط پر پوری نہ اترے نہایت افسوس ناک اور بدترین فعل شمار کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے جس طرح طلاق کو بری چیزوں میں شمار کیا ہے کیا اس سے پیشتر اس طرح سے مسیحی مذہب نے بھی طلاق کو حرام نہیں کیا۔ پھر اس میں اسلام ہی کو کیا خصوصیت حاصل ہے؟

یہ کہنا کہ مسیحی مذہب کے مطابق اسلام نے بھی طلاق کو حرام کر دیا ہے غلط ہے کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو شادی کا وہ مقصد فوت ہو جاتا جو مرد اور عورت کی زندگی سے وابستہ ہے کہ ان میں اتحاد

محبت قائم ہو اگر یہ چیز مفقود ہو جائے تو اس صورت میں صرف ایک ہی طریقہ ہے — اصلاح کی کوشش یا — جدائی — تاکہ وہ افتراق ونزاع کے دائمی عذاب سے چھٹکارا پالیں۔ کیونکہ ازدواجی زندگی میں بدمزگی وکشیدگی مختلف مصیبتوں کی آماجگاہ ہے — بانی اسلام حضرت حق جل مجدہ کو یہ معلوم تھا کہ جو قومیں طلاق کو حرام قرار دے رہی ہیں کسی دن وہ بھی اس کو جائز قرار دینے پر مجبور ومضطر ہوں گی اور اس کے لئے ان کو اپنے مذہبی حدود اور قانونی دیواروں کو توڑ دینا پڑے گا چنانچہ یہی ہوا جس پر بے شمار واقعات وحادثات شاہد ہیں — انیسویں صدی عیسوی میں اکثر قومیں اس کو مباح قرار دینے پر آمادہ ہوگئیں۔ اس دور سے طلاق کا رواج اس حد تک ہوگیا خصوصاً ولایات متحدہ امریکہ میں کہ جس کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاتا — امریکہ کے بلکہ یورپ کے تمام مصلحین اس معاملہ میں انجان ہوگئے کیونکہ ان کو اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے کہ تہذیب وتمدن کے نظام کی بنیادیں اسی پر قائم ہو سکتی ہیں۔

اب سے کئی سو سال پہلے اگر اسلام نے طلاق کو مباح کیا ہے تو کیا اس نے تمام عمرانی اور تمدنی واجتماعی ضرورتوں کا پورا لحاظ نہیں رکھا؟

بعض تنگ نظر ارباب بحث یہ پیش کرتے ہیں کہ دولت رومانیہ کے ابتدائی زمانے میں طلاق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی باوجودے کہ یہاں کا قانون اس کے جواز کا حامی تھا۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ عورت بہ نسبت دوسری قوموں کے یہاں پر نہایت

ارفع و اعلیٰ شان رکھتی تھی ـــــ یہ قول سراسر غلط ہے کیونکہ سلطنت رومانیہ میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے شوہر کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی بیوی کو کسی جرم پر قتل کر دے اس کے باوجود عورت کو طلاق لینے کا کوئی حق نہ تھا۔ اگر طلاق لینے کا ارادہ بھی کرتی تو اس کا یہ فعل قابل قصاص شمار کیا جاتا۔ اس کے برعکس جمہوریت کے آخری زمانے میں طلاق بکثرت رائج ہو گئی جو انتہائی سرعت کے ساتھ سوسائٹی کے اخلاق میں انحطاط پیدا کرنے کا باعث ہوئی

سوال یہ ہے کہ اسلام نے طلاق کو جائز قرار دے کر عورت کی تعظیم و توقیر کو بڑھایا اور اجتماعی اضطرابات کے امکانات کو دور کیا یا دوسری قوموں نے جنھوں نے طلاق کو یکسر حرام قرار دے کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیا عورت کے لئے انواع و اقسام کے مظالم کا دروازہ کھول دیا اور اخلاقیات کی بنیادوں کو کھوکھلی کر دیا؟

یہاں اس مقدمہ کا پیش کرنا خالی از دل چسپی نہ ہوگا جس کو مجلہ الضیاء ۲۲ دسمبر ۱۹۳۳ء نے "بیوی کی فروخت" کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے۔

ان عجیب و غریب مقدمات میں سے جن کو میں نے گزشتہ ماہ لندن کی عدالت گاہوں میں دیکھا ہے ایک شخص کا مقدمہ ہے جو "ان واٹہام" سے موسوم تھا یہ شخص اپنی ازدواجی زندگی سے بہت تنگ آچکا تھا۔ آخرکار اس نے اپنی بیوی کو پانسو انگریزی سکون پر ایک تاجر فیلپس نامی کے ہاتھ بیچ دیا۔

مسٹر اِن واٹہام نے دوران مقدمہ میں بیان کیا کہ

اس کی ازدواجی زندگی نہایت ناخوش گوار ہو گئی تھی کیونکہ اس کی بیوی کے اخلاق و عادات مرد کے بالکل مخالف تھے اس لئے کہ اس کی بیوی کو اس تاجر کے ساتھ عشق تھا اور وہ اپنی فروخت کے لئے تیار تھی۔

وکیل ملزم نے کہا کہ مدعی کو اب دعویٰ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ اس نے اپنی مدافعت میں ایک ایسا جملہ کہہ دیا ہے جس سے اس امر پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے انگریزی قانون بیویوں کو فروخت کرنے کے جواز میں تھا۔ اور ۱۸۰۱ء میں ایک بیوی کی قیمت چھ پنس میں محدود تھی مگر شرط یہ تھی کہ بیوی کی رضامندی اور اس کے اختیار سے اس بیع کی تکمیل ہونی چاہیئے۔

عدالت نے اس بیان کی تردید کی کہ یہ جملہ صحیح ہے اور قانون کا ذکر کیا گیا ہے وہ واقعی موجود تھا مگر حکومت نے ۱۸۰۵ء میں بیع زوجات اور ان کی تحقیر کے خلاف قانون صادر کر دیا ہے۔

بحث و مباحثہ کے بعد عدالت نے فروخت شدہ بیوی کے شوہر پر دس مہینوں کی قید کا فیصلہ صادر کیا۔

حکومتوں اور دیگر مذاہب و ادیان کے ان قوانین سے جو عورتوں کے بارے میں پیش کئے گئے ہیں اگر اسلامی تعلیمات و احکام کا مقابلہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا عملی مذہب ہے جو محکم اساس پر قائم ہے اس نے انسانی انقلابات اور تہذیبی و عمرانی حالات و تغیرات کا پورا لحاظ

رکھا ہے۔ اس نے کوئی ایسا خیالی خاکہ پیش نہیں کیا جو عالی شان عبادت گاہوں تک محدود ہو اور میدان عمل میں اس قدر دشوار گزار گھاٹیاں حائل کردے کہ لوگ ان کو عبور ہی نہ کرسکیں۔

یہاں یہ شبہ وارد کیا جاسکتا ہے کہ یہ کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو وہ حقوق دئے جو دنیا کی کسی قوم یا مذہب نے عطا نہیں کیئے حالانکہ اس نے مرد ہی کو عورت کی طلاق کا حق دیا ہے کہ جس وقت وہ ارادہ کرے عورت کی ازدواجی زندگی کو منہدم کرسکتا ہے؟ کیا یہ عورت پر صریح ظلم نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اس قسم کی طلاق عورت کے درجہ کو گرادینے کا موجب ہوتی اگر اسلام طلاق کے بارے میں عورتوں کو مردوں کے مساوی نہ شمار کرتا۔ اس نے حق طلاق مرد ہی کو نہیں دیا بلکہ اس میں مرد و عورت دونوں کو مساوی حقوق عطا کئے ہیں' اس نے یہ قانون پیش کردیا کہ عورت کا حق ہے کہ وہ عقد کے وقت یہ شرط ٹھہرائے کہ طلاق کا حق جس طرح سے مرد کو ہے اسی طرح اپنے لئے بھی ہوگا' وہ حسب ضرورت و مقتضائے حال جس وقت چاہے اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتی ہے' اکثر و بیشتر اسلامی خواتین نے اس حق سے فائدہ اٹھایا ہے' انھوں نے اپنی عصمت و عفت کو اپنے ذمہ لیا اور اپنے شوہروں کے ساتھ نہایت شان و منزلت کی زندگی گزاری اور جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ زندگی کا اطمینان اور مصیبتوں سے نجات پانے کی صورت مردوں سے جدا ہوجانے ہی میں ہے تو اپنا حق طلاق طلب کیا

جب سے مسلمانوں نے ان اسلامی حقوق کو نظر انداز کردیا اور اپنی لڑکیوں کو کلی طور پر مرد کے قبضۂ اقتدار میں دے دیا تو مخالفین کو اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے کا موقعہ مل گیا مگر ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس سے اسلامی احکام و قوانین پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی —— وہ وقت دور نہیں کہ لوگ بہت جلد پھر ان حقوق سے آگاہ ہوکر ان سے استفادہ کریں گے اور اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرکے زندگی کو خوش گوار بنائیں گے۔

یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مخالفین اسلام نے ان شروط و قیود سے آنکھیں بند کرلیں جن کو شارع اسلامی نے اجتماعی ضرورت کے مدنظر طلاق کی اجازت دی ہے نیز انھوں نے ان فقہاء مسلمین کے قوانین کو فراموش کردیا جو اپنے محکم احکام میں از روے عدالت و انسانیت مغربی قوموں کے ارباب بحث و تفقہ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مسلمان فقہاء نے اس آیت کریمہ۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (بقرہ)

پھر اگر اس نے اس کو (تیسری) طلاق بھی دے دی تو اب وہ عورت اس کو حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی اور سے نکاح نہ کرے

سے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ میاں بیوی ہر دو کے لئے ایک تہدیدی حیثیت رکھتی ہے جہاں تک ہوسکے طلاق کا سدباب کرتی ہے اور بلا سوچے سمجھے طلاق پر اقدام کرنے سے باز رکھتی ہے۔

یہ امر کس قدر صریح لبطلان خیز ہے کہ سرمور نے اپنی کتاب "سیرۃ محمد" (علیہ السلام) میں اس کا انکار کیا ہے لیکن اس نے یہ

فراموش کر دیا کہ اسلام نے پہلے شوہر کے لئے اپنی مطلقہ بیوی کو رجوع کرنے کے لئے جو دوسرے شوہر کی شرط لگائی ہے یہ خود طلاق کے واقع ہونے میں زبردست مانع ہے خصوصاً عرب جیسی قوم کے نزدیک جو غیرت و خودداری میں مشہور اور عزت نفس میں ممتاز ہے نیز یہ شرط اس عادت کو روکنے کا بہترین ذریعہ ہے جو اس زمانے کے یہود و نصاری اور جاہلیت کے عربوں میں بکثرت پائی جاتی تھی پس قرآن عزیز نے اس قوم کو شدت کے ساتھ منع کیا جو روئے زمین کی تمام قوموں سے شعور و احساس میں نہایت قوی تھی۔ جس پر عمل کرکے اس نے ابدی عزو شرف حاصل کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ مجموعی طور پر انسانی جذبات میں باہم مشابہ ہیں۔ انسانی سوسائٹی میں سوائے ان چند اشخاص کے جنہوں نے اپنی انسانیت اور غیرت کو خیرباد کہہ دیا ہو کوئی انسان اپنے خاندانی مجد و شرف اور غیرت و حمیت کے تحت ہرگز یہ گوارہ نہ کرے گا کہ اپنی عورت کو طلاق دے کر اس کو کسی دوسرے سے شادی کرنے کے لئے چھوڑ دے۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر شریعت نے حلالہ کرنے کی شدت سے برائی کی ہے چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

الا اخبرکم بالتیس المستعار قالوا ما ھو یا رسول اللہ؟ قال ھو المحلل۔ لعن اللہ المحلل والمحلل لہ

کیا میں تمہیں عاریتی سانڈ کی خبر نہ دوں لوگوں نے کہا یا رسول اللہ وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ حلالہ کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر لعنت کی ہے

(۱۰) پردہ :-

پردہ کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ یونان قدیم کی عورتیں بہت ہی حسین وجمیل تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنے چہروں کو اپنے دامن یا کسی خاص اوڑھنی سے ڈھانپ لیا کرتی تھیں۔

فنیقیہ کی عورتیں سُرخ پردہ اوڑھا کرتی تھیں۔ یونان کے سب سے پہلے مصنف نے پردہ پر مضمون لکھا —— بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ عولیس کی بیوی بنلاپ ہمیشہ پردہ اوڑھے رہتی تھی۔

شہر شیب کی عورتوں کا پردہ خاص ہوتا تھا۔ جس میں آنکھوں کے سامنے دو سوراخ ہوتے تھے تاکہ بآسانی راستہ دیکھا جاسکے۔

اسپارٹا کی نوجوان لڑکیاں شادی ہونے سے پہلے لوگوں سے ملتی جلتی تھیں مگر شادی ہونے کے بعد پردہ پوش ہوجاتی تھیں

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عموماً عورتیں اپنے چہروں اور سروں کو ڈھانکے رہتی تھیں جب انھیں بازار جانا ہوتا تو سر سے لے کر پاؤں تک برقع اوڑھے ہوئے نکلنا ان پر ضروری تھا خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا ناکتخدا۔

اسی طرح سیبلٹریہ ایشیا، ایران اور عرب میں پردہ کا رواج پایا جاتا تھا۔ رومانی عورتوں میں یہ رسم انتہائی حد تک جاری تھی کہ جب ان میں سے کوئی عورت باہر نکلتی تو نہایت احتیاط کے ساتھ ایسا پردہ اوڑھتی جو ایک لمبی چادر کی شکل میں ٹخنوں کے نیچے تک

لٹکا ہوا ہوتا تھا پھر اس کے اوپر ایک عبا پہن لیتی تاکہ کوئی عضو نظر نہ آئے۔

اسلام میں پردہ

اسلام کی ظہور قدسی کے وقت عورت اخلاقی حیثیت سے حد درجہ گری ہوئی تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ عرب کی قوم میں شروع ہی سے پردہ کا رواج تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ادنیٰ درجہ کی عورتیں مردوں کے ساتھ بغیر پردہ کے سفر کرتی تھیں چونکہ اس اختلاط سے دونوں جنسوں میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے اسلام نے عورتوں کو منظر عام پر ظاہر ہونے سے منع کیا اور ان کو اپنے گھروں کو زیب و زینت بخشنے کا حکم دیا

وَقَرْنَ فِي بيوتكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (احزاب)	اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور حسن کا مظاہرہ کرتے نہ پھرو جیسا کہ پہلے جہالت کے وقت میں دستور تھا۔

نصوص شرعیہ یعنی قرآنی صریح آیات اور صحیح احادیث و آثار سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام نے پردہ کے بارے میں تشدد برتا ہو جیسا کہ ہم ان ممالک میں مشاہدہ کرتے ہیں جہاں صحیح اسلامی تعلیمات کی کمی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ	اے نبی اپنی بیویوں اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادروں کو اپنے اوپر لٹکائے رکھیں یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ پہچانی پڑیں

يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا
(احزاب)

تو ان کو کوئی نہ ستائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (الیٰ) تُفْلِحُوْنَ۔ (احزاب)

اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچی رکھیں۔ (تفلحون تک)

ان آیات کا سمجھنا اور اس سے اصلاحی مقاصد کے نتائج اخذ کرنا ان لوگوں کے لئے آسان ہے جنھوں نے گزشتہ زمانے کی قوموں اور اجتماعی حالتوں کا مطالعہ کیا ہے نیز ان پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض و غایت یہ تھی کہ آپ کے ذریعہ سے دنیا کی اصلاح کی جائے اور برائیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ عورت کے جملہ امور کی اصلاح کرکے اس کے ذریعہ سے ایک نظام قائم رکھا جائے تاکہ وہ ظالموں کے لئے مظالم کا تختۂ مشق اور شہوت پرستوں کے حلق میں لقمۂ تر نہ بن جائے۔

مغربی مصنفوں میں سے ایک منصف مزاج مصنف ہملٹن اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کرتا ہے کہ

"اسلامی احکام عورت کی شان میں نہایت صریح ہیں، جو اس کی عزت افزائی کو برقرار رکھنے اور اس کو بے حرمتی و ایذا رسانی سے محفوظ رکھنے کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔ اسلام نے پردہ کے باب میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا جیسا کہ بعض مصنفوں کا

خیال ہے۔ بلکہ اس نے غیرت و مروت کے اسباب کا لحاظ رکھا ہے

ایک مغربی سیاح نے اپنے حالات سفر میں لکھا ہے کہ

جاوہ میں جو عرب مقیم ہیں وہ عام طور سے پردہ کی پابندی نہیں کرتے، جاوہ کی عورتیں ہالینڈ میں رہنے والی اپنی ہم جنس بہنوں کی طرح آزادی سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ازواج نبی کو ان کے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور ان کو زیب و زینت کا مظاہرہ کرنے سے منع کرنے کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ دنیا سے بے خبر اور عزلت گزیں نہیں ہو گئی تھیں جیسا کہ بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے، کیوں کہ سیدہ عائشہ زوجۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کی جنگ میں شرکت کی سیدہ فاطمہ الزہراء نے حضرت علی کی خلافت کے دعوی میں بیشتر حصہ لیا سیدہ زینب بنت حسین نے اپنے چھوٹے یتیم بھتیجے کو حادثۂ کربلا کے بعد امویوں کے پنجہ سے رہائی دلائی۔

غرضکہ نامور خواتین اسلام کے تذکرے تاریخ کے صفحات پر جا بجا پائے جاتے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ان پر گہرا اثر تھا اور وہ قومی زندگی کے میدان میں برابر شریک ہوا کرتی تھیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ عرب جاہلیت، یہود اور نصاری کے اخلاق و کردار میں انتہائی زوال و انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ قرآن کریم نے ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے

گھروں میں ٹھہرے رہنے اور جاہلیت کی زیب و آرائش کا مظاہرہ کرنے سے پرہیز اختیار کرنے کا جو حکم دیا اس کی وجہ سے اخلاقی توازن برقرار ہوگیا اور سیرت و کردار کی سطح اونچی ہوگئی کیونکہ ازواج نبی اوروں کے لئے بہترین نمونہ تھیں۔

یہاں وان ہمر کا قول درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ کہتا ہے کہ "پردہ کو اسلام نے ضروری اور عورتوں کو اجنبیوں سے میل جول رکھنے کو جو حرام قرار دیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبہ کو فنا کردیا جائے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے ان کے ناموس کی حفاظت و احترام کا اور ذریعہ ہے ان کی رسوائی کی روک تھام کا، درحقیقت اسلام کی نظر میں عورت کا جو درجہ و مقام ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے"

ایک منصف مزاج مصنف کے اس زرین قول کو مدنظر رکھ کر ذیل کے اقوال و آراء کا جائزہ لیجئے۔

(ا) ترتریان نے اپنی کتاب (عورت کی تعریف) میں یہ بیان کیا ہے کہ "عورت شیطان کا دروازہ ہے کیوں کہ اس نے آدم کو، جو خدا کا ایک مظہر ہیں، ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دے کر بگاڑ دیا۔

(ب) لوفی کہتا ہے: "عورت ایک برائی ہے جو ناگزیر ہے، ایک نکبت ہے جس کی طرف دل کھنچے جاتے ہیں ایک بلائے ناگہانی ہے جس سے راہ گریز نہیں، ایک بجلی ہے کوندتی ہوئی اور ایک بیماری ہے مہلک ولا علاج"۔

(ج) ارتھوڈکسی کلیسا کے احکام نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ عورت جماعت میں اپنے حق سے محروم رکھی جائے، چنانچہ اس کو محفلوں اور تقریبوں میں شریک ہونے سے ممنوع قرار دیا گیا، عورتیں چپ چاپ پردہ اوڑھی رہیں، ان کا کام محض یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت و فرماں برداری کریں چرخہ کاتنے، کپڑا بننے اور چکی پیسنے کے کام انجام دیتی رہیں جب وہ اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے بدن کو سر سے پاؤں تک ڈھانکے رکھیں"۔

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ جاہلیت عرب میں عورت کو جو آزادی حاصل تھی وہ بمقابلہ یونان کے بہت زیادہ تھی اسی کے بارے میں بائرن کہتا ہے کہ۔

"عورتیں جاہلیت میں مردہ دل اور مجبور نہیں تھیں وہ میدان جنگ میں جنگجو اشخاص کی امداد کیا کرتیں اور ان میں حمیت و جواں مردی کے جذبات بیدار کیا کرتی تھیں، بہادر اور شہسوار میدان جنگ میں جب اترتے تھے، تو اپنی بہنوں، بیویوں اور اپنی معشوقوں کے گیت گایا کرتے تھے، ان کے لئے یہی قابل تحسین و آفریں تھا کہ ان کی معشوقات ان کی بہادری کے کارناموں پر حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھیں، اس کے لئے ہر بہادر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا، جس طرح اخلاق و شجاعت مرد کی بلند ترین خوبیوں میں شمار ہوتے تھے اسی طرح عفت اور پاکدامنی عورت کا خوب صورت اور دل فریب زیور تھا۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ عورت کی توہین کسی غیر قبیلہ والے نے کردی تو عرب کے ریگستانوں میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور خون کی بارش ہونے لگی۔"

عربوں کی طبیعت میں غیرت وحمیت کا جذبہ غالب تھا جس کی وجہ سے وہ عورت کا انتہائی احترام کرتے تھے، چنانچہ اسلام نے بھی ان کے اس عظیم الشان کردار کو اجاگر کیا اور ایسے احکام پیش کئے، جنھوں نے عورت کے احترام اور اس کے مرتبہ کو دوبالا اور اس کی قدر و منزلت کو دوچند بلند کردیا، مسلمانوں کے اندر کمزوروں کی دست گیری، مظلوم کی داد خواہی اور انسانیت کی آواز پر لبیک کہنے کے جذبات پائے تکمیل کو پہنچ گئے، یہ کردار شامیانوں سے عالی شان محلوں تک سرایت کر گئے۔

کیا مورخین کی یہ روایت ہم نے نہیں پڑھی کہ عبدالملک بن مروان اپنے دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا، اُسے خبر پہنچی کہ ایک عرب دوشیزہ شکوہ کر رہی ہے کہ وہ رومانیوں کے پاس قید ہے اور کہہ رہی ہے: مدد اے عبدالملک! خلیفہ نے یہ سن کر قسم کھائی کہ جب تک اس دوشیزہ کو اس کے قید و بند سے رہائی نہ دلائے گا اس وقت تک زندگی کی لذتوں کے نزدیک نہ جائے گا اور اس نے اپنی اس قسم کو پورا کر دکھایا۔

ایک منصف مزاج مغربی مصنف کہتا ہے کہ عنترہ میدان شجاعت کا شہسوار تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ شجاعت کے

علم بردار تھے، آپ بہادری، دور اندیشی، علم و کمال کا اعلیٰ نمونہ تھے۔

اسلام کی پہلی صدیوں میں مشرق میں عربوں کی حکومت کے زوال تک عورت کی بڑی قدر و منزلت تھی، عربی عورت کا مقام اور اس کا درجہ آج کل کی مغربی حکومتوں میں عورت کے مقام و درجہ سے کہیں زیادہ بلند و بالا تھا۔ جس کے بعض شواہد و آثار یہ ہیں۔

(۱) ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اپنے عہد میں اپنے جلیل القدر کارناموں، بلند اخلاق اور بے شمار خوبیوں کی بدولت مشہور رہی۔

(۲) سیدہ سکینہ بنت حسین اپنی ہمسنوں میں درنایاب کی حیثیت رکھتی ہے، اسی کی شان میں بائرن کہتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی سردار تھی، کیونکہ وہ حسن و جمال میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار میں بھی بے مثال تھی، طلب علم کا اس کو بے حد شوق تھا، علماء و صالحین کی صحبت میں بیٹھنے کا اس کو شرف حاصل تھا۔ ان کے ساتھ اس نے اکثر علوم و فنون میں حصہ لیا ہے۔"

(۳) شہدہ جو فخر النساء کے لقب سے مشہور ہے، پانچویں صدی ہجری میں جامع بغداد میں جمہور کو ادب اور تاریخ کا درس دیا کرتی تھی، اس کے حلقۂ درس میں اہلِ فضل و عرفان کا ایک جم غفیر شریک ہوا کرتا تھا، تاریخ اسلام میں اس کی ذہنی قدر

منزلت ہے جو بڑے بڑے علماء کو حاصل ہے۔ اگر یہی شہدہ یورپ میں اسلامی تمدن و ثقافت کی خوشہ چینی نے بیشتر نمودار ہوتی، تو وہ اس کو نذر آتش اس لئے کر دیتے کہ وہ جادوگر ہے۔

کیا ان تمام دلائل و شواہد کے بعد بعض مستشرقین دین اسلامی اور نبی عربی پر کوئی بہتان باندھنے کی جرأت کر سکتے ہیں حالانکہ آنحضرت کا صریح قول ہے۔

مازال جبریل یوصینی	جبریل مجھے ہمیشہ عورتوں کی خیر خواہی کی
بالنساء حتی ظننت انه	وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے خیال
سیحرم طلاقهن ؟	ہونے لگا کہ وہ ان کی طلاق کو بھی حرام کر دیں گے

یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ مغربی عورت اُنیس سو سال بعد اُس مقام پر پہنچی۔ جس میں اُس نے اپنے احترام و شرف کا حصہ پایا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس نے وہ شرعی و مذہبی رتبہ حاصل کیا جو اسلامی عورت کو ملا تھا؟ ہرگز نہیں مسلمان عورت کو وہ حقوق و مراعات دی گئیں، جن سے اُس کی وہ بہن محروم ہے۔ جو اپنے قومی تمدن و ثقافت پر فریفتہ و شیدا ہے،

اتنا ہی کافی ہے کہ اسلام نے لڑکی کو جب تک وہ غیر عاقلہ ہے اور سن بلوغ کو نہیں پہنچی ہے، اس کے ماں باپ یا اس کے سرپرستوں کے زیر نگرانی و کفالت رکھا ہے، جونہی وہ سن بلوغ تک پہنچ گئی، اس کو وہ تمام حقوق سپرد کر دئے جاتے ہیں جن سے وہ شخصی طور پر آزادی کے ساتھ اوروں سے بے نیاز ہو کر بہرہ ور ہو سکتی ہے، نیز اسلام نے اس کے والدین کی میراث کا اس کو حق دار

ٹھہرایا ہے، نیز یہ کہ اس کے بالغ ہونے کے بعد کوئی شخص بغیر اس کی رضامندی کے اس سے شادی نہیں کر سکتا، جب وہ بیاہی جائے تو وہ انسانی جماعت میں ایک مستقل رکن ہونے کی حیثیت سے اپنی شخصیت نہیں کھو بیٹھتی، نیز اسلام نے شوہر پر اپنی بیوی کے تمام کاموں کے انتظام کو، جیسا کہ وہ اس کی خواہش کرے انجام دینے کو ضروری قرار دیا، شریعت نے بیوی کے اموال اور اس کی آمدنی میں اس کی اجازت کے بغیر مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی، عورت کو یہ حق عطا کیا کہ وہ اپنے شوہر یا اپنے باپ یا اپنے بھائی جس سے چاہے، امداد طلب کر سکتی ہے، ماں ہونے کے اعتبار سے اس پر چند مقررہ حقوق ہیں......

ان تمام مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے عورت کو وہ مقام اور رتبہ عطا کیا جو مغربی عورت سے کئی گنا بہتر اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ اب مغربی عورت کے مقابلہ میں مسلمان عورت کی پستی و انحطاط کا سبب محض یہ ہے کہ اسلامی جماعتوں کے درمیان علوم و معارف کی نشر و اشاعت بہت کم ہے، حالانکہ اسلام اس امر کا متقاضی ہے کہ علم جس قدر پختہ گہرا اور وسیع ہوگا اتنا ہی اسلامی اصول اور اس کے احکام اُجاگر ہوں گے اور مسلمان صحیح معنوں میں اس پر عمل درآمد کریں گے۔

کیا عورتیں مردوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کر سکتی ہیں؟

قوموں کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر تاریک پہلو اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ عورت کو مطلق العنان کر دیا جائے اور اس نرم نازک آبگینے کو، جو لطیف احساسات اور منفعل جذبات سے لبریز ہے کارزارِ حیات میں پھینک دیا جائے اور قوی چٹانوں سے ٹکرا دیا جائے۔ عورت مردوں کے دوش بدوش کام کرے اور تمام دن اور رات کا ایک حصہ کارخانوں کے شعلوں اور دخانی بگولوں کے مابین یا سڑکوں پر طوفانی ہجوم کے درمیان گزارے یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے کارخانوں کے اندر ایک عجیب ہنگامہ نظر آتا ہے، یہاں صنفِ نازک سخت و دشوار کام کرتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی زحمت کر کے اُن سے سوال کریں کہ اس شعلہ زارِ جہنم میں کام کرنے کا ان کو روزانہ کیا صلہ ملتا ہے تو اُن میں سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی زبانی یہ جواب ملے گا کہ اس کٹھن اور دشوار تر محنت کا صلہ روزانہ ایک فرانک سے زاید نہیں ہے۔ یہ اس قدر قلیل رقم ہے وہ مشکل ہی سے اپنی زندگی گزار سکتی ہیں، اگر ہم اس کے بعد لیڈی ڈاکٹروں اور ہندسہ ہیئت داں خواتین پر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ بڑے بڑے متمدن ممالک میں فی صدی پانچ کے تناسب سے نظر آئیں گی، ہمارے ملک کے "آزادیِ نسواں" کے علمبردار بجائے اس کے کہ اس کورانہ "تحریکِ آزادی" کو اجتماعی مرض شمار کریں، جیسا کہ عہدِ حاضر کے محققوں اور عالموں کے پاس مسلّم ہے اور بجائے

اس کے کہ وہ ہمارے ملکوں کو اس "بلائے بے درماں" سے نجات دلائیں جیساکہ یورپ و امریکہ کے حکماء و فلاسفہ کوشاں ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہی خطرناک جراثیم ہماری فضا میں داخل کردیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ہم یورپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، لیکن کاش کہ انھوں نے ہماری اجتماعی اسلامی زندگی کی محفوظ فضاؤں کا تھوڑی دیر کے لیے اپنی خورد بینی نگاہوں سے معائنہ کیا ہوتا تو ان کو بخوبی علم ہو جاتا کہ ہم اپنی اسلامی روح کے اکتساب و فیضان کی وجہ سے ان جیسے خطرناک عمرانی امراض سے علیحدہ ہیں۔

"خاتونِ جدید" کی مصنف کہتا ہے۔

"ہم پرزور الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ اہل صنعت وحرفت عورتوں کی تعداد میں سال بسال اضافہ ہونا ضروری ہے کیونکہ ہم اس راستہ پر چل رہے ہیں جس پر ہم سے پیشتر یورپ چل چکا ہے"۔

ہم مصنف کے اس نقطہ نظر سے بالکلیہ اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ ہم ہر طرح یورپ کی راہ پر گامزن نہیں ہیں، ان کی اجتماعی تشکیل اور ہماری اجتماعی ہیئت پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اولین لمحہ میں ہماری اور ان کی زندگی کے اصولوں اور ہمارے اور ان کے عمرانی عوامل و عناصر کے درمیان بہت بڑا فرق نظر آئے گا ہم ایک ایسی اُمت ہیں جس کے روابط و تعلقات اسلامی اصولوں سے مربوط و محکم ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ امر مرکوز ہے کہ ہم عرش

عظمت سے صرف اس لئے گر پڑے، کہ ہم نے اسلامی اصولوں کو جو دنیا و آخرت کی سعادت کا موجب ہیں، پس پشت ڈال دیا۔ ——— بخلاف امت اسلامیہ کے یورپ کی قومیں ایسی ہیں۔ کہ ان میں قومیت و وطنیت کے عناصر کار فرما ہیں اور ان کے باہم جنسی علاقے مربوط ہیں ان کے ذہن میں یہ بات جم چکی ہے کہ انھوں نے قدیم رسم و رواج کو چھوڑنے ہی کی بدولت ارتقائی منازل طے کیں، ہمارے اجتماعی عام اصول کا یہ بسیط نظریہ ہمارے اس دعوی کے لئے کافی ہے کہ ہم اسی صورت میں یورپ کے دوش بدوش اس کے تمام شعبوں میں چل سکتے ہیں۔ جب کہ ہمارے تقلیدی رابطہ کی جگہ کوئی جنسی و قومی رابطہ لے لے اور ہمارے اذہان سے یہ تصور مٹ جائے کہ اوج سعادت تک ارتقا محض ان تقلیدوں کو چھوڑنے سے حاصل ہو سکتا ہے، کیا اس قسم کا دشوار گزار انقلاب ممکن ہے حالانکہ ہمارے علمی تجربات و مشاہدات برابر ہر دن ہمیں یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ہماری زندگی کے اصول و مقاصد اور ہمارا اسلامی نظام حیات ہمارے لئے اکسیر شفا اور ہمارے تمام زخموں کے لئے مرہم ہے؛

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک ہمارا اجتماعی رابطہ جنسی و قومی روابط کے شائبوں سے پاک رہے گا، ہمیں اس کی مطلق حاجت نہیں کہ ہم دنیا کی کسی قوم کی اُن مسائل حیات میں پیروی کریں جو ہماری طبعی ترکیب کے متضاد، ہمارے تہذیبی عناصر کے مخالف

اور ہمارے مزاج دینی سے متصادم ہوں، اس کے علاوہ مغرب نے عورتوں کے باب میں جو روش اختیار کی ہے وہ حد درجہ خطرناک و مہلک ہے۔ جس کے متعلق ان کے بڑے بڑے علماء نے شہادت دی ہے، کیونکہ وہ عورتوں کے لئے مردوں کے مشاغل انجام دینے کو بہت بڑا اجتماعی مرض شمار کرتے ہیں بھلا ہمیں یہ کب روا ہوگا کہ ہم ان کے امراض میں گھر جائیں اور ان میں گھل جائیں پھر ہم خود کو مختلف عوارض و شکایات کا شکار بنا ڈالیں؟ اگر ہم کسی چیز میں ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھتے ہیں تو کس لئے ہم ایسی چیز کی تقلید نہ کریں جو واجبی ہے؟ ہمارے لئے یہ کسی طرح روا نہیں کہ بے سمجھے بوجھے ان کے اصول اخذ کرلیں اور بلا تحلیل و تجزیہ ان کے تمدن سے کوئی چیز کسب کریں،

اس وقت ہمارے سامنے مغربی علماء و مفکرین کے بہت سے اقوال و آراء ہیں جو ہمارے اس موضوع سے متعلق ہیں، ان میں سے عورتوں کے مسئلہ سے علاقہ رکھنے والے اقوال کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی بیماریوں کا مداوا نہ کریں تو دیگر اقوام کے ہاتھوں سے ان کے ازالہ کی کوشش فضول اور فعل عبث ہے۔

پروفیسر جیوم فریرو نے سنہ ۱۸۹۶ء کے ایک مجلہ میں لکھا ہے، کہ ہمارے موجودہ تمدن میں، جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ بہت سی خطرناک نشانیاں نمودار ہوگئی ہیں، کوئی دن ایسا نہیں

گزرتا، جس میں بحث و جستجو کرنے والا تت نئی خطرناک علامتوں سے دوچار نہ ہوتا ہو، ہم اپنے آپ پر ایک طبیب کی ذمہ داری عائد کرتے ہوئے اطباء کی اس تشخیص کی تائید کی کوشش کریں جس کو انھوں نے ہمارے اس دور کے اجتماعی مرض کے لئے جدید درسی شکل میں رہبانیت کو تجویز کیا ہے، ہم بلا کسی دینی استناد کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رہبانیت اس درجہ تک پہنچ جائے گی جہاں تک قرون وسطیٰ میں دینی رہبانیت پہنچ چکی تھی، ہر ملک کے مردوں اور عورتوں کو تجربات و مشاہدات کے ذریعہ بخوبی واقفیت حاصل ہے کہ وہ دشواریاں اور رکاوٹیں جو شادی کی راہ میں حائل ہیں، روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں بے شمار اسباب کے علاوہ بالخصوص اقتصادی اسباب ہیں، جو شادی کے لئے مانع ہیں، اکثر اشخاص کے لئے جب اس منزل کو عبور کرنا دشوار و محال نظر آیا تو ان کو مجبوراً تجرد کی زندگی پر صبر کرنا پڑا ایسے میں ہمارے لئے یہ کہنا آسان ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد لامحالہ اجتماعی ہیئت میں خطرناک آثار و عوارض پیدا کردیں گے جن کا موجب ان کی تجرد پسندانہ زندگی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تجرد پسند عورتوں سے جو نتائج و آثار برآمد ہوں گے وہ تجرد پسند مردوں کی بہ نسبت نہایت خطرناک ہوں گے کیوں کہ تجرد پسندی مرد کے اندر درحقیقت خاص نفسیاتی صفات و کیفیات پیدا کردے گی، مگر بالکلیہ اس کی شخصیت تحویل و تبدیل نہیں ہو جائے گی کیوں کہ تجرد کا لازمی نتیجہ مرد کے اندر پاکدامنی نہیں پیدا کرتا، ممکن ہے

کہ اس کو دختران ہوا و ہوس کے درمیان زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے، یا وہ فسق و فجور کا ارتکاب کر بیٹھے، اس کے باوجود تجرد اس کے عضو یاتی وظیفہ کو یکبارگی زائل نہیں کر سکتا، عورت کا حال اس کے برعکس ہے کیوں کہ موجودہ اجتماعی حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت اس کے تجرد میں مضمر ہے، عفت کا تقاضہ ماں کے فرائض کی ادائیگی کو ساقط کر دیتا ہے، یہی وہ وظیفۂ حیات ہے جس کے لئے عورت جسمی و روحی طور پر پیدا کی گئی ہے، ایسی صورت میں بلاشک و شبہ عورت کی شخصیت میں فساد و تغیر کا رونما ہو جانا لازمی ہے، اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی عورتوں کی ایک بڑی تعداد اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دے گی"

یہ قول ہے شہرۂ آفاق ماہر عمرانیات کا، ہمارے سامنے اس قسم کے بے شمار اقوال و امثال ہیں۔ جو واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن میں ایسی خوفناک علامتیں پائی جاتی ہیں، جو عن قریب یورپ کے نظام تمدن میں بالخصوص عورتوں کے مسئلہ میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کرنے والی ہیں۔ اگر ہم اس تمدن کے کسی شعبہ میں تقلید کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو کم از کم ہمیں اس کو عقل و حکمت کی کسوٹی پر جانچ لینا چاہئے، اگر ہم میں ان معرکۃ الآراء عمرانی مسائل کی جانچ پرتال کی قدرت نہیں ہے جو قوموں کے مستقبل کی تعمیر سے تعلق رکھتے ہیں، تو ہم بآسانی اس تمدن کے علماء سے فیض یاب اور ان کے روزمرہ کے تجربات و مشاہدات سے

مستفید ہو سکتے ہیں ہم قارئین کے روبرو اپنے دعویٰ کی مزید تشریح کے لئے فلسفۂ عملی کے پروفیسر اور علم العمران کے موسس و واضع فیلسوف آگسٹ کانٹ کا ایک قول اس کی کتاب "سیاسی نظام حسب اصول فلسفۂ حسیئہ" سے پیش کرتے ہیں:

مصنف مردوں کے اشغال کے ساتھ عورتوں کو مشغول ہونے کے مسئلہ اور اس سے اجتماعی نظام میں خلل واقع ہونے کے نتائج پر روشنی ڈالنے کے بعد کہتا ہے کہ "ان فساد انگیز اور تباہ کن خوابوں کے بجائے ممکن ہے کہ کوئی طبعی اصول عورت کی زندگی کا بالکلیہ ضامن ہو جائے، یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ صنف قوی پر صنف نازک کی طرف سے مساوی فرائض و واجبات کی تحدید و تعیین کر دی جائے یہ کام محض فلسفۂ حسی سے ممکن ہے کیونکہ حقیقی روح کے ساتھ اس کو امتیازی نسبت حاصل ہے کہ اس فطری اصول کو قابل قبول طریقہ سے رائج کرے، یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ جدید حسی فلسفہ نے اس عام میلان کو ایجاد کیا بلکہ اس نے تو انسانی مجموعی حرکت میں دقیق غور و تامل کرنے کے بعد صرف اس کا ایک تحقیقی اندازہ لگایا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ مرد کا فریضہ ہے کہ وہ عورت کو خوراک بہم پہنچائے۔ یہی قانون طبعی ہے، بنی نوع انسان کے لئے یہی وہ قانون ہے جو صنف نازک کے لئے اصل گھریلو زندگی کے مطابق ہے یہی وہ قانون ہے جس کا حسن و کمال نوع انسانی کے ارتقا کے مطابق جلوہ گر نظر آئے گا، کیونکہ وہ تمام مادی ترقیاں جن کا مطالبہ

موجودہ حالت میں عورتوں کے لئے کیا جا رہا ہے، آخر میں لازمی طور پر اسی اساسی ناموس پر منطبق ہونے کے لئے تبدیل ہو جائیں گی۔ لامحالہ اس اصول کے نتائج ردعمل کے طور پر تمام اجتماعی نظاموں اور بالخصوص مزدور پیشہ افراد میں رونما ہوں گے یہ وہ قانون ہے جو فطری میلان کے ہم آہنگ ہے اور جو عورتوں کی ذمہ داریوں سے علاقہ رکھتا ہے۔" کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ ہم اس صورت میں کیا کریں جب کہ موجودہ حالت کا تقاضا یہ ہے کہ بعض ایسی عورتیں پائی جاتی ہیں جن کا نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ رکھوالی، کیا ہم ان کو بھوکوں مرنے کے لئے چھوڑ دیں اور وہ مردوں کے ساتھ مل کر کام نہ کریں؟ اس کا جواب بآسانی یہ دیا جا سکتا ہے کہ جب ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہو گیا کہ عورتوں کا اپنے گھروں سے باہر کام کرنا اجتماعی نظام میں خلل و فساد کا موجب ہے تو حیات اجتماعیہ کی محبت اور اس کا فرض دونوں اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم اس طرح آسانی کے ساتھ اس اجتماعی خطرہ کو نفوذ کرنے نہ دیں، بلکہ ہم پر انسانیت کا یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس کی روک تھام اور اس کے علاج کی طرف امکان بھر کوشش کریں، ہم کسی ایسے نظام حیات کی تلاش کریں جو نوع انسانی کے مستقبل کی تعمیر میں جوہری عنصر کی حیثیت رکھتا ہو اور اس میں ایسے قوانین و ضوابط پائے جائیں جو خصوصیت سے صنف نازک کی زندگی کے کفیل ہوں اور اس کی فلاح و نجات کے ذمہ دار ہوں۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کے نظام حیات پر بھی ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کیا اس میں وہ اصول و ضوابط ہیں جو اس جنس لطیف کی زندگی کے کفیل و ضامن ہیں جو فقر و فاقہ کے آہنی پنجوں میں گرفتار رہے؟ بے شک اسلامی قانون اس کی ضمانت اس طرح لیتا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جائے اور اس کے رشتہ داروں میں سے اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو تو بیت المال کا فرض ہے کہ وہ اس عورت کی تمام ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل کرے، یہی اسلامی تمدن اور اسلامی اصول ہے، یہی وہ فطری قانون ہے جس کے ارد گرد علمی حسی فلسفہ کے ارباب عام انسانی اجتماعی نقل و حرکت میں فکر و نظر کرنے کے بعد جمع ہوئے ہیں، جدید فلسفہ حسی کا شیخ اور اس کا موسس آگسٹ کانٹ اپنی کتاب "سیاسی نظام" میں بیان کرتا ہے۔

"عورت کا شوہر اور اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہ ہونے کی صورت میں ہئیت اجتماعیہ کا فرض ہے کہ وہ ہر عورت کی زندگی کی ضمانت لے اسی میں انسانی ترقی کا حقیقی راز مضمر ہے، حتی الامکان عورتوں کی زندگی کا گھریلو ہونا ضروری ہے۔ نیز ان پر یہ امر واجب ہے کہ وہ ہر بیرونی کام سے چھٹکارا پائیں تاکہ وہ اپنی زندگی کے فرائض کی تکمیل کر سکیں جو مقصود بالذات ہیں"

یہ وہ نقطۂ فکر و نظر ہے جس پر بیسویں صدی کے مفکرین و زعما، اپنی قومی زندگی کے اُن ہزاروں ادوار و اطوار کا مطالعہ کرنے کے بعد پہنچے ہیں۔ جو ہر صدی میں نت نئے مشکلات اور پیچیدگیوں میں گھرے چلے آ رہے تھے کاش کہ وہ اسلامی نظام حیات اور اس کے اجتماعی ضابطہ پر پہلے ہی سے ہمدردانہ غور کرتے، تو اُن کے تمدن میں تخریبی عناصر اس قدر کارفرما نہ ہوتے، ان اقوال و آراء کو پیش کرنے سے ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ہم ان سے اسلامی فکر پر منطبق کریں اور اسلام کے نظام حیات کی تصدیق کریں کیونکہ اسلام تو ان چیزوں سے بہت بالاتر ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد مغرب زدہ افکار و اذہان کو دعوتِ فکر و نظر دینا ہے کہ جس چیز کو وہ عین صداقت سمجھتے ہیں وہ تغیر و تبدل کے کتنے روپ بھرتی ہے اور جس شئی سے وہ انجان ہیں وہ ہزاروں انقلابات اور تبدیلیوں کے باوجود مجسم حقیقت بنی ہوئی ہے، اس کھرے اور کھوٹے کی تمیز کے بعد کس دلیل و حجت کے ذریعہ ہم تمدن جدید کے جراثیم کو اپنے اندر داخل کرنے کا مشورہ دیں اور بے شمار امراض کا شکار بن جائیں، ہمارا کیا حال ہوگا کہ پہلے ہی سے ہم اس قدر کمزور اور ہماری قوت مقاومت اس قدر مضمحل ہو چکی ہے جو مرض کے حملہ کو اور تقویت پہنچانے کا ذریعہ ہے پھر ہم اس کے بعد ایک نیا قانون پائیں، جو عورت کو بیرونی کام کرنے اور کٹھن کام انجام دینے پر آمادہ کرے؟ ہم یورپ کی کورانہ تقلید اور اس کے تخریبی نظام کی طرف کس لئے رخ کرنے کی زحمت کریں، جب کہ

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلامی تمدن اور اسلامی اصول حیات ہی وہ نصب العین ہے جس کے قریب انسان روز بروز آرہا ہے ؟

کیا وجہ ہے کہ مغربی مفکرین نے بعض اہل مشرق کے اس عقیدہ کے خلاف کہ "عورت کا مرد کے ساتھ اشتراک عمل انسانی تمدن کی بہترین شکل اور انسانی ترقی میں ایک اہم اقدام ہے" پھر اپنے قدیم نظریہ کی طرف رجوع کیا ہے اور عورت کو خارجی کاموں کے انجام دینے کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھا ہے؟ ان کا یہ اعتدال پسند نظریہ نتیجہ ہے اس کا جس کو انھوں نے رات دن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ بے چاری مرد کے دوش بدوش ہے۔ لیکن اس کو کوئی چیز سوائے پسینے کی بو کے حاصل نہیں ہوتی۔ ہر جولان گاہ عمل میں غلبہ کا نشانہ بنتی ہے اور اپنی کمائی پر بھی اس کو قابو نہیں فیلسوف فوریر جو آزادی نسواں کا زبردست حامی ہے کہتا ہے۔

"آج عورت کی کیا حالت ہے ؟ وہ اس عالم مصنوعات تک میں محرومی کی زندگی بسر کرتی ہے، جہاں مرد ہر طرف سے باریک کاموں مثلاً خیاطت اور اصلاح سازی کے مقصد کے لئے ٹوٹ پڑے ہیں، لیکن عورت تنہائی کے گوشوں میں بیٹھی ہوئی دشوار ترین کام انجام دیتی ہے۔ پھر ان عورتوں کی زندگی کی آمدنی کے ذرائع کیا ہوں گے جو مال کی

دولت سے محروم ہیں؟ یا چرخہ رانی یا حسن فروشی بشرطیکہ وہ حسین وجمیل ہوں؟ بے شک ان کی واحد تدبیر علی الاعلان فحش کاری یا پوشیدہ حسن فروشی ہے یہ وہ شغفت بے حیائی ہے جس کی طرف یہ فلاکت زدہ عورتیں اس تمدن کی بدولت پناہ لینے پر مجبور ہوئی ہیں، یہ ازدواجی غلامی جس کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے اب تک انھوں نے کوئی فکر نہ کی، کیا عورتوں کے ان حقوق پر عدالت کا کوئی سایہ پڑ سکتا ہے؟"

اس طوفانی ازدحام میں بے چاری عورت کہاں جائے؟ جب کہ فلاسفہ دکھاو کا یہ نظریہ ہے کہ انسان جیسے جیسے مادی خوش حالی میں ترقی کے منازل طے کرتا جاتا ہے ایسے ویسے وہ ہر دور میں جنسی ترغیبات اور نفسی خواہشات و جذبات میں ترقی کرتا جاتا ہے، پھر کس لئے بیسویں صدی میں جنس لطیف کی اس حالت زار پر دل نہیں پگھلتے اور رحمت و راحت کا جذبہ جوش زن نہیں ہوتا؟ کون ایسا انسان ہے جو یہ قبول کرے کہ عورت کو اپنے اس فطری فریضہ سے جس کے لئے وہ جسمانی و روحانی طور پر پیدا کی گئی ہے آزاد ہو جائے اور خود کو اس خوں ریز معاشی جنگ میں جھونک دے؟ مشہور ماہر اقتصادیات فلسفی برو ڈون اپنی کتاب

"ابتکار النظام میں کہتا ہے"

"نوع انسانی کسی نقطۂ فکر سے بھی خواہ وہ اخلاقی
و سیاسی ہو یا فلسفیانہ عورت کی مرہون منت نہیں
کیونکہ بنی نوع انسان نے عورت کی امداد و دستگیری
کے بغیر علمی راستے طے کئے اور اس کے ذریعہ
حیرت انگیز ایجادات اور عجیب و غریب انکشافات
انجام دئے، نوع انسانی کسی صناعی انکشاف میں
عورتوں کا رہین منت نہیں ہے، مرد ہی تنہا
اختراع و ایجاد کرتا، محنت و مشقت کرتا شدائد
و مصائب برداشت کرتا اور عورت کو خوراک بہم
پہنچاتا ہے"

آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے۔

"یہ دور جس میں عورت زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً میدان
ادب میں تماشا دکھا رہی ہے، بعینہٖ وہی دور ہے جس میں اس
نے فبریکا میں اپنے کرتب و کمالات دکھائے ہیں لیکن اس سے
یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کوئی جدت و اختراع کر سکے اور اپنی طبیعت
کی جولانی دکھا سکے"

برودون کے اس قول سے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ
اس نے عورت کی شان میں تحقیر و توہین کی ہے بلکہ اس کا مقصد
اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ عورت اس لئے نہیں پیدا کی گئی کہ
وہ کسی کارخانے میں صنعت گری کرے یا علم و حکمت کے سمندر
کھنگالتی رہے بلکہ اس کی تخلیق کا فطری منشا یہ ہے کہ وہ ماں

بن کر رہے اور بہترین مُربی ثابت ہو۔

جو لوگ عورتوں کی اصلاح اور ان کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں ان کو چاہیئے کہ وہ شہرۂ آفاق فلسفی، موجودہ مادی تمدن کے باوفا فرزند اور اس کے سب سے بڑے موسس جول سیمون کے اُس بیان میں غور و فکر کریں جو اُس نے علامہ لاجو دیر فرانسس کی کتاب میں ایک باب کی شکل میں قلمبند کیا ہے وہ لکھتا ہے :۔ کہ

"عورت کا فرض ہے کہ وہ عورت ہی باقی رہے یہ قول ہے سیمو لاجودیر کا۔ بے شک عورت کو عورت ہی باقی رہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اسی کی بدولت اپنی سعادت و فلاح حاصل کر سکتی اور دوسروں کو بھی اُس کا فیض پہنچا سکتی ہے، ہم بھی عورتوں کی اصلاح کے موئد ہیں، اس طرح سے نہیں کہ ان کی فطرت ہی کو بدل ڈالیں اور ان کی شخصیت کو متغیر کر دیں۔ ہم ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ مرد بننے سے پرہیز کریں، کیونکہ وہ اس طرح کرنے سے بیشتر بھلائی کو فنا کر لیں گی اور ہم بھی اپنی ہر چیز کھو بیٹھیں گے کیونکہ فطرت نے اپنی ہر صناعی کو محکم طریقہ سے بنایا ہے۔ ہم اُس سے سبق حاصل کریں اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش کریں اور ہر اُس چیز سے خوف کریں جو فطرت کے قوانین و ضوابط سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتی "

آگے چل کر کہتا ہے :- کہ

بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ زندگی شدائد و آلام سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن وہ اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر بھر محبت کا ذائقہ نہیں چکھا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ زندگی پاک اور خوشگوار ہے مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ ہر مرد اور عورت اس مقام و مرتبہ کو معلوم کرے جس کو اللہ نے ان دونوں کے لئے بنایا ہے"۔

ایسے بڑے مفکر کو یہ قول کہنے کا سبب صرف یہی ہوا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عورت کا اپنے پردہ سے باہر ہو کر کام کرنا اس کے وظیفۂ طبعی کے منافی ہے۔ اس فعل نے اس کے گھریلو زندگی کے نظام کو درہم کر دیا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عورتوں کا مردوں کے ساتھ اشتراک عمل علاوہ اقتصادی اور گھریلو زندگی پر برے اثرات مترتب کرنے کے اُن پر اس سے زیادہ عجیب و غریب اثر پیدا کرتا ہے، مشہور محقق جیوم فریرو کہتا ہے کہ یورپ میں بیشتر عورتیں ایسی ہیں جو مردوں کے کام انجام دیتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ سرے سے شادی ہی نہیں کرتیں۔ اس قسم کی عورتوں کو "تیسری صنف" سے یاد کیا جائے تو صحیح ہوگا یعنی نہ یہ مردوں میں شمار ہوتی ہیں اور نہ عورتوں میں۔

محقق موصوف نے ان عورتوں کا نہایت دقیق مطالعہ کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس ہنگامہ خیز زندگی میں معاشی کام انجام

دینے اور خود کو اپنے اُن طبعی و فطری وظائف سے علیحدہ رکھنے کی وجہ سے جن کے لئے وہ جسمی و روحی طور پر پیدا کی گئی تھیں ان کے احساسات و جذبات ان کی جنسوں کے احساسات کی بہ نسبت متغیر و زوال پذیر ہو گئے اور وہ مالیخولیا کے مشابہ حالت میں ہو گئیں گویا انسانی فطرت اپنی زبان حال سے ان کے اپنے حقوق سے غفلت کرنے پر وظیفہ ملامت پیش کر رہی ہے۔ پھر وہی محقق مختصر لفظوں میں کہتا ہے کہ

"علماء عمرانیات نے اس امر کے بارے انجام میں جو فطری قوانین کے منافی ہے، غور کرنا شروع کر دیا۔ کیوں کہ ان میں سے بعض عورتیں مردوں سے اپنی مزاحمت کی وجہ سے جماعت انسانی پر ایک بار گراں ہیں کوئی کام ان کو نہیں ملتا، اگر یہی حال اس طرز پر باقی رہے گا تو اس سے ایک عظیم الشان خرابی خلل پیدا ہو جائے گا۔"

کیا ان کھلم کھلا شواہد کے بعد ہم عورتوں کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ خود کو خارجی طوفان حیات میں جھونک دیں؟

کیا پردہ عورت کے لئے ضروری ہے؟

گزشتہ صفحات میں ہم نے عورت کی ماہیت اور اس کے کمال کو بیان کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ عورتوں میں یہ کمال مردوں ہی کے ماتحت رہنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب اس جگہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عورتوں کے استقلال اور ان کی صحیح حریت و سعادت

کے لئے پردہ نہایت ضروری ہے، اگرچہ عورتیں موجودہ وقت میں کچھ دنوں کے لئے بے پردہ ہو گئی ہیں اور مرد و عورت خوش خوش نظر آ رہے ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ یہ حالت طویل زمانہ تک باقی نہیں رہ سکتی، کیوں کہ عورتوں کی یہ حالت فطرت انسانی پر منطبق نہیں ہے، فی الوقت اگرچہ مردوں کی غیرت کو مدنیت کی بعض شکلوں اور لہو و لعب کے مظاہر نے کچھ دنوں کے لئے مدفون کر دیا ہے، لیکن ہمیشہ کے لئے وہ فوت نہیں ہو سکتی، ایک روز آئے گا کہ یہ غیرت ابھر پڑے گی، اور پھر عورتیں نہایت سختی کے ساتھ قید کی جائیں گی،

میری یہ تحریر ان حضرات کے نزدیک جنھوں نے انسان اور انسانیت کی مجموعی حالتوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ایک خیالی اور شعری معلوم ہو گی، لیکن صاحب عقل و ہوش کے نزدیک یقیناً یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، ہماری اس تحریر پر تاریخی شہادت موجود ہے۔ چنانچہ بطور مثال ہم رومی سلطنت کو پیش کرتے ہیں جس سے یورپ کی تمام سلطنتیں پیدا ہوئی ہیں۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت ایک چھوٹے پیمانہ پر قائم ہوئی، لیکن آہستہ آہستہ مرور زمانہ کے ساتھ بڑھتی اور ترقی کرتی گئی۔ یہاں تک کہ لوگ زبردست مدنیت کے مالک ہو گئے، اس سلطنت میں تمام عورتیں پردہ کے اندر رہا کرتی تھیں، اور اپنی حیات منزلی کی تدبیریں میں مصروف تھیں، پردہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ دایہ بھی اپنے مکان سے بالکل سر سے پیر تک مخفی

ہو کر نکلتی تھی، اس دور پردگی میں رومیوں نے ہر چیز میں حیرت انگیز ترقی کی، بڑے بڑے مجسمے بنائے، عالی شان مکانات اور محل وغیرہ تیار کئے، بڑی بڑی وسیع سلطنتوں کو فتح کیا۔ اکثر قومیں ان کی غلامی میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ لہو ولعب کی طرف میلان ہوا۔ یہاں تک کہ عورتوں کو بھی پردے سے باہر نکالا گیا، تاکہ مجلس طرب میں شریک ہو کر مجلس کی زیب و زینت کو ترقی دیں، عورتیں پردہ سے باہر نکلیں تو اس طرح نکلیں کہ مردوں پر غالب آگئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کی عفت و عصمت، اخلاق و طہارت سب ان کے نزدیک بے معنی الفاظ تھے، وہ محض مردوں کی شہوات حیوانی کا آلۂ کار سمجھی جانے لگیں، تھیٹروں میں شریک ہوتی تھیں، محفلوں اور مجلسوں میں گاتی اور ناچتی تھیں، غرض اس طرح مردوں پر غالب ہوتیں کہ افراد حکومت کے عزل و تقرر میں بھی ان کی آوازوں کی قدر و قیمت تھی لیکن افسوس، رومی سلطنت کی اس حالت پر تھوڑا زمانہ بھی نہ گزرا کہ مصائب و آلام کی پیہم بارشیں ہونے لگیں، اور تاریخ کا مطالعہ کرنے والا شخص حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ سلطنت روما کی وسیع اور بلند عمارتوں کے پتھروں کو انہی عورتوں کے نازک ہاتھوں نے ہلا ڈالا اور ایک ایک کرکے پھینک دیا، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عورتوں کی فطرت میں فساد داخل ہے، بلکہ مردوں نے ان کو فتنہ میں ڈال دیا اور خود بھی ان کے ساتھ فتنوں میں شامل ہو گئے، یہ ایک سیاسی حقیقت ہے جس میں مباحثہ و مجادلہ کی گنجائش نہیں۔

علامہ نوبز برڈل کہتا ہے :-

"دنیا میں فسادات ہر زمانے میں موجود ہوئے ہیں، لیکن کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس فساد کے اسباب جو گزشتہ زمانے میں ہوئے ہیں بعینہ وہی موجودہ زمانے میں بھی ہیں، یعنی عالم کے ہر دور میں اخلاق فاضلہ کی بنیادوں کے منہدم کرنے میں سب سے زبردست سبب عورت کا وجود ہوا ہے"

اس عمرانی مصنف کے یہ شایانِ شان تھا کہ وہ اس بگاڑ کی بہتان کو عورت کے سر چیپاں نہ کرتا، کیونکہ مرد ہی نے عورت کو بگاڑ اور محض اپنے دون فطرت میلانات و خواہشات کے لئے اس کو بگاڑ کا ذریعہ بنایا۔ پھر وہی مصنف موجودہ تمدن کی خطرناک علامتوں اور جمہوریہ روماں کے عہد کے حالات کے مابین موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے :- کہ

"جمہوریہ روماں کے آخری عہد میں ارباب سیاست اُن کمینہ عورتوں کی صحبتوں میں زندگی بسر کرنے لگے تھے جن کی تعداد بہت زیادہ تھی، چنانچہ آج کل وہی حال ہے جیسا کہ اُس دور میں ہو گیا تھا، تم دیکھو گے کہ لوگ خواہشات نفسانی اور لذاتِ جسمانی کے پیچھے جنون کی حد تک پڑ گئے ہیں"۔

رومانی قوم کو، جو مجد و شرف کی دلدادہ تھی، وہ کیا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی سابقہ تاریخ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالا یہاں تک کہ

انھوں نے اپنی آنکھوں کے روبرو اپنی عزت و شان کی بنیادیں اکھڑتی ہوئی دیکھیں مگر ان کے دل میں ذرا بھی غیرت و حمیت کا جذبہ نہ ابھرا، بھلا یہ کب تصور میں آنے والی بات تھی کہ رومانی قوم، جو اپنی عظمت و حکومت کے زمانے میں عورتوں کے پردہ میں غلو پسند واقع تھی۔ اس کے بعد ان کو اجازت دے ڈالے کہ وہ مردانی سیاست پر غالب ہو جائیں اور عزل و تقرر کی باگ جس وقت چاہیں ڈھیلی کر دیں؟ اس قدر تیزی کے ساتھ عجیب و غریب انقلاب کیا تھا؟ کیا ان دونوں حالتوں میں طبعی تدریجی رفتار نہیں پائی جاتی؟ بے شک وہی نسوانی فساد و انتشار فطری اصول کے مطابق نشو و نما پایا ابتداً حقیر مقدار میں شروع ہوا۔ پھر وہ جسم میں ناگہاں مہلک مرض کی شکل میں نمودار ہو گیا انیسویں صدی کا دائرۃ المعارف کہتا ہے کہ

"عورتوں کی زیب و زینت کے لئے یہ جنونی عشق شہنشاہیت کے عہد ہی میں رواج پایا۔ لیکن جمہوریت کے ابتدائی زمانے میں عورت اپنے گھر ہی میں رہا کرتی اور اس میں چرخہ کاتا کرتی تھی، لیکن فساد اور بگاڑ روم میں رفتہ رفتہ سرایت کرتا گیا یہاں تک کہ کاتون نے آنے والے سیلاب شر و فساد کے خطرہ سے آگاہ کیا، اس کے چند دنوں کے بعد فسق و فجور اور شر و فساد کی انتہا نہ رہی۔"

کاتون نے اپنی قوم کے روبرو کیا کہا، پردہ کو چھوڑ دینے کے خطرہ سے کس طرح ڈرایا اور اس کی پیش گوئی کس قدر درست نکلی؟ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن پر ہم یہاں ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں،

رومانیہ میں اس قانون کی تنسیخ کے لئے جس میں عورتوں کی بے جا آرایش وزینت کی حد بندی کی گئی تھی، جب بغاوت وانقلاب کے آثار نمایاں ہونے لگے، تو کاتون نے، جو دوسری صدی قبل مسیح میں جمہور روما کے نزدیک فلسفہ وحکمت میں مشہور تھا، اس انقلاب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کہا:-

"اے اہل روما! کیا تمھیں یہ وہم وگمان ہے کہ جب تم ان کے ان روابط وتقیدات کو توڑنے پر قابو پاؤ گے، جو ان کے استقلال کو محفوظ کرنے اور ان کو اپنے شوہروں کے اطاعت گزار بناتے ہیں۔ تو عورتوں کی رضامندی تمھارے لیے آسان ہو جائے گی؟ کیا موجودہ قیود وشروط کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے یہ دشوار نہیں ہو گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہی ہیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ قریب میں ہمارے دوش بدوش ہو جائیں گی اور ہمیں اپنے غلبہ واقتدار میں کر لیں گی؟ وہ کس دلیل وحجت کی وجہ سے اپنا اجتماعی انقلاب برپا کر رہی ہیں؟ ان میں سے ایک لڑکی نے مجھے جواب دیا کہ ہم یہ چاہتی ہیں کہ سونے اور چاندی میں جگمگائیں رشیمی پوشاکوں میں لہرائیں، شہر کی سڑکوں پر تہواروں کے دن اور دوسرے

دنوں میں چلیں پھریں، شاندار سواریوں میں سوار ہوا کریں تاکہ ہم منسوخ شدہ قانون پر اپنی فتح و کامرانی کا مظاہرہ کریں اور آزادی کے ساتھ ہم تمہیں انتخاب کر کے بہرہ ور ہوں نیز ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ تم ہماری نقل و حرکت کے لئے کوئی حد مقرر نہ کرو۔

پس اے اہل روما! تم نے میرے وہ اکثر و بیشتر شکوے سن لئے، جو میں نے تمہارے روبرو مردوں اور عورتوں کی بے جا زیادتیوں کے متعلق پیش کئے یہ بھی تم نے سن لیا کہ جمہور دو متضاد بیماریوں افراط و تفریط کے مابین گرفتار ہیں یہ ایسی بیماریاں ہیں جنھوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے الٹ دئے۔"

انیسویں صدی کا دائرۃ المعارف مذکورہ بالا بیان درج کرنے کے بعد کہتا ہے کہ کاتون کو اس قانون کی مدافعت میں کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن اس کی تمام پیش گوئیاں پوری ہوئیں پھر اس کے بعد کہتا ہے :۔ کہ

"ہماری موجودہ اجتماعی ہئیت میں جس میں عورتیں اپنی بے جا آزادی سے بہرہ یاب ہو رہی ہیں۔ ہم ان کے اندر ادنیٰ درجہ کا ذوق اور میلان پاتے ہیں جو ان کو ہمیشہ اپنی آرائش جمال اور لوازمات حسن کی افزائش میں مشغول ہونے پر آمادہ کرتا ہے یہ تمام نہایت خطرناک علامات ہیں جیسا کہ روما اس سے پہلے ان میں گھر چکا ہے۔"

اس داستان کو چھوڑئیے اب ایک قدم آگے بڑھ کر دیکھئے

کہ رومانیہ کی تہذیب میں بگاڑ اور ملک میں فساد و خلل پیدا ہونے کے بعد کیا حالت ہوئی؟ کیا عورتیں سونا اور چاندی میں جگمگا اٹھیں؟ نرم و مہین پوشاکوں میں لہرائیں؟ سڑکوں پر ان کی صبح و شام آمد و رفت کا منظر رہا؟ شاندار سواریوں میں سیر کرتی رہیں؟ جیسا کہ سلطنت رومانیہ کے عظمت آفرین دور میں ان کی شان تھی؟ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے دیکھ لیا کہ لوگوں نے عورتوں کے حقوق کو ہضم کر لیا اور ان کو ان کے درجے سے گرا دیا، یہاں تک کہ ان کے لئے گوشت کھانا اور ہنسنا بولنا حرام قرار دے دیا گیا اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے منہ میں بھاری مضبوط تالے ڈال دئیے جن کا نام انھوں نے موزلیر رکھا تھا۔ حالت اس سے بھی ابتر اور بدتر ہو گئی یہاں تک کہ ساتویں صدی عیسوی میں روما کی ایک مجلس میں جس میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ کیا عورت کے لئے روح ہے؟

الغرض عورت کو ایسے مظالم و آفات میں گھیرا گیا جن کی شدت سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان حوادث و آفات میں غور کرنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور خود سے سوال کرتا ہے کہ کل تک جو عورتیں خوش حال اور مردوں پر اپنی آزادی و غلبہ کی وجہ سے خوش خوش تھیں، وہ آج کس طرح ظلم و ستم کا تختۂ مشق بن کر رہ گئیں اور کیوں کر ان کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہو گئی؟ اس قدر سریع انقلاب و تبدل کا سبب کیا ہے؟ وہ کیا راز ہے جس نے عورت کی گزشتہ آزادی کو چھین کر غلامی کی

زنجیروں میں جکڑ دیا اور ان کو وحشت و بربریت کے درجہ تک پہنچا دیا؟

یہ تمام سوالات وہ ہیں جن کو تاریخ کا پڑھنے والا اپنے دل میں پاتا ہے اور اسی وقت ان کی گہرائی اور تہہ تک پہنچ سکتا ہے جب کہ وہ ان کو نفسیاتی و عمرانی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے۔ ہم ان کا نچوڑ چند الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

جب روما کی سلطنت وسیع ہوئی، اہل روما نے دیگر قوموں پر تسلط اور برتری حاصل کرلی، جب انھوں نے روئے زمین پر کوئی مقابل باقی نہ چھوڑے، تو ان کے اندر عیش پرستی اور عشرت پسندی کی عادت جاگزیں ہوگئی، یہ دونوں چیزیں دونوں جنسوں کے باہمی میل جول ہی سے پوری ہوتی تھیں، مزید برآں یونانی ملحدوں اور ان کے رومانیہ کے مقلدوں کی تعلیمات نے ان کے دل و دماغ پر سونے پر سہاگہ کا کام دیا، چنانچہ انھوں نے ان کی عورتوں کو پردہ سے باہر قدم نکالنے کی اجازت دے دی اس میں رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی ہوئی کہ عورتیں سیاسی امور پر غالب ہوگئیں، اس اختلاط میں ایسی آلائشیں گھل مل گئیں جن کے ذکر سے قلم شرمسار ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ہمتیں مرگئیں، ان کے عزائم فنا اور ان کے دل مردہ ہوگئے، وہ باہم جنگ و جدال اور خوں ریزی میں پڑگئے فساد بڑھتا ہی گیا اور اس دوران میں نہایت تلخ ناک نتائج و حوادث رونما ہوئے، لوگوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس شر و فساد کا

سبب عورتیں ہیں، اس بنا پر رفتہ رفتہ ان کے خلاف کینہ و عداوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں، دلوں میں کدورت روز بروز بڑھنے لگی، یہاں تک کہ اس نوبت پر پہنچ گئی جس کو ہم نے اوپر قرون وسطیٰ سے سترھویں صدی کی انتہا اور انیسویں صدی کی ابتداء تک کے حالات میں بیان کر دیا ہے، آج ہم یورپ میں دیکھ رہے ہیں کہ وہاں کے لوگ جو روزانہ عورتوں کے فتنہ و فساد کو بڑھانے والے اسباب کا اختراع کرتے، ان کی طہارت و عفت پر حملہ کرنے اور ان کو اگلوں کی طرح گمراہی و تباہی کے غار میں دھکیلنے کے لئے مختلف وسائل و ذرائع ایجاد کرتے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ بعینہ رومانیہ کے دور کا اپنے ملک میں اعادہ کریں، اس کا اندازہ ان کے عقلاء و مفکرین نے بخوبی لگا لیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ان کے آراء و خیالات کا تھوڑا سا خاکہ کھینچا ہے۔

ایسے پر آشوب و پر فتن دور میں اور تہذیب و تمدن کے جاذب نظر مظاہر میں، جب کہ عورت مرد کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہے، مسلمان عورت کا پردہ نشین ہونا ہی اس کی عصمت و عفت کا کفیل ہے، اسلام نے اس کے لئے ایسے حکیمانہ قوانین پیش کئے ہیں جو دلوں میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان میں تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ بالکلیہ دین اسلام ہی کو بدل دیں حالانکہ ایسا ناممکن ہے، کیا یہ مشاہدہ نہیں ہے کہ مسلمان عورت تیرہ سو سال سے ان حادثات و انقلابات سے محفوظ ہے، جن سے دنیا کی

دیگر عورتوں کو دو چار ہونا پڑا ہے؟ پردہ کی نعمت سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جب کہ وہ عورت کو مرد کے ہاتھ کا کھلونا بننے سے مانع اور اس کی خواہشات کا نشانہ بننے میں رکاوٹ ڈالنے کا بہترین آلہ ہے؟

مصنف "خاتون جدید" کہتا ہے کہ "یورپ میں کئی ایسی جماعتیں ہیں جو بھاری مطالبات طلب کر رہی ہیں اس کے باوجود کسی کے دل میں یہ بات نہیں گزرتی کہ وہ عورتوں کے پردہ کا مطالبہ کرے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، کیونکہ ارباب مذاہب میں سے جدت پسند افراد وسیع پیمانہ پر عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ وہ مرد کے مساوی ہو جائے، یہ لوگ معتدل مسالک رکھنے والوں کے ساتھ اس معاملہ میں متفق ہیں، اس اتفاق، وہم آہنگی کا راز اور اس کا سبب کیا ہے؟" مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فلسفۂ عصر حاضر کا موسس آگسٹ کانٹ اور تمام فلاسفۂ وقت جو فلسفۂ حسی کے علمبردار ہیں، یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ عورت نے اپنا ظاہر فریب اور باطل آزادی سے نہ صرف ایک بڑا حصہ حاصل کیا، بلکہ وہ فطری سرحدوں سے باہر نکل گئی ہے، گزشتہ بیان میں ان مفکرین کے اقوال ثبوت میں پیش کردئے گئے ہیں،

ہم پردہ کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ وہ ان کی عفت کا سامان ہے، اس مقصد کے لئے تو پردہ کا مطالبہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس کو محض اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ایک مضبوط پناہ گاہ ہے جس میں عورتیں مردوں کے فاسد ارادوں اور ان کے گمراہ کن حملوں سے محفوظ

اور بے خوف رہ سکتی ہیں کیوں کہ ان کو اعتماد ہے کہ ان کی جسمانی ترکیب و ساخت میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ وہ کسی دن یا روزانہ بھی پردۂ عصمت کو چاک کر ڈالیں تو سر بازار رسوا ہو جائیں اسی لئے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ ہر حیلہ و تدبیر اور ہر وسیلے سے عورتوں کو ورغلانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، دنیا کے حوادث کا استقراء کرنے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرد ہی عورت کے اغواء کا سبب ہے، یہاں تک کہ جریدہ "المقتطف" جس نے پردہ کی عمرانی پہلو سے مذمت کی ہے، مرفروری ۱۹۱۰ء کے پرچہ میں اس صریح حقیقت کی شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

"ہر نظام جماعت کی تاریخ گواہ ہے کہ مرد ہی دامن عفت کو چاک کرنے والا اور عورت ہی اپنی عفت وعصمت کی مدافعت کرنے والی ہے"

کیا پردہ عورت کی ترقی کے لئے مانع ہے؟

انسان کی زندگی کے ہر دور میں ہم دیکھتے آرہے ہیں کہ وہ جب کسی چیز سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے حسن و جمال پر ہزاروں دلیلیں پیش کر دیتا ہے اور جب وہ کسی سے نفرت کرنے لگتا ہے تو اس کے قبح و فساد پر دنیا بھر کے براہینوں کو اکٹھا کر دیتا ہے، اگر وجود کے درمیان کوئی شاہد عادل آڑ نہ ہوتا تو حقائق و واقعات اس دنیا میں انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے انسان ہر چیز کی بہ نسبت بے حد جدال پسند اور جھگڑالو واقع ہوا ہے

مصنف "خاتون جدید" کہتا ہے۔

"پردہ کا نقصان یہ ہے کہ وہ عورت کو اس کی فطری آزادی سے محروم کر دیتا، اس کو اس کی نشو ونما اور تربیت کی تکمیل کو نہ سے روک دیتا اور بوقت ضرورت اس کے کسب معاش میں حائل ہو جاتا ہے، نیز اس سے میاں بیوی عقلی وادبی زندگی کی لذت سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں، اُن ماؤں کا وجود اس کو راس نہیں آتا، جو اپنی اولاد کی تربیت پر قدرت رکھتی ہیں، پردہ کی وجہ سے قوم ایک ایسے انسان کی طرح ہو جاتی ہے، جس کا ایک بازو مفلوج ہو گیا ہو"

سابقہ جیسی براہنوں اور دلیلوں کی روشنی میں پردے کے فائدے یہ ہیں کہ وہ عورت کو اس کی حقیقی آزادی عطا کرتا ہے عورت کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ آزادی کیا ہے، پردہ سے عورت اپنے آپ کو تربیت مادری کے لیے آراستہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے، اس کی وجہ سے وہ مردوں کے ساتھ اشتراک عمل سے باز رہتی ہے۔ اسی کے ذریعہ شوہر اور بیوی زندگی کی حقیقی لذت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، اسی کی بدولت اپنی اولاد کی تربیت پر قدرت رکھنے والی مائیں صحیح اسلامی تربیت دے سکتی ہیں اسی کے وسیلہ سے قوم ایک ایسے تندرست انسان کی طرح ہو گی جس کے ظاہری اعضا بھی ہیں اور باطنی بھی۔

مخالفین پردہ کہتے ہیں کہ پردہ میں تین اہم نقصانات ہیں

جو عورت پر نہایت برے اثرات چھوڑتے ہیں"۔

(۱) پردہ عورت کی صحت کو کمزور کر دیتا اور مختلف امراض و آفات کا نشانہ بنا دیتا اور اس کے اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے جب اعصاب کمزور پڑ گئے تو جسمانی قوتوں کا نظام درہم برہم ہو گیا اس بناء پر پردہ نشین عورت لامحالہ اپنی شہوات و خواہشات کی اسیر ہو جائے گی، کیونکہ تندرست اعصاب ہی انسان کے ضبط کے لئے بہترین مددگار ہیں اور ان کے کمزور ہو جانے سے انسان اپنی خواہشات کے ہاتھ میں کھلونا اور شہوات نفسانی کا غلام ہو جاتا ہے،

(۲) پردہ منگنی کرنے والے کو اپنی منگیتر کا چہرہ دیکھنے سے باز رکھتا ہے، یہی بڑا سبب ہے کثرت طلاق اور باہمی مخالفت کا

(۳) پردہ عورت کو تہذیب و شائستگی اور علم و فن حاصل کرنے سے روکتا ہے نیز وہ تعلیمی گھرانوں میں عورت کو عقلی و ادبی قوتوں کے نشو و نما میں اپنے میلانات کی پیروی کرنے سے باز رکھتا ہے۔

ہم مخالفین کے مذکورہ بالا شکوک و شبہات کی اس طرح تردید کرتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ بیمار ہیں اور نہ کمزور اعصاب کی بلکہ وہ مجموعی طور پر بے پردہ عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور تندرست ہیں، اس قضیہ کو ہر مشرقی مجرد نگاہ سے تسلیم کر سکتا ہے، مسلمان عورتوں پر تیرہ سو سال گزر گئے کہ وہ پردہ نشینی میں اپنی عزت و آبرو کو محفوظ کی ہوئی ہیں، اگر محض پردہ ان کے اندر کسی قسم کا ضعف و

اضمحلال رونما کرتا، تو ضروری تھا کہ اس کے مرد اور عورتیں نسلاً بعد نسلٍ موروثی طور پر پاتے، یہاں تک کہ آج مسلمان مرد اور مسلمان عورت کمزوری اور اضمحلالِ قوت کی ضرب المثال بن جاتے، کیونکہ یہ عضویاتی اصول اسی کے متقاضی ہیں، لیکن ہم اس کے برعکس مشاہدہ کر رہے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ پردہ نشین عورتوں کے لڑکے بے پردہ عورتوں کے مردوں سے زیادہ تندرست ہیں، اس کے علاوہ ازروئے صحت مردم شماری سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ مرنے والوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے، اگر پردہ صحت کے لئے مضر ہوتا تو ظاہر ہے کہ مرنے والی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی، حالانکہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے۔

مخالفین کا یہ قول کہ "پردہ نشین عورتیں اپنی خواہشات کی غلام ہوتی ہیں" علمی نفسیاتی نقطۂ نظر پر چسپاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ امر کسی انسان سے پوشیدہ نہیں کہ شہوتوں کا [illegible] میلان انسان میں صرف اسی وقت پایا جاتا ہے، جب کہ وہ محرکات نفسانی میں گرفتار ہو گیا ہو، جب آسانی انسانی عقل اپنے مطلوب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈھ لیتی ہے، تو بے قابو ہو جاتی ہے اب شہوتوں کی جولان گاہ دونوں عورتوں میں سے کون سی ہے؟ پردہ نشین یا بے پردہ؟ اپنے شدید موروثی دینی غیرت کے جذبہ کے ساتھ مردوں کے اختلاط سے بالاتر عورت یا ان سے میل جول رکھنے والی؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دوسری قسم کی عورت ہی شہوتوں کی آماج گاہ بن سکتی ہے؟ نفسیاتی اصول اس حقیقت پر

بہت بڑے شاہد ہیں یہ تصویر کا ایک رخ ہوا۔
دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان کے لئے جب اپنی خواہشات نفسانی تک پہنچنا آسان ہوتا ہے، تو اس کے دل پر اس کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ کہ اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا اور غیرت و حمیت کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کو مثالوں کے ذریعہ سمجھانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے روبرو اس قسم کی بے شمار مثالیں اور شواہد موجود ہیں جو ہمارے اس دعوی پر بین دلیل ہیں۔
جب یہ ثابت ہو گیا تو پردہ نشین عورت ہی شہوتوں کی حرص بہت کم ہیجان رکھتی ہے۔ اور دوسروں کی بہ نسبت یقینی طور پر اس کے دل و دماغ میں جذبات فاسدہ کا گزر بہت کم ہوتا ہے اور مسئلہ تفصیل میں بحث و جدل کی کوئی گنجائش نہیں۔
ضعف اعصاب اور اس کی وجہ سے عقلی قوتوں کے نظام میں عدم توازن کی رو سے دیکھا جائے تو ہیں کہوں گا کہ یہ مشرقی عورتوں کے مقابلہ میں مغربی عورتوں کے نزدیک زیادہ ہے کیونکہ یہ عصبی کمزوری محض پردہ نشینی اور گوشہ گزینی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے بے شمار اسباب ہیں جن میں سے غم و ہم، فکر و تردد، بے جا زیادتی فقر و فاقہ، عشق و ہجر وغیرہ ہیں۔ جو شخص طبی رسالہ کی اوراق گردانی کرے گا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بیماری مغربی عورتوں میں ایک معمولی چیز ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ کسی قوم میں کمزوری اعصاب کے لئے بے شمار علامات ہیں ان میں سب سے اہم کثرت خودکشی ہے چنانچہ یہ روز بروز اور

اس کے علاوہ دیگر محققین جرائم نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان اپنی صحیح عقلی قوتوں کے ہوتے ہوئے ہرگز قتل یا خودکشی کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتا، چونکہ عقلی قوتوں کی درستگی صحت اعصاب کے تابع ہے۔ اس لئے کثرت خودکشی ایک ایسی علامت ہوگی جو ہمیں اس امر کی طرف رہبری کر رہی ہے کہ کس دنیا کی عورتیں عصبی کمزوری میں مبتلا ہیں؟

مجلہ مجلات جلد ۱۱ نے اطالیہ کی سرکاری مردم شماری سے ثابت کیا ہے کہ وہاں ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۲ء تک یعنی دس سال کی مدت میں ۶۹۰ عورتوں نے خودکشی کرلی۔ عین اسی مدت میں فرانس میں ۵۰۲۹ عورتوں کی خودکشی کے واقعات پیش آئے، ان آثار وشواہد کے پیش نظر کیا مشرقی ممالک میں اس قدر خودکشی کے حادثات کبھی دیکھنے میں آتے ہیں؟ لہذا کثرت خودکشی اس امر کی دلیل حسی ہے کہ لامحالہ اس کا سبب نفسانی بزدلی اور ضعف اعصاب ہے۔ اس بناء پر مشرقی عورتیں مغربی عورتوں کے بالمقابل قوی الاعصاب ہیں؟ اور ان کی بہ نسبت اپنے نفس پر قابو رکھنے اور خواہشات پر غلبہ پانے کی قدرت رکھتی ہے۔

مخالفین کا یہ قول کہ پردہ منگیتر کو دیکھنے سے مانع ہے جس کی وجہ سے کثرت طلاق اور گوناگوں شکایات عورتوں پر کی جاتی ہیں صریحاً غلط ہے کیونکہ کثرت طلاق اور مردوں کا عورتوں پر ظلم و ستم مسلمانوں ہی کے ساتھ کچھ مخصوص نہیں بلکہ یہ اکثر و بیشتر ہم سے زیادہ متمدن ملکوں اور تہذیب یافتہ طبقات میں بھی پایا جاتا ہے

باقی رہا مخالفین کا یہ دعویٰ کہ پردہ عورت کو تہذیب و تعلیم حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ لڑکی ساتویں سال کی عمر سے بارھویں سال تک مدارس میں جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی عقل کو تہذیب و شائستگی کا ایک پاکیزہ درجہ حاصل کرنے کے لئے یہ پانچ برس کافی ہیں، امت کے غیور افراد کے لئے یہ امر مانع نہیں کہ وہ فوقانیہ مدارس ایجاد کریں، جن میں تمام معلمات عورتیں ہی ہوں، لڑکیاں بغیر نقاب کے اندرون رہیں، اور جب مدرسہ سے باہر نکلیں تو اپنے چہرے پر نقاب اوڑھ لیں، اور گھر جا کر اتار دیں، اگر وہ مدارس فوقانیہ یا اونچے طبقوں کی تعلیم کے لئے معلمات کے فقدان کا عذر کریں تو یہ بہانہ سازی میں شمار ہوگا، کیونکہ کوئی چیز خلوص نیت سے کی جاتی ہے تو اس کے لئے ہمتیں اور عزائم بھی پختہ و بیدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایک فضول سی بات ہے کہ ہم کسی کام کو وقت واحد ہی میں شروع کر دیں، ہر کام آہستہ آہستہ انجام پاتا ہے، پہلے چھوٹے پیمانے پر کیا جاتا ہے وہی رفتہ رفتہ نشو و نما پا کر درجۂ کمال و تمام تک پہنچ جاتا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو یہ کہنا بہت آسان ہے کہ پردہ نہ تو صحت کے لئے ضرر رساں ہے نہ اعصاب کو کمزور کرنے والا، بلکہ یہ ایک مادی ڈھال ہے جو اکثر برائیوں اور برے ارادوں کے حملوں کی روک تھام کرتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ پردہ پر علم و ادب کے نقش و نگار بھی کر دئے جائیں تو انسانی سوسائٹی کی

بہت سی خرابیوں کو دور کردے گا، جو اس مادی تمدن کے جسم پر
ایک مہلک زخم کی صورت میں نمودار ہو رہی ہیں۔

مسلمان عورت کا مقام تاریخ اسلام میں

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ قوموں کی ترقی اور ان کے
تغیر و تبدل میں عورتوں کو بڑا دخل ہے، اسی لئے مردوں نے ادبی
و مادی انقلابات کے پیش نظر، جو گزشتہ صدیوں میں رونما ہوئے
رفتہ رفتہ اپنی جنس لطیف اور صنف نازک کے مابین حقوق و مساوات
عطا کرنے کا ارادہ کیا،

سب سے بڑھ کر ادبی و اخلاقی انقلاب عرب قوم کی تاریخ
میں ظہور پذیر ہوا، یہ سبھی جانتے ہیں کہ عربوں نے جب اوج عظمت
تک رسائی حاصل کی اور سیف و قلم کی اقلیموں کے مالک بن گئے
تو عورت ان کے نزدیک مرد کے مساوی تھی، اس کے لئے وہی
مرتبہ و احترام تھا، جو مرد کو حاصل تھا، لیکن اس کے بعد ظالم حاکموں
کی زیادتی اور غیروں کی مداخلت کی وجہ سے حالات و عادات
میں بگاڑ پیدا ہوگیا، اس کا نتیجہ ہوا کہ شریف اور آزاد عربی عورت
تو زوال پذیر ہوگئی، اس کے بجائے ادنیٰ طبقہ کی اور ہلکی طبیعت
کی عورتیں جو عربی عنصر سے بیگانہ تھیں آگئیں۔ مثال کے طور پر
بیزنطینی و ایرانی کم مرتبہ عورتیں اور روم و صقالبہ کی لونڈیاں
پیش کی جاسکتی ہیں، ان کا اثر یہاں تک ہوا کہ خاندانی اور گھریلو
زندگی کے نظام میں ابتری پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد سے زیب و زینت کا

مظاہرہ ہونے لگا، عیش و عشرت کے جراثیم پھیل گئے اور اسراف و تکلفات کی نمائش ہونے لگی،

پہلے عربی عورت کی بڑی شان و منزلت تھی، شہر میں وہ حکمراں تھی تو گھر اور خاندان کی ملکہ سیاسی و عدالتی امور میں بھی حصہ لیا کرتی تھی۔

حارث بن عوف کی عورت کو کون نہیں جانتا، جس نے دو قبیلوں کے مابین سمجھوتہ کرایا، حالانکہ ان دونوں نے خون ریزی اور تباہی و بربادی کی نذر کر لی تھی؟ پھر اس کے بعد کون ہے جو یہ دیکھ کر حسرت و افسوس نہ کرتا ہو کہ اس زرین دور کے خاتمہ کے بعد سے ایسے حالات رونما ہوئے جو ایتھنس اور اسپارٹا کے واقعات کے مشابہ تھے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و احکام سے مرد و عورت کی مساوات اور ان کے حقوق کے بارے میں روشنی پڑتی ہے، چنانچہ عالم عربی میں کچھ سو سال تک مردوں اور عورتوں کے درمیان گاڑھا پردہ نہ تھا، بعض فاضلہ اور عظیم المرتبت خواتین علم و ادب کی مجلسیں اور مناظرہ و مکالمہ کی محفلیں منعقد کیا کرتی، ادیبوں اور عالموں کے درمیان فیصلہ صادر کیا کرتی تھیں، جب کبھی جنگ کا سلسلہ چھڑ جاتا تو گھر سے باہر نکل کر مردوں کی ہمتوں کو تیز کرتی، ان کی غیرت و حمیت کو بھڑکاتی، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی اور بہادروں کی ستائش کیا کرتی تھیں،

اسلامی عورت کی بدولت اسلام نے رفتہ رفتہ کامیابی کی

منزل طے کی، سیدہ خدیجہؓ پہلی خاتون ہیں، جنھوں نے ابتدا، نزول وحی کے وقت دلجوئی و تسکین بخشی، آپ ہیں جنھوں نے آنحضرتؐ کی جدوجہد میں حصہ لیا اور اور مال و دولت سے آپ کی اعانت فرمائی۔ پیام حیات ۲۲۲

اگر عیسائیوں کو سیدہ مریم پر فخر ہے، تو مسلمان آنحضرتؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ پر ناز کرتے ہیں، جب آنحضرتؐ کی زندگی میں آپ کے تینوں صاحبزادے انتقال کر گئے، تو آپ نے اپنی شفقت و محبت کے دھاروں کا رخ سیدہ فاطمہؓ کی طرف پھیر دیا، ان کو ادب و اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا، چنانچہ یہ علم و عرفان اور فضل و شرف کی ایک درخشاں نشانی بن گئیں، سولہ سال کی عمر میں علی بن ابی طالب سے ان کا عقد ہوا، جن سے حسن و حسین جیسی قدر روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔

سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کا یہ کارنامہ بہت مشہور ہے کہ آپ گھر کے کام کاج میں کچھ بھی کوتاہی نہ کرتی تھیں جب اس سے فارغ ہوتیں اور اپنے فرائض ادا کر دیتیں تو عورتوں کو تعلیم کرتیں اور ان کے روبرو نصیحتوں اور حکمتوں کے موتی بکھیرا کرتیں، آپ سے اقوال و آثار مروی ہیں، جو عورت کے احترام اور اس کی شان و منزلت کو دوبالا کرتے ہیں۔

حسین کی صاحبزادی سکینہ اپنے زمانے میں علم و ادب کی ایک روشن نشانی تھیں، ان کا گھر ادیبوں اور عالموں کی زیارت گاہ تھا ان کا اثر و رسوخ عورتوں تک سرایت کر گیا تھا، وہ لباس پوشاک

ں و حرکت میں ان ہی کی تقلید کیا کرتی تھیں۔

سکینہ کو شعر، ادب اور حکمت و فلسفہ سے گہرا شغف تھا وہ شاعری پر صحیح تنقید کرنے اور شاعروں پر جود و کرم کرنے میں مشہور رہیں۔

خیزران، خلیفہ ابن عباس مہدی سوم کی بیوی اُن یگانۂ روزگار عربی خواتین میں شمار کی جاتی ہے، جو علم و دانش اور عقل و فراست میں مشہور رہیں۔ محل اور سلطنت میں یہی حکمراں تھی ہر دو جگہ اسی کے اوامر و نواہی نافذ تھے عقل و شجاعت اور فہم و فراست میں عجوبہ زمانہ تھی، اس کے دروازے پر علماء و شعراء ہاتھ باندھے کھڑے رہا کرتے تھے، اسی پاکباز نیک دل خاتون کی بدولت مہدی نے وہ جائدادیں امویوں کے حوالے کر دیں، جن کو عباسیوں نے جرمانہ میں لے لیا تھا۔

زبیدہ ہارون الرشید کی بیوی سے روئے زمین کا کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہے، یہی وہ خاتون ہے جس نے تشنگان مکہ کی پیاس بجھانے کی خاطر ایک نہر کے ذریعہ وادی مکہ کو سیراب کر دیا، جو عین زبیدہ کے نام سے مشہور ہے، اسی نے اسکندریہ کو جسے بیزنطیوں نے مسمار کر دیا تھا، از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا، بہترین شعر کہا کرتی تھی، سیاست اور میدان جنگ میں اپنے صحیح آراء و خیالات کا اظہار کیا کرتی تھی۔

بوران مشہور خلیفہ عباسی مامون کی بیوی کا کوئی ایرانی عورت مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ یہ مسلم خاتون ہے جس میں

ایرانی فہم و فراست اور اسلامی فضیلت و کرامت جمع تھی، ذہن و ذکاء میں مشہور ہے، اس نے بغداد میں مدرسے اور شفاخانے قائم کئے۔

قطر الندی معتضد باللہ کی بیوی اور مکتفی کی ماں نامور خواتین اسلام میں بہت مشہور ہے، شرعی قوانین اور اصول قضاء سے بہت باخبر تھی۔ اس کے لڑکے کی بلوغت سے پیشتر اسی نے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور بذات خود لوگوں میں فیصلے اور احکام صادر کرتی تھی، اس کے ارد گرد بے شمار شاعرات اور شاعروں ادیبوں اور ادیبات کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

شجرۃ الدر نجم الدین ایوب کی بیوی نے بذات خود شاہ فرنیس سان لویس کے ساتھ جنگ کی، لوگوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہی مصر کی ملکہ ہے،

جب ہم اندلس کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عورت یہاں اوج عظمت پر پہنچ چکی تھی اور قدر و منزلت کی بلند چوٹی تک پہنچ گئی تھی، وان کرومر اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ :-

"عرب فطرۃً قرطبہ میں عورتوں کا احترام کیا کرتے تھے یہاں سے ہی اہل یورپ نے اپنی بیگمات کا احترام کرنا سیکھا"

عبدالرحمٰن الداخل نے اپنے محل کے دروازے پر اپنی بیوی کا شاندار مجسمہ نصب کرایا اور اس کی نیکی و احسان کی یادگار کے لئے

ایک محکم قصر کی تعمیر کرائی۔

سرزمین اندلس میں مسلمان طالبات علم کی تعداد بکثرت تھی، یہ عورتیں قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، ملقہ اور مرسیہ وغیرہ کی جامعہ مسجدوں میں مردوں کے ساتھ نماز پڑھا کرتی تھیں،

امیر سلیم شہنشاہ جہانگیر جب اپنے والد سلطان محمد اکبر کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس نے سیدہ مہرالنساء سے شادی کی، یہ خاتون عربی اور فارسی زبان میں ماہر اور دونوں زبانوں کی ادبیات پر کافی عبور رکھتی تھی، اس کو علم موسیقی میں بھی وسیع معلومات تھیں، اس کا شوہر اس کو از روئے محبت نور محل سے اور عوام نور جہاں سے پکارا کرتے تھے، نور جہاں مفید مشورے دیا کرتی، فوج کی تنظیم کرتی اور امیروں اور حاکموں کا استقبال کیا کرتی تھی، سلطنت میں بادشاہ اور ملکہ کے نام کا سکہ رائج تھا، گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ شکار اور تفریح کو جایا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ جہانگیر کسی جنگ کے سلسلہ میں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، تو اس نے فوج کی ہراول بن کر اس کو دشمنوں کے پنجے سے رہائی دلائی۔ اس سے بڑھ کر اس کی نیکیاں مشہور ہیں، وہ یتیم بچوں اور بچیوں کی پرورش کرتی ان کی شادی بیاہ کا انتظام کرتی، مظلوم کی داد خواہی مسکینوں کی غم خواری کیا کرتی تھی، ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں اس کا نام نہ لیا جاتا اور اس کا نام نہ رکھا جاتا ہو،

مورخین کو عربوں کے ارتقائی زینے عورت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملتے جلتے نظر آتے ہیں، عورت کے دور انحطاط میں یہ پیش قدمی موقوف ہوگئی، اور حالت ایام جاہلیت کی طرف عود کرگئی،

اگر مسلمان آج بھی اپنی عظمت دیرینہ کو حاصل کرنا اور اپنی تاریخ کے زریں باب کو پھر درخشاں دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ مسلمان عورت کو وہ مقام اور وہ مرتبہ عطا کریں جو اوائل اسلام میں حاصل تھا ——— !!

مرد اور عورت میں مساوات حقوق

جس شخص نے قرآنی تعلیمات اور ارشادات نبوی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور پھر دیگر مذاہب و اقوام کے ایک ایک قانون کو جانچا ہے وہ معلوم کرسکتا ہے کہ مذہب اسلام نے عورتوں کی معاشرت کو کس قدر بلند کردیا اور مرد و عورت دونوں کے لئے کیا موزوں درجۂ مساوات عطا کیا ہے، قرآن مجید نے مساوات حقوق کا بار بار اعلان کیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ ۲۰)
عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ
وہ عورتیں تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

اور جہاں کہیں بھی قرآن پاک میں مرد و عورت کے آپس کے تعلقات و معاملات کا ذکر ہے وہاں اکثر مردوں ہی کو عورتوں کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

مرد کو عورت کا مہر ادا کرنے کا حکم دیتا ہے تو بھی نیکی کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے۔

وَآتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	بھلائی کے ساتھ عورتوں کا مہر ادا کرو۔

اگر مرد عورت کو طلاق دینا چاہتا ہے تو اس کو بھلائی اور نیکی کے ساتھ طلاق دینی چاہیئے۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ	تو ان کو بھلائی کے ساتھ رکھو یا بھلائی
اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ	کے ساتھ چھوڑ دو اور ان کو نقصان
وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا	پہنچانے کے لئے نہ روکو تاکہ تم
لِتَعْتَدُوْا ۔	زیادتی کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :۔

وَلَا تُضَارُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا	اور تنگ کرنے کی غرض سے ان کو
عَلَيْهِنَّ ۔	دق نہ کرو۔

طلاق دینے کے بعد عورت کو دیا ہوا مال مرد کو واپس نہ لینا چاہیئے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ	اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری
زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّآتَيْتُمْ	بیوی بدلنا چاہو اور ان میں سے

اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ط اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔

کسی کو ڈھیروں مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو، کیا تم اس کو جھوٹا الزام لگا کر اور کھلا گناہ کر کے لینا چاہتے ہو اور تم اس کو کس طرح لیتے ہو، حالانکہ تم آپس میں ایک دوسرے سے بے حجاب ہو چکے ہو اور وہ عورتیں تم سے پکا عہد لے چکی ہیں۔

اگر مرد عورت کو خلوت صحیحہ کے قبل ہی طلاق دے دے تو شریعت اسلامیہ کے مطابق آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے لیکن اس صورت میں بھی مرد کو پورا مہر ادا کرنے کی ترغیب دلائی جاتی ہے اگرچہ یہ فرض نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔

اور یہ تم (مرد) معاف کرو (پورا دیدو) پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اپنے درمیان بڑائی کو نہ بھولو۔

اسی قسم کی سینکڑوں آیتیں ہیں۔ جو ہر طرح سے عورت کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔

آنحضرت صلعم نے بھی مختلف نصیحتوں سے مردوں کو عورتوں پر ظلم کرنے سے روکا ہے اور اس صنف نازک کی بہت بڑی دلجوئی کی ہے، صحیح مسلم میں ہے الدنیا متاع وخیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین

متاع نیک بخت عورت ہے' اسی قسم کے دیگر ارشادات سے
کتب احادیث بھرے پڑے ہیں'

اب ہم مرد و عورت کے حقوق پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں' تاکہ یہ معلوم ہو کہ اسلام نے کہاں تک دونوں کے حقوق میں تناسب قائم رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب و اقوام کے قوانین بھی دکھائے جائیں گے تاکہ شریعت اسلامیہ کی فضیلت و برتری کا ایک صحیح اندازہ قائم ہو سکے۔

۱۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص اپنی جان و مال کا آپ مالک ہے' اپنا آپ مختار اور اپنا آپ آقا ہے' ایک دوسرے کا غلام نہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں' اسلام نے یہی اصول عورتوں کے متعلق برتا ہے اور اس کو یہی کرنا چاہئے تھا اور یہی کیا ہے جس طرح اس نے مرد کو خود مختار اور آزاد قرار دیا ہے اسی طرح عورت کو بھی آزاد و خود مختار قرار دیا ہے' لیکن ہندو مذہب کے مطابق عورت خود مختار نہیں۔

"عورت نابالغ ہو یا جوان یا بڑھی ہو' گھر میں کوئی کام خود مختاری سے نہ کرے" (منوسمرتی)

"عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں رہے اور جوانی میں اپنے شوہر کے اختیار میں اور بعد وفات شوہر اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے' خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے" (منوسمرتی)

یونان و روم میں بھی عورتوں کی حیثیت ایک غلام کی

حیثیت سے زیادہ نہ تھی :-

"یہ بحیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا، اس کی زندگی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی، لڑکپن میں اپنے والدین کی جوانی میں اپنے شوہر کی اور بیوگی میں اپنے فرزندوں کی وراثت میں ہوتی اس کے مقابلے میں اس کے مرد کے اعزہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا، طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا، تاہم عملاً وہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھی کیونکہ عدالت میں اس کا اظہار کرنا یونانی ناموس و حیا کے منافی تھا، البتہ وہ اپنے ساتھ جہیز ضرور لاتی تھی اور اپنی لڑکیوں کو بھی شادی کے وقت جہیز دینا اس کے فرائض میں داخل تھا، دوسری بات یہ بھی تھی کہ اثینا کا قانون یتیم لڑکیوں پر خاص طور سے مہربان تھا، لیکن بس ان دونوں باتوں کے سوا اور کوئی شے حقوق نسواں کی تائید میں نہیں پیش کی جا سکتی، فلاطون نے بے شبہ مرد و عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔" (تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم ص۱۸۱)

عورت کا مرتبہ رومی قانون نے البتہ ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا، افسر خاندان کہ جو باپ

ہوتا یا شوہر اسے اپنی بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا، جہیز یا دُلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے بلکہ بعض دفعہ وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا، زمانہ مابعد یعنے دورِ تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہو گیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی تک کو قتل کر سکتا ہے۔ ۵۲۰ سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہیں سنا" (ایضاً ص ۱۹۰)

عرب میں سوتیلی مائیں بیٹوں کی وراثت میں آتی تھیں اور ان کی محکوم ہو کر رہتی تھیں اور قاعدہ تھا کہ بیٹا جس سوتیلی ماں پر اپنی چادر ڈال دیتا وہ اس کی بیوی بن جاتی، اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا اور صریحاً اس کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا

اور جن عورتوں کو تمہارے باپ باپ دادا اپنے نکاح میں لائیں ان کو اپنے نکاح میں نہ لاؤ کیونکہ یہ بری بات ہے اور غضب کا کام ہے اور برا طریقہ ہے۔

۲۔ نکاح کے معاملہ میں طرفین کو پوری آزادی دے دینی چاہیئے، تاکہ طرفین جس کو چاہیں اپنے لئے انتخاب کر سکیں۔ انتخاب کا اختیار غیر کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ یہ وہ رشتہ ہے جو مرتے دم تک قائم رہنے والا ہے اور جب ایک دوسرے کی دلی خواہش اور پسند کے مطابق نکاح نہ ہو تو ہمیشہ کے لئے زندگی مرد و عورت پر وبال جان بن جاتی ہے، میاں بیوی میں سچی محبت پیدا نہیں ہوتی اور دونوں نااتفاقی اور آئے دن کے جھگڑے اور فسادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے خانگی نظام بگڑ جاتا ہے اور اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہوتی، ہندو مذہب نے مرد کو تو عورت کے انتخاب کا اختیار دیا ہے لیکن بیچاری غریب عورت اس اختیار سے محروم ہے۔

"باپ جس کے ساتھ شادی کر دے یا باپ کے حکم سے بھائی جس کے ساتھ شادی کر دے اس کی خدمت میں رہے اور بعد وفات شوہر کسی غیر مرد سے صحبت نہ کرے (منوسمرتی)

یونانیوں اور رومیوں کا قانون بھی قریب قریب یہی تھا عرب میں اس کے لئے کوئی خاص قانون نہیں تھا، بسا اوقات والی و وارث یا قریبی رشتہ دار نکاح کو روک دیتے تھے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے واقعات ایسے پیش آئے ہیں، معقل بن یسار کی ایک بہن تھیں، جن کو

ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی اس کے بعد اُنھوں نے ایک دوسرے سے شادی کی، دوسرے شوہر نے بھی طلاق دے دی، تو پہلے شوہر نے ان کی بہن سے نکاح کرنا چاہا اور معقل بن یسار کی بہن بھی اس پر راضی تھیں لیکن معقل نے اس نکاح کو روک دیا، فوراً یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ — عورتوں کو اپنے پہلے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔

اگر کوئی قریبی رشتہ دار کسی نابالغ بیوہ کا اس کی اجازت کے بغیر کسی مرد سے نکاح کر دیتا تھا تو بالغ ہونے کے بعد عورت کو نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں تھا اور اگر کسی دور کے رشتہ دار نے اس عورت کا نکاح کیا تھا تو اس کو فسخ کا اختیار دیا جاتا تھا۔

مذہب اسلام نے مرد عورت کو نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی دی ہے، کسی والی و وارث کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر کسی مرد سے اس کا نکاح کرے، نکاح کے انعقاد کے لئے مرد و عورت کی رضامندی شرط ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

لَا تُنْكَحُ الْاَيِّمُ حَتّٰى تُسْتَاْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَاْذَنَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ اِذْنُهَا قَالَ اَنْ تَسْكُتَ

بیوہ عورت کے حکم کے بغیر اس کا نکاح نہیں کیا جا سکتا اور نا کتخدا لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کی جا سکتی لوگوں نے کہا یا رسول اللہ اس کی اجازت کیونکر ہو گی فرمایا کہ اس کی اجازت

یہی ہے کہ وہ خاموش رہ جائے۔

اگر کبھی عورت کی رضامندی کے بغیر شادی ہوئی تو آپ نے اس نکاح کو توڑ دیا ہے، چنانچہ خذام انصاری نے اپنی لڑکی خنساءؓ کا اس کی اجازت کے بغیر نکاح کر دیا تھا، خنساء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور واقعہ بیان کیا، آپ نے اس نکاح کو باطل قرار دے دیا،

۳۔ نکاح ہونے سے پہلے مرد و عورت کو حکم ہے کہ ایک دوسرے کو ایک دفعہ دیکھ لیں تاکہ آیندہ انھیں دھوکا نہ ہو، ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے مقابلہ میں کورٹ شپ کی رسم کو پیش کرکے کہے کہ اسلامی قانون سے بہتر کورٹ شپ کی رسم ہے کیونکہ موخر الذکر صورت میں مرد و عورت کو کافی وقت ملتا ہے کہ ایک دوسرے کے اخلاق و عادات کو اچھی طرح سے جانچ لیں، لیکن یہ صرف دھوکا ہی دھوکہ ہے، سب جانتے ہیں کہ خواہشات نفسانی کا بندہ ہمیشہ اپنا مقصد و مطلوب حاصل ہونے تک ہی غیروں سے نہایت محبت اور حسن اخلاق سے پیش آتا ہے اور جب اپنا کام نکل جاتا ہے تو وہ حسنِ اخلاق وغیرہ کو بالائے طاق اٹھا کر رکھ دیتا ہے، اس صورت میں اگر مرد عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہیں تو شادی ہونے تک ہمیشہ عورت کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے گا، ایک بدسیرت عورت بھی اگر مرد کو اپنے دامِ گیسو میں پھانس لینا چاہتی ہے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے تک مرد کو خوش

رکھنے کی کوشش کرے گی، اور نرمی و محبت اور حسن اخلاق سے پیش آئے گی، ایسی حالت میں دونوں کی سیرت کا کہاں پتہ چلے گا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بد سیرت سے بد سیرت مرد و عورت بھی شادی ہوتے ہی ان میں نا اتفاقی نہیں واقع ہوتی ہے بلکہ ایک مدت کے بعد جب کہ دونوں کے شہواتی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں نا چاقی واقع ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سیرت کا اندازہ کرنے کے لئے ہر ایک کی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالی جائے کیونکہ گزشتہ زندگی ان کی سچی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے اور یہ مرد و عورت کے ساتھ رات دن اٹھنے بیٹھنے والوں سے معلوم ہوتا ہے، ایسی حالت میں کورٹ شپ صرف ایک سراب ہے، جس کی کچھ حقیقت نہیں، بلکہ اس سے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہے، کتنے ایسے ہیں جو نکاح سے پہلے کورٹ شپ کے زمانہ ہی میں خلوت صحیحہ اختیار کر لیتے ہیں، کوئی شخص نادر ہی ایسا نکلے گا کہ جو کورٹ شپ کے زمانہ میں پورے ضبط سے کام لیتا ہو،

۴۔ ہندو مذہب کے مطابق عورت شوہر کی ملک ہے، اس کی جو کچھ ملکیت و جائداد ہے وہ سب مرد کے قبضہ میں چلی جاتی ہے، یہودیوں کے قانون کے مطابق مہر کے علاوہ اور کوئی چیز عورت کی ملکیت میں نہیں رہتی یہاں تک کہ شوہر کی وفات کے بعد یا طلاق کے بعد عورت مہر کے علاوہ کسی اور چیز کا دعویٰ نہیں کر سکتی یونانیوں اور رومیوں کا بھی یہی قانون تھا بلکہ اوپر گزر چکا ہے کہ شوہر عورت کی جان تک کا مالک تھا مگر اسلام نے اس معاملہ میں

بھی پورے انصاف سے کام لیا ہے، عورت کا مال عورت ہی کے قبضہ میں رہے گا، مرد کو اس پر تصرف کرنے کا کچھ حق نہیں، اگر عورت اپنی خوشی سے مرد کو اپنے مال میں سے کچھ دے تو مرد لے سکتا ہے چنانچہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا

پھر اگر وہ عورتیں اپنی خوش دلی سے اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو اس کو کھاؤ اچھا پچتا۔

اسلام نے حسن معاشرت کے معاملہ میں طرفین کا پورا لحاظ رکھا ہے ایک طرف مرد کو یہ سکھاتا ہے کہ عورت کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک سے پیش آؤ، اس کو اپنی ایک بہترین رفیقۂ حیات سمجھو اور اگر تمھاری نافرمانی کرے تو اس کو سمجھاؤ، اگر اس پر بھی نہ مانے تو اپنی خواب گاہ سے اس کو الگ کردو اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ضربِ خفیف سے کام لو، ضرب شدید کی سخت ممانعت ہے، دوسری طرف عورت کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ مرد کی اطاعت اور فرماں برداری کرے، اپنی عصمت و عفت کی پوری حفاظت کرے اور مرد کے مال میں سے ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرے، یہی وہ پاکیزہ اخلاقی تعلیم ہے جس نے مشرقی مسلمانوں کے خانگی نظام میں خلل نہ آنے دیا اور مرد و عورت میں سچی محبت پیدا کی اور حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھایا۔

۵ - سب سے بڑی چیز جس نے عورت کو مرد کے پنجوں سے آزادی دلائی وہ حقِ خلع ہے، تمام مذاہب دا قوام صرف مرد ہی کو

طلاق کا حق دیتی ہیں، عورت کو آزادی حاصل کرنے کی انھوں نے کوئی ترکیب نہیں بتائی، ہندو مذہب تو یہ کہتا ہے کہ :-

"اگرچہ شوہر بے مروت ہو اور دوسری عورت کے ساتھ محبت رکھتا ہو یا بے ہنر ہو تو بھی بت برتا استری ہمیشہ اس کو سیوا دیریوں کی طرح کرے"
(منوسمرتی)

موسوی قانون کے مطابق طلاق صرف مرد ہی کو حاصل ہے توراۃ میں ہے :-

"اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کے اس سے بیاہ کرے اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو، اس سبب سے کہ اس نے اس میں کچھ پلید بات پائی تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ دے اور اسے اپنے گھر کے باہر کرے اور جب وہ اس گھر سے نکل گئی تو جا کے دوسرے مرد کی ہو پر اگر دوسرا شوہر بھی اس سے ناخوش ہو جائے اور اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ میں دے اور اپنے گھر سے نکال دے یا اگر دوسرا شوہر لے جورو کر کے مر جائے تو روا نہیں کہ اس کا پہلا شوہر جس نے اسے نکال دیا تھا، اسے پھر لے اور بعد اس کے کہ وہ ناپاک ہو چکی اُسے پھر اپنی جورو کرے، کیونکہ وہ خداوند کے حضور نفرتی کام ہے" (استثنا باب ۲۴)

یہودیوں کے نزدیک مرد کسی سبب کے بغیر بھی عورت کو طلاق دے سکتا ہے، کوئی چیز عورت کے طلاق دینے سے مانع نہیں، چوں کہ ان کے نزدیک بقاء نوع انسانی کے لئے بہت سے نکاح کرنا ہر شخص پر واجب ہے، ورنہ وہ لعنت کا مستحق ہوگا، اس لئے اگر کسی عورت کو دس سال تک بچہ نہ پیدا ہو تو مرد پر واجب ہو جاتا ہے کہ عورت کو طلاق دے کر دوسری سے شادی کرے، عورت کو یہ جائز نہیں کہ مرد سے کسی سبب کے ہوتے ہوئے بھی طلاق طلب کرے، چنانچہ فتاوی ہرشبا (یہودیوں کی مستند کتاب) میں ہے :-

"عورت کے لئے جائز نہیں کہ مرد سے طلاق طلب کرے اگرچہ شوہر میں بے انتہا عیوب ہی کیوں نہ ہوں"

(فصل ۴۰۶)

مذہب عیسوی میں طلاق تو سرے سے ہے ہی نہیں اگر کوئی مرد و عورت اپنے رفیق حیات کو طلاق دے کر دوسرے سے نکاح کرے تو وہ انجیل کے حکم کے مطابق زانی قرار پاتا ہے۔

عرب میں عورتوں کو مردوں سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہیں تھی، ایک ایک مرد کے ماتحت کئی کئی عورتیں ہوتی تھیں، مرد ان پر ہزاروں ظلم کرے اور حق زوجیت ادا نہ کرے، پھر بھی عورت کی آزادی کی کوئی سبیل نہ تھی۔ جاہلیت میں رواج تھا کہ شوہر بدنامی کے خیال سے یا شرارت سے نہ تو کامل طلاق دیتا تھا اور نہ حق زوجیت ادا کرتا تھا، قرآن مجید نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے :-

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (نساء)

اپنی بیویوں کے درمیان اپنی پوری خواہش کے باوجود تم عدل نہیں قائم رکھ سکتے، اس لئے ایسا نہ کرو ایک طرف بالکل جھک جاؤ اور دوسری کو گویا معلقہ کردو،

مذہب اسلام نے اگر ایک طرف مرد کو طلاق کا حق دیا تو دوسری طرف عورت کو بھی حق خلع عنایت کیا اور دونوں کے حقوق برابر برابر کردئے، یہاں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے طلاق و خلع کی صورت صرف مجبوری کی حالت میں جائز قرار دی ہے، اگر میاں بیوی کے درمیان نااتفاقی کی خلیج حائل ہو جائے تو اسلام فوراً مرد کو طلاق دے دینے یا عورت کو مرد سے طلاق طلب کرنے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ ہر ممکن طریقہ سے میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے، اگر کسی طرح سے صلح نہ ہو سکے تو اس صورت میں طلاق کی اجازت دی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

ابغض الحلال عند الله الطلاق

خدا کے نزدیک مبغوض حلال طلاق ہے۔

قدیم اسلامی طرز معاشرت کو سامنے رکھ کر موجودہ مغربی طرز معاشرت کا معائنہ کرو تو صاف طور پر نظر آئے گا کہ اول الذکر معاشرت میں ازدواجی رشتۂ محبت کا ایک غیر فانی رشتہ ہے جس کو نااتفاقی کی آندھیاں بھی آسانی سے نہیں توڑ سکتیں، لیکن موجودہ

مغربی طرز معاشرت میں نکاح وازدواج ایک بچوں کا کھیل ہے، جس کو ایک لمحہ کے اندر بنایا اور ایک لحظہ کے اندر بگاڑا۔ مغرب نے عورت کو اپنا خدا بنایا اور اس کو اتنی آزادی دی کہ معمولی سی بات پر عدالت میں طلاق کا دعویٰ دائر کر دیتی ہے، اسی لئے آج مغربیوں کو وہ چین اور اطمینان نصیب نہیں جو مشرقیوں کو نصیب ہے،

۶۔ مذہب اسلام کے علاوہ اور کسی نے عورت کو وراثت میں حصہ نہیں دیا، ہندوؤں کا قانون یہ ہے کہ :۔

"جب تک پر پوتے تک کوئی اولاد از قسم ذکور موجود ہو بیٹی وارث نہیں ہو سکتی، کیونکہ جملہ آریہ قوموں میں اولاد ذکور کو اناث پر ترجیح حاصل ہے"

(دھرم شاستر ۱/۲)

یہودیوں کا قانون وراثت کہتا ہے :۔

"اگر کسی میت کے لڑکا نہ ہو تو وراثت پوتے کے لئے ہے اور اگر پوتا بھی نہ ہو تو اس صورت میں وراثت بیٹی (میت کی بیٹی) کی ہوگی اور اگر بیٹی بھی نہ ہو تو بیٹی کی اولاد وراثت کی مالک ہوگی"

(حوش احکام الارث والتقیہ)

اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی کا درجہ پوتوں کے بعد آتا ہے۔

یونان وروم کے قانون کے مطابق میت جس شخص کو خاندان کا سردار مقرر کرتا تھا، وہی اس کی تمام جائداد کا مالک قرار پاتا تھا

موصیٰ لہ کو پورا اختیار حاصل تھا کہ وہ جس طرح چاہے اس کی جائداد کو کام میں لائے، میت کے اولاد کی شادی کرنا یا نہ کرنا موصیٰ لہ کی مرضی پر موقوف تھا، گو مختلف زمانوں میں اس قانون میں ردو بدل ہوتا رہا، لیکن کسی زمانہ میں بھی عورت کو مرد کی برابری حاصل نہیں ہوئی، ہمیشہ عورت کا درجہ مرد کے بعد رہا۔

عرب زیادہ تر میراث اور دیگر معاملات میں اگلی قوموں کی پیروی کرتے تھے، اسی لئے وہ عورتوں کو میراث میں کسی قسم کا حصہ نہیں دیتے تھے علاوہ ازیں ان کا ایک نظریہ یہ تھا کہ مرد ہی اپنی قوت و طاقت کے زور سے پورے خاندان کی حفاظت کرسکتا ہے اور مصیبتوں پر ثابت قدم رہ سکتا ہے، اس لئے میت کا پورا مال مرد کو ملنا چاہیئے عورت کا اس میں کوئی حصہ نہیں،

لیکن مذہب اسلام نے ان تمام کے مقابلہ میں میراث کا ایک ایسا قانون پیدا کیا، جس کی برابری کا دعویٰ دنیا کا کوئی قانون نہیں کرسکتا۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ :۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (نساء)	ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں تھوڑا ہو یا بہت مردوں کا حصہ ہے اور ایسا ہی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے اور یہ حصہ ہمارا ٹھہرایا ہوا ہے ۔

اس کے بعد اس نے ہر ایک مرد اور عورت کے حصے مقرر کر دئے، اس نے مرد و عورت کے حصوں میں کسی قدر کمی بیشی کی ہے چنانچہ کسی میت کے لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو ان میں سے ہر ایک لڑکا لڑکی کا دگنا حصہ پائے گا اور اگر میت کے لڑکے اور لڑکیاں اور ماں باپ ہوں تو اس صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر میت کی اولاد ہو تو ماں کو ثلث ملے گا اور باپ عصبہ قرار پائے گا، اس کمی بیشی سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے عورت کا درجہ مرد کے درجے سے بھی کم قرار دیا ہے بلکہ میراث کا یہ قانون اقتصادی نظام پر مبنی ہے، چوں کہ اسلامی نظام کے مطابق گھر کے انتظام کی ساری ذمہ داریاں مرد پر عاید ہوتی ہیں اور اہل و عیال اور بال بچوں کا کھانا کپڑا اور ان کے تمام خرچ کا ذمہ دار مرد ہے۔ اس لئے مرد کو زیادہ حصہ دیا اور عقل بھی یہی فتویٰ دیتی ہے کہ جس کا خرچ زیادہ ہو اس کو زیادہ دیا جائے اور جس کا کم ہو اس کو کم،

مذکورہ بالا چند قوانین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا ہو گا کہ مذہب اسلام نے عورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، اگر اسی طرح مرد و عورت کے حقوق کی تمام جزئیات پر نظر ڈالیں گے اور دیگر اقوام کے قوانین کے ساتھ موازنہ کرتے جائیں گے تو ہر حال میں مذہب اسلام کی برتری اور فضیلت نمایاں رہے گی

تمام احکام اوامر و نواہی میں اسلام نے مرد و عورت دونوں کو برابر قرار دیا ہے جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ حج وغیرہ مرد پر فرض

ہیں اسی طرح عورت پر بھی یہ چیزیں فرض قرار دی گئی ہیں۔ زانی اور زانیہ کی سزا ایک ہے، لین دین خرید و فروخت اور وصیت کرنے میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں، یہودیوں کے ہاں عورت وصیت نہیں کرسکتی۔ ان کے نزدیک عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک اگر عورت زنا کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ کتوں کو چھوڑ کر اس کو نوچوا دینا چاہئے اور اگر مرد زنا کرے تو اس کو جرمانہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کے نزدیک عورت کی شہادت معتبر نہیں اگر کسی عورت کا شوہر انتقال کرجائے تو وہ کسی طرح دوسرے سے شادی نہیں کرسکتی، اگر کسی مرد کی بیوی وفات پائے تو وہ مرد دوسری عورت کو اپنے نکاح میں لا سکتا ہے، لیکن اسلام نے اس میں بھی دونوں کو برابر کر دیا ہے، آج ہندو بیوہ عورتوں کے درد انگیز و پُر الم واقعات کو سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کتنی ایسی عورتیں ہیں، جن کی شادی صغر سنی میں ہوئی اور عین جوانی کے عالم میں بیوہ بن گئیں، یہ درد انگیز منظر اس وقت نظر آتا ہے جب کہ یہ بدنصیب عورتیں مست ہو کر میلوں میں گاتی ہوئی نکلتی ہیں، کون دل ہوگا جو ان کی اس بری حالت کو دیکھ کر چار آنسو نہ بہاتا ہوگا، تعجب تو یہ ہے کہ ایسے لغو قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے آج مذہب اسلام کے بہترین قوانین پر اعتراض کرتے ہیں ——— !!!

نوع انسانی کی اصلاح کا دوسرا طریقہ

غلامی کا انسداد

عربی زبان میں رق کے معنی کمزوری کے ہیں، اسی سے رقت قلب نکلا ہے۔ فقہاء کے نزدیک رق ایک قسم کی حکمی درماندگی ہے جو بعض لوگوں کو پہنچتی ہے، فرنگیوں کی اصطلاح میں غلامی سے مراد کسی شخص کا اپنی فطری آزادی سے محروم ہوجانا اور اس کو دوسرے کی ملک بنا دینا ہے۔

غلام بنانے کا رواج:- کسی دور میں انسانی جماعت کا توازن برقرار نہیں رہا۔ دورِ وحشت و بربریت سے لے کر دور تہذیب و تمدن تک بلکہ عالم انسانی کے تمام ارتقائی ادوار میں قوت وضعف کے مظاہر رونما ہوتے رہے ہیں، غلامی بھی اسی انسانی کمزوری کا ایک مظہر ہے، اس کا رواج اس وقت سے ہوا ہے، جب سے کہ جہالت و ظلمت کے پردے انسانی سوسائٹی پر پڑے ہوئے تھے۔ غلامی کے شیوع پذیر ہونے کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

اسباب (۱) چونکہ محنت و مشقت کے کام دشوار ترین اور جسم کے لئے آفت رساں ہیں اس لئے انسان کو ایسے ذرائع

تلاش دامنگیر ہوئی، جو اس کو اس محنت و مشقت سے نجات دلائے
اس نے سوسائٹی میں نظر دوڑائی تو اپنی آنکھوں کے روبرو ہی اس
کی مراد نظر آئی، قوی و طاقتور نے اپنے کاموں کی تکمیل کے لئے
کمزور و ناتواں انسانوں کو اپنا مطیع و ماتحت بنایا، یہیں سے
غلامی کا رواج شروع ہوا۔

(۲) حرص و آز اور ملک گیری کے جذبات آندھیوں
کی طرح اُٹھے جن کے نتیجہ میں جنگیں ہوئیں، فاتح قوم نے مفتوح
قوموں کو اپنا غلام بنا لیا اس طرح بڑی بڑی قوموں کے پاس
غلام بنانے کا رواج پھیل گیا، کوئی قوم جب دشمن پر غالب
ہو جاتی، تو اس کو قتل نہیں کرتی، بلکہ اپنی ضروریات زندگی کی
تکمیل اور اپنے کاموں کو پورا کرنے کے لئے اپنے ماتحت بنائے
رکھتی۔

(۳) غلامی کے دائرہ کو وسیع کرنے اور اس کے وسائل
کو زیادہ کرنے میں جغرافیائی ماحول اور اقلیمی طبائع کو، جو انسانی
جماعتوں کی تکوین میں زبردست عامل و موثر کی حیثیت رکھتے ہیں،
بہت بڑا اثر ہے، چنانچہ جو قومیں تمام مشرقی ممالک میں فطری
درجہ پر تھیں، ان میں غلامی حد درجہ وسیع پیمانہ پر پہنچ چکی تھی،
کیونکہ غلام کی قیمت بہت تھوڑی تھی اور اس کا کام صنعت و
تجارت میں نہایت مفید تھا،
مگر شمال میں جنوبی خطوں کے مقابلہ میں غلام بنانے کا
رواج بہت کم تھا، کیوں کہ ان کے پاس غلام کی خوراک کے لئے

بڑا بھاری خرچ پڑتا تھا، اور اس کی محنت اور اس کے کام سے کوئی بڑا فائدہ بھی نہیں تھا،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غلامی کا رواج چند ایسے اقتصادی امور سے متعلق تھا، جو محنت و عمل کا نتیجہ تھے،

قدیم زمانے میں غلام بنانے کا رواج

قدیم مصریوں کے پاس غلامی قدیم مصریوں کے پاس غلام ایک مسخر آلۂ کار تھا اور اس کا شمار زیب و زینت کے مظاہر اور شان و شوکت کے آثار میں کیا جاتا تھا، چنانچہ غلام بادشاہوں کے محلوں، کاہنوں اور سپہ سالاروں کے گھروں میں موجود ہوتے تھے اور جنگ میں جو قیدی بنا لیئے جاتے وہ حکومت کے غلام متصور ہوتے اور ملک کی ضرورتوں کے مطابق کام انجام دیتے، ملک کی آرائش اور اس کی حسن تشکیل کے متقاضی فرائض کی تکمیل کیا کرتے تھے، اس کے علاوہ قومی مصلحتوں اور عام حاجتوں کو بھی پورا کیا کرتے تھے، ان حالات میں اخلاق و عادات کا تقاضا یہ تھا کہ غلاموں کے ساتھ شفقت و رحمدلی کا معاملہ کیا جائے اور اس کی اذیتوں اور تکلیفوں کو دور کیا جائے،

ہندوؤں کے پاس غلامی قانون مانو نے لوگوں کو دو ممتاز طبقوں میں منقسم کیا ہے:۔

(۱) دویداس:۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے اونچے طبقے ترکیب پاتے ہیں مثلاً برہمن وغیرہ

(۲) شودر:۔ یہ نیچ طبقہ ہے اور خادم۔

پھر شودروں کے درجہ کی برہمنوں کے مقابلہ میں حد بندی کی گئی ہے اور ان کو نہایت کم درجہ میں رکھا گیا اور ان کے لئے نہایت تیز قوانین بنائے گئے ہیں جن میں سے چند قوانین حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایک برہمن کے لئے یہ جائز ہے کہ شودر کو خدمت کے لئے مجبور کرے خواہ اُس نے اس کو خریدا ہو یا نہ خریدا ہو، کیوں کہ وہ غلام ہے اور وہ محض برہمنوں کی غلامی و خدمت گزاری کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

(۲) اگر شودر کا آقا اس کو آزاد بھی کردے تو وہ اپنی خدمت گزاری کی صفت سے جُدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ اس کی فطری و طبعی خصوصیت ہے جو اس کی زندگی سے وابستہ ہے۔

(۳) جب کوئی شودر کسی برہمن کو اذیت پہنچائے تو اس کو قتل کرنے کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں۔

(۴) اگر اس نیچ طبقہ والا کوئی شخص کسی برہمن کو فحش گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالی جائے۔

(۵) اس نیچ طبقہ والا اونچے طبقہ کے کسی آدمی کا نام حقارت کے طور پر اور عیب چینی کی غرض سے زبان پر لائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے منھ میں ایک خنجر جس کی لمبائی دس انگلیوں کے

برابر ہو، آگ پر سخت گرم کرنے کے بعد رکھ دیا جائے۔

(۶) اگر کوئی شودر برہمنوں کے فرائض و واجبات کے متعلق ان کو نصیحت کرنے اور وعظ کرنے کی جرأت کرے تو بادشاہ کا فرض ہے کہ اس کے کان اور منہ میں کھولتا ہوا تیل ڈال دے،

(۷) اگر کوئی برہمن شودر کے پاس کی کوئی چیز چرالے تو اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا، لیکن اگر شودر چوری کرے تو اس کی سزا اس کو آگ میں جلا دینا ہے۔

(۸) اگر کوئی شودر کسی قاضی کو مارنے کی جسارت کرے تو اس کو زندہ لٹکا کر آگ میں بھونا جائے، اگر کوئی برہمن اسی قسم کے جرم کا ارتکاب کرے تو اس پر تاوان عائد کیا جائے۔

برہمنوں کی شریعت میں تمام خدمت گزاروں کو دو گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے خدمت گزار اور غلام۔ پاکیزہ کام خدمت گزاروں کی خصوصیات میں سے ہیں اور گندے اور نجس کاموں کو غلاموں کی گردن پر ڈالا گیا ہے۔

آشوریوں اور ایرانیوں کے پاس غلامی

مملکت آشور کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ غلامی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی، محلات اُن عورتوں اور غلاموں سے بھرے پڑے تھے۔ جن کو زینت و جمال کے لئے مخصوص کر لیا گیا تھا،

مملکت ایران نے، جس کی سلطنت کے گوشے ایشیائے قدیم کے حدود تک وسیع ہو گئے تھے تمام اقسام کے خدمت گزاروں کو

جو بیشتر مختلف قوموں کے پاس مشہور و معروف تھے، اپنے اندر
جمع کر لیا تھا، اس کے اندر غلام ہی چرواہے تھے، اور غلام ہی
زیب و زینت اور دولت و ثروت کی حاجتوں کے ساتھ مختص تھی،

بعض شہروں میں عرف و اصطلاح نے یہ روا قرار دیا کہ
غلاموں کے لئے بھی آرام و راحت کی گھڑیاں ہونی چاہئیں، جیسا
کہ واضعانِ قوانین نے غلاموں کے بارے میں عدل و انصاف
کرنے اور ان کو ظلم کا تختۂ مشق بننے سے روکنے کی کوشش کی،

ہیروڈوٹ کہتا ہے :-

"کسی ایرانی کو یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے غلام کو کسی
ایک گناہ پر ایسی سزا دے جو شدت و درشتگی
کی حد کو پہنچ چکی ہو، لیکن غلام جب اسی گناہ کا
دوبارہ ارتکاب کرے تو اس کے آقا کو حق حاصل
ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے یا اس کو ہر قسم
کا عذاب دے جو تصور میں سما سکتا ہے"

چین میں غلامی میلاد مسیح سے کئی صدیاں پیشتر چین میں عام
منفعت کے لئے خدمت لینے کا طریقہ رائج
تھا، محکوم اور قیدی خدمت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے،
اس کے بعد غلام بنانے کا طریقہ جاری ہوا، اہل چین غلاموں کو
باہر کے لوگوں سے جنگ کر کے حاصل کیا کرتے یا ان کو خود چینیوں
میں سے بنایا کرتے تھے جیسا کہ خود حکومت یہ کام کیا کرتی تھی کیونکہ
محتاج و فقیر فاقہ و احتیاج کی وجہ سے اپنی اولاد کو فروخت کرنے

مجبور ہو جاتا تھا، آقا کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ غلام میں آزادانہ تصرف کرے اس کو فروخت کرے یا اس کی اولاد کو، مگر ممالک چین میں غلامی شدت کے ساتھ نہیں تھی، کیونکہ وہاں کے قوانین اور اخلاق ورسوم غلاموں کے ساتھ مہربانی کرنے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی اعانت کرتے تھے،

چنانچہ شہنشاہ کو انجوں نے، جو مسیح علیہ السلام کے بعد ۳۵ سال تک زندہ رہا، غلام کی زندگی اور اس کی شخصیت کی حفاظت کے لئے دو قانون نافذ کئے ان کے ضمن میں ایسی عبارت پیش کی جس میں کمال انسانیت و مروت کا رنگ جھلکتا ہے چنانچہ ان دونوں احکام میں کہا گیا ہے :-

" انسان آسمان و زمین کی مخلوقات میں اشرف و افضل ہے، جو شخص اپنے غلام کو قتل کر دے تو اس کے اخفاءِ جرم کے لئے کوئی سبیل نہیں، جو شخص اپنے غلام کو آگ میں جلانے یا اس کو آتشیں داغ دینے کی جرارت کرے گا تو قانون کے مطابق اس کو بھی یہی سزا دی جائے گی، جو شخص اپنے سردار کو نذرِ آتش کر دے تو وہ آزاد منش وطن پرست طبقہ میں شمار کیا جائے گا "

بعض غلاموں کی اچھی قدر و منزلت تھی، وہ عہدوں پر بھی فائز ہوتے تھے اور اپنے آقاؤں کا اعتماد بھی ان کو حاصل ہوتا تھا غلام کو بعض کسب معاش کے طریقوں میں اتنی سہولت تھی کہ وہ اپنی

آزادی حاصل کر لیتا تھا اور غلامی کے قلادہ سے چھٹکارا پاتا تھا، اسی لئے غلامی کا رواج اُس چینی قوم کے پاس بہت کم تھا، جو جودت فکر اور درستگی رائے میں ممتاز ہے؛

عبرانیوں میں غلامی:- عبرانی قوم کے نزدیک غلامی کا رواج بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے، بنی اسرائیل میں غلاموں کو اُن رؤسا و امراء کے پاس دولت و ثروت کے اصول اور تونگری کے ذرائع و اسباب میں شمار کیا جاتا تھا جن کی عادت سیر و سیاحت تھی، لیکن ان کے پاس غلاموں کے لئے چند حقوق تھے، مثلاً سال میں سات ہفتے ان کو آرام کا موقع دیا جاتا اور ان کو شدید زد و کوب کرنا ناجائز تھا، اگر کوئی ایسا کرتا تو اس کو شدید سزا دی جاتی، اسی طرح غلام کو زخمی کرنا، یا اس کی ہڈی یا دانت توڑنا ممنوع تھا، لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ عبرانی غلاموں کے ساتھ اپنا جیسا معاملہ کیا کرتے تھے، اکثر مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ آقا اپنی کسی لونڈی کو ممتاز کر لیتا اور اُسے اپنی زوجہ بنا لیتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ غلام کے لئے بعض اوقات اس کی اجازت تھی کہ وہ اپنے آقا کی لڑکی سے شادی کرے جب کہ آقا کی کوئی اولاد ذکور میں سے نہ ہو،

خلاصہ یہ ہے کہ عبرانیوں اور ان کے علاوہ دیگر تمام مشرقی قوموں کے پاس غلاموں کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا تھا جن کی مثال یونان و روما میں نہیں ملتی۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں وارد ہوا ہے کہ غلام جب کسی قصا

مستحق ہو تو یہ حکم قاضی ہی کے ذریعہ سرزد ہوگا، تاکہ اس کو آقاؤں کی درشتی اور ان کے انتقام سے بچا کر اس کی حفاظت کی جائے

یونانیوں میں غلامی:- غلامی کا رواج دورِ قدیم سے تمام بلاد یونان میں شائع تھا، جس کے جواز اور صحت کو فلاسفۂ یونان کے سرگروہ ارسطو نے ثابت کیا ہے اور اسی نے غلام کی اس طرح تعریف کی ہے : کہ

"غلام ایک ایسا ذی روح آلہ یا متاع ہے، جس کے ذریعہ زندگی کا نظام چل رہا ہے"

پھر ارسطو نے بنی نوع انسان کو دو گروہ میں منقسم کیا ہے ایک آزاد، دوسرے بالطبع غلام،

یونانیوں نے غلام کی دو جداگانہ قسمیں قرار دی ہیں۔

(۱) مفتوح و مغلوب ممالک کے باشندے جو وہاں کے حکمرانوں کے محکوم ہیں، یہ لوگ ان کی حکومت کے اسی طرح زیرنگیں ہیں جیسا کہ اس کا ایک حصہ،

(۲) غلامانِ خرید و فروخت، کہ جن کے آقاؤں کو ان پر مطلق سرداری حاصل ہے، زیادہ تر غلام دوسری صنف سے تعلق رکھتے ہیں،

سمندروں میں رہزنی اور ساحلی مقامات پر رہنے والوں کی لوٹ مار یہ تمام غلام بنانے کے طریقے تھے، یونان، ایتھنس، قبرص، ساموس اور صاقس کی نوآبادیاں غلاموں کی خرید و فروخت کے بڑے مراکز اور منڈیاں تھیں۔ غلام اپنے آقاؤں کے لئے یا اپنے لئے

اس شرط پر کام کیا کرتے تھے کہ وہ ان کے سرداروں کے لئے ہر دن معینہ رقم ادا کر دیں، اکثر یونانیوں نے غلاموں کو خرید کر ان کو مزدوری کے لئے مخصوص کر دیا تھا، یہ جلب زر اور تونگری حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھا، ایتھنس کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں کوئی غلام اپنی خدمت گزاری پر نہ مقرر ہو، خواہ اس کا مالک فقیر ہی نہ ہوتا ہو، آقا کو اپنے غلام میں آزادانہ تصرف کا حق حاصل تھا، اگرچہ غلام کے ساتھ معاملہ کرنے میں یونانیوں کے پاس اس قدر شدت نہیں برتی جاتی تھی، جتنی کہ رومانیوں کے پاس تھی۔

غلاموں کی سزا تازیانہ اور آسیا گردانی تھی۔ جو غلام بھاگ جاتا یا بربری ملکوں سے کسی ملک میں چلا آتا تو اس کی پیشانی پر تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیا جاتا، اس کے علاوہ غلام کی زندگی اور اس کی شخصیت کا قانون ذمہ دار تھا، قانونی حکم صادر ہونے ہی پر اس کو موت کا حکم سنایا جاتا،

ایتھنس میں چند آزاد لوگ ایسے تھے، جو مدت العمر اپنے آقاؤں کی دوستی لازم کر چکے تھے، اور ان پر چند مقررہ ذمہ داریاں عاید کر دی گئی تھیں، لیکن ان کو وطنی حقوق حاصل نہ تھے بلکہ ان کا مقام اجنبیوں کی طرح تھا اسی طرح ان کے پاس ایسے غلام تھے جن سے حکومت شہروں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے خدمت لیتی تھی اور امن قائم کرنے اور عام اجتماعوں میں راحت و آسائش کے وسائل فراہم کرنے کے لئے ان سے امداد لی جاتی تھی۔

رومانیوں میں غلامی

تمام کام رومۃ الکبریٰ میں آزاد کاریگروں کے سپرد تھے، اسی لئے اس تاریخی شہر کے تمام باشندوں میں جواں مردی اور بہادری کی روح درخشاں ہوگئی، لیکن جب جنگیں بکثرت ہوئیں روم کی فتوحات کا سیلاب ہرطرف سے امنڈ پڑا اور خوش حالی وعیش پرستی کا دور دورہ ہوگیا تو مالداروں نے غلاموں کا سہارا ڈھونڈا، ان کو زمین کی کاشت میں استعمال کیا اور فنون وصنائع کو ان کے حوالے کردیا گیا۔

روم میں غلام بنانے کے اسباب

روم میں غلام بنانے کے اسباب بہت سے ہیں

(۱) جنگیں غلامی کا بیشتر سبب تھیں

(۲) غلاموں کی اولاد

(۳) وہ آزاد لوگ جن کو بعض قوانین کی عبارتوں اور اشاروں کے ذریعہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا، مثلاً وہ قرضدار جس کو اپنا قرض ادا کرنے کے ذرائع آسانی فراہم نہیں ہوئے۔

اکثر مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ بعض دلال فوجیوں سے مل جاتے اور ہزاروں قیدیوں کو کم دام میں فروخت کردیتے تھے اسی طرح ان میں یہ طریقہ تھا کہ وہ بچوں کو چرا کر فروخت کردیتے تھے اور عورتوں کو بھی خلاف تہذیب کاموں کے لئے بیچ دیتے تھے۔

روم میں یہ عادت تھی کہ غلام کو نیلام کے ذریعہ فروخت کیا جاتا تھا، اس کو ایک پتھر پر کھڑا کیا جاتا تاکہ ہر شخص اس کو دیکھ سکے، اسی طرح یہ رسم تھی کہ خریدنے والا غلاموں کو ننگا کرکے دیکھنے کا

مطالبہ کرتا تھا، تاکہ ان کے عیوب سے واقف ہو جائے۔

تعلیم یافتہ غلاموں اور تمثیلی کرداروں کی صلاحیت رکھنے والوں اور حسین وجمیل لونڈیوں کی قیمتیں نہایت گراں تھیں، جب ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوگیا اور اصول وآداب کی بنیادوں میں خرابی واقع ہوگئی تو خوبصورت لونڈیوں کی خرید و فروخت دولت و تونگری کا ذریعہ بن گئی۔

غلاموں کی قسمیں

روما نے بھی ممالک یونان کی طرح غلاموں کی تقسیم اس طرح کی ہے:۔

(۱) وہ غلام جو رفاہ عام کے فرائض انجام دیتے ہوں اوروں کی بہ نسبت خوش حال ہیں، عمارتوں کی نگرانی و حفاظت قاضیوں اور کاہنوں کی امداد کے کام ادا کرتے اور قیدیوں اور جلادوں سے خدمت لیتے ہیں،

(۲) خصوصی غلام، یہ لوگ اپنے آقاؤں کی خدمت گزاری کا فرض ادا کرتے اور ان کی مصلحتوں اور ضرورتوں کو پوری کرتے ہیں:

غلام کی قدر و قیمت

قانون کی نظر میں غلام کوئی چیز نہیں تھا اس کو نہ تو ملکی حقوق حاصل تھے نہ خاندانی اور نہ شخصی، وہ باعتبار آزادی و غلامی اس کی ماں کے تابع ہے یہ اعتبار وضع حمل کے وقت ہوگا نہ کہ بحالت حمل،

غلاموں پر ان کے آقاؤں کے لئے غلبہ و اقتدار کی کوئی حد بندی نہیں تھی، آقا غلام کو کسی ناروا حرکت پر اپنی جی بھر کے سزا دے مثلاً اس کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر زراعت و کاشتکاری کی

مشقتیں برداشت کرائے جسم کی کھال پر اتنے کوڑے لگائے کہ وہ آخر میں ہلاک ہو جائے، اس کے دونوں ہاتھ لٹکا کر اس کے دونوں پاؤں میں بھاری اور وزنی بوجھ باندھ دئے اور اس کو درندوں اور جنگلی جانوروں سے لڑنے کے لئے بھیج دے، الغرض یہ تمام اختیارات ایک آقا کو حاصل تھے،

قانون رومہ نے غلاموں کے اس دردناک منظر کو شفقت و رحمدلی کی نظر سے دیکھا اور ان کے لئے اولین قانون جو "قانون پترونیا" کے نام سے مشہور ہے وضع کیا گیا، اس میں یہ درج تھا کہ آقاؤں پر یہ حرام ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو وحشیوں سے جنگ کرنا ضروری قرار دیں لیکن یہ سزا قاضی کی اجازت سے واقع ہونا صحیح ہے،

پھر "انطوفان اور کلودیوس" کا ظہور ہوا ان دونوں نے غلاموں کے ساتھ برا معاملہ کرنے کو منع قرار دیا اور یہ قانون نافذ کیا کہ اگر آقا اپنے غلام کو قتل کردے تو اس کو جرمِ قتل کا مرتکب شمار کیا جائے گا،

قرونِ وسطیٰ میں غلامی:- بربری قوموں کے قوانین[۱] رومانیوں کے قوانین کے مشابہ ہیں قانونی اعتبار سے غلام کو حیوان کی طرح شمار کیا جاتا تھا اس کا آقا اس میں من مانے تصرف کرسکتا تھا اور اس کو قتل کرنا اس کے لئے

---

[۱] یہ قومیں وہ ہیں جنھوں نے رومانی مملکت پر مختلف اسباب کی بنا پر حملہ کیا، یہ تین بڑی جنسوں سے مرکب ہیں۔ جنس رومانی، صقلی، یسقی۔

روا تھا کیوں کہ غلام اشیاء ملکیت سے تھا' ان قوموں کے کئی گروہ ہیں۔

(۱) پہلا گروہ غالیوں[1] کا ہے ان کے پاس غلاموں کو زمین پر ہل چلانے زراعت اور فصل کاٹنے کی تکلیف دی جاتی تھی کیوں کہ یہ تمام کام شیشرون[2] کے زمانے میں حقیر اور کم درجہ کے تھے۔ آزاد اشخاص کو ان کی مزاولت لائق نہیں تھی۔

(۲) دوسرا گروہ جرمنوں کا ہے۔ ان کے نزدیک غلامی کا انحصار اس پر تھا کہ غلاموں کو ان کے آقا مزدوروں کی طرح گیہوں یا چوپائے یا کپڑے معینہ مقداریں ادا کر دیتے' ہر غلام کے لئے ایک گھر تھا' وہ اس میں جیسا چاہتا انتظام کرتا تھا' کیوں کہ ان کے آقا جوا بازی میں منہمک تھے'

(۳) تیسرا گروہ فرنگیوں[3] کا ہے' غلامی کا رواج ان میں انتہائی شدت کو پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ ان کے قانون نے آزادوں

---

[1] یہ لوگ غالیا نامی مشہور قدیم ملکوں کے باشندے ہیں' غالیا درحقیقت فرانس ہے وہ غالیا جو ایپ کی پہاڑیوں کے روبرو ہے شمالی اطالیہ ہے' اس کے بعد اقالیم غالیا ہیں' یعنی برطانیہ فرانس اور اسپین کے قدیم جزائر'

[2] شیشرون رومانیہ کا سب میں فصیح و بلیغ خطیب ۱۰۶ قبل م میں پیدا ہوا پھر اس نے اس کے زمانے کے مشہور ترین اساتذہ سے فلسفہ و بلاغت کا درس سیکھا۔

[3] فرنگ یعنی انگریز ایک آزاد قوم ہیں' جو جرمن خاندان سے مل کر بنے ہیں جو نہر رین کے نچلے حصہ کی وادیوں میں سکونت پذیر تھے' یہ اُن قوموں میں زیادہ مشہور ہیں جو دوسری اور تیسری صدی بعد مسیح ظاہر ہوئیں یہ مکر و فریب دھوکا اور غداری اور سیاست کاری

(بقیہ صفحہ آیندہ)

اور غلاموں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کردی تھی، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اجنبی لونڈی سے شادی کرتا تو وہ بھی غلامی کے پھندوں میں گرفتار ہوجاتا اور وہ آزاد عورت جو کسی غلام سے شادی کرتی تو اپنی آزادی سے محروم ہو جاتی،

(۴) چوتھا گروہ ویزیقوط[۱] ہے، اس قوم کے پاس غلام کے ساتھ انتہائی شدید معاملہ کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ اگر آزاد عورت اپنے غلام سے شادی کرلیتی تو اس کو غلام کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا، ہر ایک کو کوڑے لگائے جاتے، اگر وہ عورت غلام کی مالکہ نہ ہوتی تو عقد کو فسخ کردیا جاتا،

(۵) پانچواں گروہ استروقوط[۲] اور لمبردیون کا ہے ان دونوں قوموں کے نزدیک بہت سخت احکام و قوانین نافذ تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی آزاد عورت غلام سے شادی کرتی تو اس کو جلاوطنی کی سزا دی جاتی،

(۶) چھٹا گروہ انجلوسکسون[۳] کا ہے۔ یہ لوگ غلام کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتے تھے:

(بقیہ گزشتہ) میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کسی عہد کی وفا کرتے ہیں اور نہ دوستی کا پاس لحاظ۔

[۱] یہ قوم قوط کی ایک شاخ ہے۔ قوط ایک قدیم قوم ہے جرمنی میں جو اندلس آئی۔

[۲] استروقوط ایک قدیم قوم ہے جو کئی زمانہ تک اطالیہ کے تخت کی مالک رہی لمبردیون لمبردیہ کے باشندے ہیں جو چھٹی صدی سے آٹھویں صدی بعد مسیح میں گزرے ہیں۔

[۳] یہ ایک اسم جنس ہے جو اُن جرمن قوموں پہ بولا جاتا ہے، جنھوں نے برطانیہ عظمیٰ پہ پانچویں صدی میلادی میں حملہ کیا، ان ہی سے انگریزوں کی نسل ظاہر ہوئی۔

(۱) وہ غلام جو جائداد کے مشابہ ہیں، یہ زمین سے جدا نہیں ہوتے تھے، زمین جوتنے اور اس کی کاشت کے ذمہ دار تھے پھر ان کے لئے اس کی اجازت تھی کہ وہ اتنا سرمایہ جمع کرلیں جس سے وہ اپنی آزادی پر قابو پاسکیں۔

(۲) وہ غلام جو متاع کے مشابہ تھے، ان لوگوں کی خرید و فروخت جائز تھی،

دورِ جدید میں غلامی:۔ خدمت گزار شخصیت کی حیثیت سے نئے زمانے میں حبشیوں کو غلام بنائے رکھنا رومانیوں کے غلام بنانے کے مشابہ ہے، لیکن اس اعتبار سے یہ غلامی رومانیہ کی غلامی سے جوہری مخالفت رکھتی ہے کہ نوآبادیوں کی فتوحات نے زمینوں کا ان کے مزدور کاشتکاروں سمیت مالک نہیں بنا ڈالا، بلکہ انھوں نے وہاں کے باشندوں کو دور کردیا اس لئے حبشیوں کی حاجت پڑی،

حبشی قانون قانون اسود کا اطلاق تمام شہروں میں اُن مجموعی قوانین و اصول پر کیا جاتا ہے جو غلامی کے باب میں مدوّن ہوئے ہیں، چنانچہ ۱۷ر مارچ ۱۶۸۵ء میں فرانس میں ایک فرمان نافذ ہوا، جو فرانسیسی نوآبادیوں میں بسنے والے غلاموں اور آزادوں کے حالات کی درستگی اور ان کی تنظیم سے متعلق تھا، لیکن اس کو رائج کرتے وقت بہت سے قوی اعتراضات اس پر وارد کئے گئے، جس کی وجہ سے اس کی خوبی زائل ہوگئی اور اس کی برائی باقی رہ گئی۔ اور غلام پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کو نہ تو

نفس ہے نہ روح اور نہ ارادہ، اس کے بعض گوشے یہ ہیں :۔

(۱) اگر کوئی حبشی ان کے آقاؤں کو تھوڑا بھی دکھ پہنچائے یا آزاد اشخاص پر تھوڑی بھی زیادتی کرے یا خفیف سرقہ بھی کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری مرتبہ بھاگنے والے غلام کی سزا کان کاٹنا اور تپتے ہوئے لوہے سے داغ دینا ہے اور تیسری بار بھاگنے کی سزا قتل ہے۔

(۳) مالک یا رئیس غلام پر کسی جرم کا ارتکاب کرے خواہ اس کو قتل ہی کیوں نہ کر ڈالے تو قاضیوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کو بری قرار دیں۔

(۴) سفید فام اشخاص کے علاوہ دوسروں کے لئے یہ حرام ہے کہ وہ فرانس میں علوم و معارف سیکھنے کے لئے حاضر ہوں

یہ حال تو فرانس کا تھا

امریکہ میں اس سے بھی زیادہ سخت اور انسانیت سوز قوانین نافذ تھے :۔

(۱) آقا کو غلام کے فروخت کرنے، اس کو کرایہ پر دینے اس کو رہن رکھنے اور اس پر جوّا کھیلتے وقت بازی لگانے کا پورا پورا اختیار تھا، اور غلام کو بے چون و چرا تابعداری فرض تھی۔

(۲) غلام کو آمد و رفت کا کوئی حق نہیں زراعت کے لئے

بغیر اپنے آقا کی اجازت کے باہر نہیں نکل سکتا،

(۳) شاہ راہ عام پر اگر سات غلاموں سے زیادہ جمع ہو جائیں تو ان کو مخالفوں اور دشمنوں میں شمار کیا جائے گا،

(۴) حبشیوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ سوائے ان کے ہمجنسوں کے کسی اور کے قضیہ میں گواہی دیں ان کو اپنے فریق کی حفاظت کے لئے قسم بھی نہیں کھانی چاہئے لیکن ان کے فرائض منصبی میں ان کو آزاد شمار کیا جائے۔

(۵) جو سیاہ فام سفید فام کی مدافعت پر جرأت کرے گا اور اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو قتل کر دے گا تو جرم قتل کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

(۶) اس پر سفر کرنا حرام ہے اور اس کو جائز قرار دینا ممنوع۔

(۷) جو شخص کسی غلام کو یا ان کے چند افراد کو اطاعت چھوڑنے کا مشورہ دے، یا غلاموں کو عدول حکمی کی ترغیب دلانے کے لئے کوئی اشتہار یا رسالہ شائع کرے، یا غلامی پر مذمت یا طعن کرتے ہوئے حکومت کے ملکوں میں اپنے قلم کے ذریعہ کوئی اخبار یا پمفلٹ یا کتابیں روانہ کرے تو اس کو سخت سزا دی جائے گی،

یہ وہ خصوصی احکام و قوانین ہیں قانون اسود کے جو اس تمدنی جنگ کے شعلوں کے بھڑکنے سے پیشتر مدون کئے گئے تھے جس نے ممالک متحدہ کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور انجام کار حبشیوں نے اپنی آزادی کی جد و جہد میں کامیابی حاصل کر لی،

میسحی مذہب میں غلامی کے خلاف

مسیحی مذہب میں غلامی کوئی صریح نص نہیں ملتا، اور نہ اس کے خلاف حواریوں نے کوئی تصریح پیش کی، اور نہ ہی مختلف کلیساؤں میں کسی عیسائی جماعت نے غلامی کی حرمت میں کچھ کہا، صرف انجیل میں اس قدر ہے کہ :۔

"تمام لوگ بھائی بھائی شمار کیے جاتے ہیں، ان پر یہ امر واجبی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں"

بلکہ پولس[1] نے اپنے ایک خط میں، جس کو اس نے افسیین[2] کی طرف روانہ کیا تھا، غلاموں کو یہ وصیت کی ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کی خوف و رعب کے ساتھ اسی طرح اطاعت کریں جیسا کہ وہ مسیح علیہ السلام کی اطاعت گزاری کرتے تھے، اسی طرح ان کو حواری پطرس[3] نے بھی نصیحت کی تھی کہ وہ ان کے آقاؤں کے تابعدار رہیں اور ان سے ڈرتے رہیں۔

کلیسا کے پادریوں نے ان ہی کے نقش پر چلنا اختیار کیا چنانچہ اُنھوں نے غلامی کو جائز اور برقرار کیا، سپریانوس نے اسی کا

---

[1] مقدس پولس کے ماں باپ یہودی تھے، یہ دوسری صدی عیسوی میں شہر طرسوس میں پیدا ہوا
[2] یہ لوگ ایشائے کوچک کے قدیم شہر افسس کے باشندے ہیں، یہ شہر ہیکل دیانا سے مشہور ہے جو دنیا کے سات عجائب میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے
[3] بارہ حواریوں یعنی حضرت مسیحؑ کے مددگاروں میں سے ہے، بہت بعد امیں پیدا ہوا
[4] قرطاجنہ میں تیسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا، اس کے ماں باپ بت پرست تھے، پھر یہ عیسائی ہو گیا،

فتویٰ دیا ہے'

طامس جو شاہزیرلا ہوتیوں میں سے ہے کہتا ہے۔

"فطرت نے بعض لوگوں کو مخصوص کر دیا ہے کہ وہ غلام بن کر رہیں"

بائبل سفر خروج کے گیارھویں اصحاح اور سفر احبار کے پندرھویں اصحاح کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے غلامی کو صحیح قرار دیا ہے'۔

جرمن پوپ بوسیر نے غلامی کا اقرار کیا ہے اور دلالی (ایجنسی) کو حلال تجارت میں شمار کیا ہے' روح القدس کے کلیسا کے رئیس پادری فور دینیپر نے ثابت کیا ہے کہ غلام بنانا مسیحی نظام میں سے ہے'۔

باتریس لاروک اپنی کتاب "مسیحی قوموں میں غلامی" میں کہتا ہے'

"مسیحی مذہب نے نہ صریحی طور پر غلامی کو حرام قرار دیا اور نہ عملی طور پر اس کو باطل کیا"

پھر پیبیر لاروس فرانس کا سب سے بڑا ادیب کہتا ہے۔

"آج تک مسیحی قوموں کے پاس غلامی کے باقی رہنے اور اس کے جاری ہونے سے کوئی انسان تعجب نہ کرے کیونکہ مذہب کے سرکاری نائبین اس کو صحیح تسلیم کرتے اور اس کی مشروعیت کے قائل ہیں"

خلاصہ یہ ہے کہ مسیحی دیانت آج تک غلامی پر پورے طور سے

راضی ہے کسی شخص کے لئے یہ ثابت کرنا دشوار ہے کہ مسیحی مذہب نے غلامی کو باطل کرنے میں کوشش کی ہو یہاں تک کہ انقلاب فرانس واقع ہوا جس نے بلند آواز سے یکایک پکارا کہ قانون کے روبرو تمام لوگ مساوی ہیں، اور سب کو انسانی حقوق حاصل ہیں۔

اسلام اور غلامی

گزشتہ بیانات سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلام کی ظہور قدسی کے وقت تمام دنیا میں غلامی کے مختلف اور گوناگوں طریقے رائج تھے آزادی کے راستے مسدود ہو چکے تھے، غلاموں پر قانونی سختیاں اور پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں، ان کے اور ان کے آقاؤں کے درمیان مکمل امتیازات کی دیواریں حائل ہو گئی تھیں، دانش و حکمت کا تقاضہ یہ نہیں تھا کہ دنیا سے بیک وقت غلامی کی لعنت کو دور اور اس کی زنجیروں کو پاش پاش کر دیا جائے، کیوں کہ غلامی گزشتہ ارضی و سماوی شریعتوں اور قانونوں کے ثابت ہونے کی وجہ سے دنیا میں جڑ پکڑ گئی تھی، لوگوں نے اس کی زنجیر کو نسلاً بعد نسل کئی صدیوں سے مضبوطی سے تھام لیا تھا اور اس کو اپنے تمدنی و عمرانی اصول میں سے تسلیم کر لیا تھا، اگر اسلامی شریعت اس کو یکدم باطل قرار دیتی تو لوگوں کے دل مکدر ہو جاتے اور وہ الہی و وضعی شریعتوں کے اصول و قوانین سے حجت پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے اور پوری مدافعت کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔

اس کے علاوہ اسلام نے غلامی کا ایک علیحدہ اور جداگانہ راستہ اختیار کیا، وہ یہ کہ کافروں کی قوم کے روبرو پہلے اسلام پیش کیا اور پھر جزیہ اور اس کے بعد ان سے منظم شرعی جنگ کی، اگر دشمن ان دو امور میں سے کسی کو قبول کرلیں تو انھوں نے اپنے نفسوں اور مالوں کو محفوظ کرلیا اور ان کے بھی وہی حقوق ہیں، جو مسلمانوں کے لئے ہیں، اگر انھوں نے انکار کر دیا اور جنگ چھڑی جس میں ان کو شکست ہوئی تو یہ امام کی اجازت سے فاتحین کے غلام بن گئے،

لیکن ان کی یہ غلامی پھر اپنی آزادی کی طرف رجوع ہوجانے کی نعمت سے محروم نہیں رکھتی بشرطے کہ وہ مال کے ذریعہ فدیہ دے کر اپنی جانوں کو چھڑا لیں، اسی طرح حاکم کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے لئے ان کو آزاد کرسکتا ہے، اس کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فاذا لقیتم الذین کفروا	جب تم کافروں سے مڈبھیڑ ہو،
فَضَرْبَ الرِّقَابِ حتیٰ اذا	تو گردنیں مارنی ہیں، یہاں تک کہ جب
اثخنتمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ	ان میں کشت و خون ڈال چکے، تو مضبوط
فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا	باندھو قید، پھر یا احسان کرو یا
فِدَاءً حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ	فدیہ لے کر چھوڑ دو، جب تک کہ
اَوْزَارَهَا (محمد، ۴)	لڑائی اپنا ہتھیار ڈال دے۔

آزادی کے طریقے اسلام میں آزادی کی راہیں بے شمار ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

(۱) غلام کو آزاد کرنا عام گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں غور کیجئے جب کہ ایک اعرابی نے آپ کے پاس آکر عرض کی اے رسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کردے، آپ نے فرمایا

عِتْقُ النَّسمة و فکُّ الرقبة. جان کو آزاد کرنا اور گردن کو چھڑانا، اعرابی نے کہا اے رسول اللہ! کیا یہ دونوں ایک نہیں؟ آپ نے فرمایا نہیں جان کو آزاد کرنا یہ ہے کہ اس کو مستقل طور پر آزاد کردیا جائے اور گردن کو چھڑانا یہ ہے کہ اس کی قیمت مقرر کردی جائے۔

(۲) شریعت اسلامیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ غلام کے بعض اجزاء کی آزادی اس کے کل اجزاء کی آزادی میں اثر کرجاتی ہے چنانچہ جو شخص اپنے غلام کو تھوڑی آزادی بخشے تو اس کی یہ آزادی باقی اجزاء میں بھی سرایت کرجائے گی، اسی طرح اگر بعض حصہ داروں نے اپنا حصہ آزاد کردیا تو آزادی پورے اجزاء میں اثر کرجائے گی، آزاد کرنے والا اپنے شریکوں کے حصہ کی تلافی کردے گا بشرطیکہ اس کے پاس مال ہو ورنہ غلام ان کے حصوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے گا اور غلامی سے نجات حاصل کرے گا،

(۳) شریعت نے غلام آزاد کرنے کو قتلِ خطا کا کفارہ قرار دیا ہے۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ	جو شخص غلطی سے کسی مومن کو قتل کردے تو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے اور

مُسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ ۔ مقررہ دیت اس کے رشتہ داروں کو دینا پڑے گا۔

اس کا راز یہ ہے کہ قتل جسمانی زندگی کو معدوم کردینا ہے کفارہ کے ذریعہ آزاد کرنا معنوی زندگی کو وجود بخشنا ہے۔

(۴) اللہ کی قسم کو توڑنے یا کسی صفت خداوندی کی بے حرمتی کرنے کی بخشش کے لئے غلام کو آزاد کرانا ایک بہترین وسیلہ ہے

(۵) جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کرکے یعنی یہ کہے کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّیْ تو میری ماں کی طرح ہے۔ پھر وہ اس قول سے رجوع کرلے اور بیوی کی عصمت کی حفاظت کرے، تو اس پر یہ ضروری ہے کہ وہ غلام کو آزاد کرے اگر وہ اس کی طاقت رکھتا ہو قبل اس کے کہ وہ اپنی بیوی سے ملے۔

(۶) جو شخص اپنے غلام میں کچھ بھلائی پائے تو اس سے معین مقدار مکاتب بنالے جو اس کو بالاقساط ادا کرتا رہے، غلام اپنی قسط ادا کرنے سے آزاد ہوجائے گا، اور مکاتبہ کی اولاد پر بھی کتابت کے بعد اس کتابت کا اثر ہوگا، اور مکاتبہ لونڈی کی آزادی سے اس کی اولاد بھی آزاد ہوجائے گی۔

(۷) جو شخص یہ نذر کرے کہ اپنی مراد میں کامیاب ہونے یا کسی آفت سے محفوظ رہنے کے بعد غلام آزاد کرے گا تو اس کی مراد پوری ہونے کے بعد اپنی نذر کو وفا کرنا اس پر واجب ہوجائے گا۔

(۸) شریعت اسلامیہ نے غلاموں کے ساتھ شادی کرنے کو جائز قرار دیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ

جو شخص تم میں سے آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری وسعت اور گنجائش نہ رکھتا ہو تو وہ آپس کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی مملوکہ ہیں نکاح کرے۔

پھر اسلام نے اس شادی سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کو احرار قرار دیا ہے وہ اپنے باپ کی میراث کے حق دار ہوں گے، حالاں کہ وزیقوط، جو جرمنی کی ایک قدیم قوم کی شاخ ہے کے پاس یہ قانون تھا کہ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرے تو وہ اپنے شوہر سمیت آگ میں جلادی جائے گی۔

غلاموں کے امتیازات

شریعت اسلامیہ نے درماندہ غلاموں پر شفقت و رحمت کی نظر کی ہے، جس کو آزادی کامل کی نعمت خداداد سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا، اسی لئے ان کے جرائم کو احرار کے جرائم کے مشابہ قرار نہیں دیا، بلکہ غلام کے جرم کو اس کی درماندگی و کمزوری اور آزادی کی نعمت سے بے بہرہ مندی کی وجہ سے آزاد کے جرم کے مقابلہ میں اس کی کمال قوت اور آزادی سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے بہت ہلکا قرار دیا، چنانچہ غلام کی سزا کو آزاد کی سزا کا نصف قرار دیا بشرطے کہ اس کے لئے کوئی کوئی امر مانع نہ ہو، اس لحاظ سے آزاد پاکباز پر مثلاً تہمت لگانے کی وجہ سے جتنے تازیانے لگائے جائیں گے اس کے نصف غلام کو

مارے جائیں گے، چوں کہ چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا نصف کرنا دشوار امر ہے اس لئے یہ سزا پوری رکھی گئی بالخصوص اس لئے کہ اس سزا میں مالوں کی حفاظت اور شریر نفوس کی مدافعت کا راز مضمر ہے،

اجتماعی آزادی کی خوبیاں

(۱) شریعت اسلامیہ نے غلام کو اپنے آقا سے آزادی کی بدولت جدا کرنے کے بعد دونوں کے تعلقات و روابط کو برقرار رکھا ہے، چنانچہ ان کے باہم دوستی کے جذبہ کو استوار کیا جس کے فائدے محض غلام کے لئے بے شمار ہیں کہ آقا کے لئے، کیوں کہ یہ دوستی غلام کو گوشہ نشینی اور انفراد کی کمزوری اور اس کی ذلت و رسوائی کے آفات سے محفوظ رکھتی ہے،

(۲) اس دوستی کی وجہ سے آقا پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ غلام جب اپنی ضرورت کی تحصیل سے عاجز ہو جائے تو اس کی ضرورت کو پورا کرے، زنباع کا یہ واقعہ جو اس کے غلام کے ساتھ در پیش ہوا، اس حقیقت پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے، وہ یہ ہے کہ زنباع کے غلام نے ایک جرم کا ارتکاب کیا، زنباع نے اس کی ناک کاٹ ڈالی، غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر زنباع کی شکایت کی، آپ نے زنباع سے فرمایا۔ تجھے ایسا کرنے پر کسی چیز نے آمادہ کیا ؟ اس نے کہا اس نے ایسا اور ایسا کیا ہے آپ نے غلام سے فرمایا جا تو آزاد ہے، غلام نے کہا یا رسول اللہ ! اب میں کس کا غلام بن کر رہوں ؟ آپ نے

فرمایا تو اللہ اور اس کے رسول کا غلام بن کر رہ، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو غلام حضرت ابو بکر کے پاس آیا اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت؟ آپ نے فرمایا بے شک، تجھ پر اور تیرے اہل و عیال پر نان نفقہ حسب دستور جاری رہے گا، پھر اس نے حضرت عمر بن خطاب سے بھی آپ کی خلافت کے وقت یہی کہا آپ نے فرمایا بے شک! تو کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس نے کہا مصر کا، چنانچہ آپ نے مصر کے گورنر کو لکھا کہ وہ اس کو کوئی زمین دے دے جس سے یہ بہرہ ور ہوتا رہے،

(۳) یہ دوستی (ولاء) آزاد شدہ لونڈی میں ترغیب پر آمادہ کرتی ہے، کیوں کہ بعض لوگ اُس عورت سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے جس کا کوئی سرپرست رشتہ داروں میں سے نہ ہو یا وہ ان کے قائم مقام ہو،

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک

اسلام نے غلامی کو نہ تو ذلت و توہین کا موجب بنایا اور نہ شرافت و کرامت کے زوال کا سبب، مسلمانوں کے درمیان غلام اور آقا کے درمیان کوئی بڑا فرق نہیں تھا، بلکہ اُنھوں نے غلاموں کے ساتھ اپنے خاندانی افراد کی طرح معاملہ اور حسن سلوک کیا اور بذات خود اُن سے میل جول رکھا، شریعت نے ان کے ساتھ نرمی اور رحمدلی کے ساتھ معاملہ کرنے کو واجب قرار دیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا

(النساء ۴)

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو، والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، اہل قرابت کے ساتھ بھی، یتیموں کے ساتھ بھی، غریب غربا کے ساتھ بھی پاس والے پڑوسی کے ساتھ اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی ہم مجلس کے ساتھ بھی، راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو اپنے کو بڑا سمجھتا ہو اور شیخی کی باتیں کرتا ہو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا "اتَّقُوا اللّٰهَ فِيمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ" تم اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، ابن عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا "اتَّقُوا اللّٰهَ فِي الضَّعِيفَيْنِ، المملوك والمرأة" تم دو کمزوروں یعنی غلام اور عورت کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، آپ سے مروی ہے "اِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ فمن كان اخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل ويلبسه مما يلبس"

تمہارے بھائی تمہارے غلام ہیں جس کا بھائی اپنے ماتحت ہو تو اس کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں میں سے کھلائے اور جو کچھ یہ پہنتا ہے اس کو وہ پہنائے، ابن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ" جو شخص اپنے غلام کے طمانچہ مارے یا اس کو زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کی تحقیر اور اس کی غلامی وذلت کا تذکرہ کرنے سے منع فرمایا ہے، ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" لا یقل احدکم عبدی امتی، ولیقل فتای وفتاتی وغلامی تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میرا غلام، میری لونڈی، بلکہ اس کو کہنا چاہئے میرا لڑکا میری لڑکی میرا بچہ،

ان تمام احکام کے علاوہ اسلام نے غلام کی تعلیم و تربیت اور اس کی تہذیب و شائستگی کی بھی ترغیب دی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من کانت لہ جاریۃ فعلمھا واحسن الیھا و تزوجھا کان لہ اجران فی الحیاۃ والاخری اجر بالنکاح والتعلیم واجر بالعتق۔

جس کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اس کو تعلیم دے اس کے ساتھ حسن سلوک کرے اور پھر اس سے شادی کرے تو دنیا و آخرت میں اس کو دو ثواب ہوں گے، ایک ثواب نکاح اور تعلیم کا اور دوسرا ثواب آزاد کرنے کا۔

تاریخ میں بے شمار حقائق واقعات ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ غلاموں کو کیا خاص مقام اور کیسی قدر و منزلت حاصل تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید کو اس لشکر کا سردار مقرر کرنے کا حکم دیا، جس میں حضرت ابو بکر اور عمر جیسی فخر روزگار مقدس ہستیاں تھیں،

خلاصہ

قرآنی آیات، نبوی ارشادات، ائمہ دین کے اقوال وآثار اور تاریخی شواہد و واقعات سے واضح ہو گیا کہ دین اسلام نے غلامی کے حدود کو بڑی حد تک تنگ اور محدود کر دیا ان انسانوں کی آزادی و نجات کے ذرائع و وسائل بیان کر دئیے جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دئیے گئے ہیں ان کے لئے اپنی رحمت و حفاظت کی آغوش پھیلا دی، ان کی حمایت کا جھنڈا بلند کیا، اس کے ساتھ نرمی اور رحمدلی کی وصیت کی، حسن معاملہ سے پیش آنے، اس کو ادب و تہذیب سکھلانے، اس کی حقارت و توہین نہ کرنے کے احکام صادر کئے اور غلاموں سے شادی کرنے کی ترغیب وتحریص دلائی۔ ان تمام کی غرض وغایت یہ تھی کہ غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلانے میں جلدی کی جائے،

چوتھا باب

کسب معاش کے طریقے اور ناجائز آمدنی کے وسائل کا سدّباب

اللہ تعالیٰ نے اس عالم ارضی کو پیدا کیا اور تمام اشیائے کائنات کو انسان کا مطیع و تابعدار بنایا، انسان کو عقل سے زینت بخشی فکر کے زیور سے آراستہ کیا اور اس کے ہاتھ میں ارادہ و اختیار کی باگ دی تاکہ دنیا کو قوانین الٰہی کے مطابق آباد کرے، نظام عالم کو درست و استوار کرے اور تمام چیزوں کو سلیقہ سے استعمال کرے اور اپنے ذرائع معاش کو مکمل طور سے حاصل کرے، قرآن عزیز نے اکثر مقامات میں اسی پر روشنی ڈالی ہے بعض تو وہ ہیں جن سے فہم و بصیرت روشن ہوتی ہے، اور بعض وہ ہیں جو اعمال کے حسن و خوبی کی ترغیب دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور تم کو زمین کا خلیفہ بنائے تاکہ دیکھے کہ تم کس طرح کام کرتے ہو

مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :-

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ

اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہیں یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کو ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پیشتر کے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور یقیناً ان کے لئے ان کے اس دین کو غالب کردے گا جس کو ان کے لئے اس نے پسند کیا ہے ۔

بنی آدم کے لئے زمین کی تسخیر کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ

اور یقیناً ہم نے تمھیں زمین میں جاگزیں بنا دیا اور تمہارے لئے ہم نے مختلف معاش کے ذرائع بنائے تم بہت کم شکر گزار ہو۔

روزی کی تلاش اور کسب معاش کے لئے جدوجہد میں ارشاد ہوتا ہے :-

فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ

تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا

اَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ — فضل (رزق) تلاش کرو

ہر شخص کی جد و جہد کا پیمانہ جداگانہ، اس کی تلاش و جستجو اور محنت کا ذوق علیحدہ اور ہر کام کی نوعیت الگ الگ ہے۔ اسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا — ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت (طرز زندگی) کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے۔

اسی قسم کی کھلی ہوئی آیتیں اور قطعی دلیلیں ایک طرف شاہوں کی شکل میں اور دوسری طرف تلاش روزگار اور جد و جہد کی ترغیب میں وارد ہوئی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اس عالم کے اصول عمران کی تکمیل ہو اور اس [illegible] ہو جو آخرت کی کھیتی ہے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

احرث لدنياك كانك تعيش ابدا واحرث لآخرتك كانك تموت غدا — تو اپنی دنیا کی کھیتی اس طرح کر کہ گویا تو ہمیشہ زندگی گزارے گا اور آخرت کی کھیتی کی اس طرح کاشت کر کہ گویا تو کل مرنے والا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا ایک نعمت ہے اور اس کی اصلاح و درستی کی خواہش کرنا واجب ہے اور دنیوی نعمتوں پر شکرانہ فریضہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلب روزگار اور ہنگامۂ عمل پر ترغیب دلاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اِنَّ من الذنوب ذنوبًا — بعض گناہ ایسے ہیں جن کو طلب معاش کا

لا یکفرها الا الهم فی طلب المعیشة — ارادہ اور ہمت ہی مٹا سکتی ہے

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

من طلب الدنیا حلالاً وتعففاً عن المسألة وسعیاً علی عیاله وتعطفاً علی جاره لقی الله ووجهه کالقمر لیلة البدر

جس شخص نے دنیا حلال طور پر تلاش کی دست سوال دراز کرنے سے دامن سمیٹا، اپنے بال بچوں کی معاش کے لئے تگ ودو کی اور اپنے ہمسایہ سے لطف وعنایت سے پیش آیا، تو اللہ اس سے اس شان سے ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

ان الله یحب العبد یتخذ المهنة لیستغنی بها عن الناس

اللہ تعالیٰ اس بندہ کو دوست رکھتا ہے جو اس لئے محنت ومشقت اختیار کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں سے بے نیاز رہے۔

اور فرمایا:۔

ان الله یحب المومن المحترف

خدائے تعالیٰ پیشہ ور مومن کو محبوب رکھتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب عمل وسعی کی ترغیب کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"کوئی شخص تم میں سے طلب روزگار اور تلاش رزق سے یہ

کہتا ہوا نہ بیٹھ جائے کہ اے اللہ تو مجھے روزی دے کیونکہ
تم بخوبی جانتے ہو کہ آسمان سونے اور چاندی کی بارش
تو نہیں برساتا"

الغرض سعی و عمل کی فضیلت اور مالِ حلال کے اکتساب میں بے شمار اقوال و آثار ہیں جن کی یہاں گنجائش کم ہے،

چونکہ دنیا میں لوگ زندگی گزارنے کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لئے کوئی نہ کوئی فن اور پیشہ مسخر کر دیا تاکہ وہ کسی ایک پیشہ کو اختیار کرکے اور پیشوں پر ترجیح دے، اگر یہ تسخیرِ الٰہی مساعد نہ ہوتی تو تمام لوگ ایک ہی پیشہ اختیار کر لیتے اس طرح روزگار کا یہ تنوع اور معاش کی نیرنگی و بوقلمونی زائل ہو جاتی، نہ یہ کش مکش کا عالم رہتا اور نہ ہنگامۂ حیات سرگرم، پس اللہ کی حکمت و مشیت نے لوگوں کو مختلف کام اور مختلف صنائع اختیار کرنے کی تسخیر عطا کی، بعض لوگ وہ ہیں جو اپنی صنعت پر رضا مند اور اس سے منحرف نہیں ہونا چاہتے مثلاً جلاہا جو اپنے پیشہ پر راضی ہے اور حجام کو معیوب سمجھتا ہے اور حجام جو اپنے پیشہ کو اچھا سمجھتا ہے، اور جلاہے کو معیوب، بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ طوعاً و کرہاً اس کو اختیار کرتے ہیں گویا کہ ان کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں اور نہ اس کا کوئی نعم البدل ہے، ان ہی مختلف مظاہر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روشنی ڈالتا ہے

كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ ہر شخص جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسی کے

سزاوار ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کردیا ہے

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:۔

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُوْن	اور ہم نے تمہارے بعض اشخاص کو بعض کے لئے فتنہ بنایا ہے کیا تم صبر کرو گے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لا یزال الناس بخیر ما تباینوا فان تساد واھلکوا	لوگ جب تک باہم مخالف و متضاد رہیں گے تب تک ہمیشہ بھلائی پر ہوں گے اگر وہ آپس میں برابر اور یکساں ہو جائیں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔

اس قسم کے موضوع میں تفرقہ و اختلاف ہم آہنگی، اتفاق و اجتماع کا سبب ہے، جیسا کہ کتابت کی مختلف صورتیں اور شکلیں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے متبائن اور مختلف ہیں اگر یہ اختلاف و تبائن نہ ہوتا تو کتابت کا کوئی نظام ہی قائم نہ رہتا

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ عمل سے قطع تعلق اور فراغ دلی سے عبادت گزاری ہرگز اسلامی [illegible] میں سے نہیں، کیونکہ اسلام سستی اور کاہلی کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا، بیکاری کو حرام قرار دیتا، بیکار

رہنے والے کی مذمت کرتا اور کام کرنے والے کو اچھا سمجھتا ہے
لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی :۔

"بیٹا! کسب حلال کے ذریعہ فقر و فاقہ سے بے نیاز ہو جا کیوں کہ جس کسی کو فقر نے آگھیرا تو اس میں یہ تین خصلتیں گھر کر جاتی ہیں۔

(۱) اس کا دین نرم پڑ جاتا ہے (۲) اس کی عقل میں کمزوری وفتور واقع ہو جاتا ہے اور (۳) اس کی مروت و انسانیت جاتی رہتی ہے، ان تینوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ لوگ اس کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں"

لہٰذا عمل وسعی یہ دونوں انسانی فرائض و واجبات میں سے ہیں اسلام ان دونوں کی ترغیب دیتا ہے، جو شخص بیکاری اختیار کرے اور کاہل بن کر بیٹھ جائے اور اس کے لئے بہانہ سازی کرے اور حجت پیش کرے تو وہ انسانیت کے دائرہ سے باہر ہو گیا اور مردوں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل،

اسلامی اسلاف نے مختلف صنعتوں سے دلچسپی رکھی تھی اور خود ان کو اختیار کیا تھا، اس دور کی ترقی اور پیش قدمی کی رفتار کے مطابق اپنی طاقت و استطاعت کے مقدار انھوں نے ان پیشوں کا سہارا لیا تھا اس میں وہ کمال و مہارت اور استواری پیدا کر دی جس کی طرف پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا تھا :۔

ان اللہ یحب الصانع الحاذق — اللہ تعالیٰ ماہر و حاذق کاریگر کو دوست رکھتا ہے،

ان تمام نظائر وامثال کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہمتوں کو جدت پسندی، اختراع وایجاد پر آمادہ کیا جائے تاکہ صنائع کو ترقی ہو، ان سے فائدہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تمدن وعمران کے اس کمال تک رسائی حاصل ہو، جو انسانی فطرت کے عین مطابق اور خلافت الٰہیہ کے مقصد کے مقتضی ہے اور جو انسان کے بلند وبالاتر مطالبات میں سے ہے۔

وہ انسانی صنعتیں، جن کو اکثر لوگ اپنی کسب معاش کا ذریعہ بناتے ہیں مختلف اور بے شمار ہیں، کیوں کہ انسانوں کے ملکوں، ان کی معاشرت، اور ان کے جغرافیائی ماحول کے مطابق بے شمار اور گوناگوں کام رائج ہیں۔ لہٰذا کسب معاش، حصول روزگار اور سعادت وعزت کے فیضان کے لئے شریعت اسلامیہ نے انسان کو کوئی عمل، پیشہ اور صنعت اختیار کرنا ضروری قرار دیا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ سعی وعمل اور انسانی حقوق وفرائض کی ادائیگی کے ساتھ جائز طریقوں سے اکتساب مال، خرچ کرنے میں اعتدال، مال جمع رکھنا اور عظیم الشان کام سرانجام دینا یہ وہ اہم مقاصد ہیں جن سے دنیا کی تہذیب، تمدن اور عمران کا دامن وابستہ ہے اور یہی وہ غرض وغایت ہے جس کو اسلام نے اپنے آداب واصول اور تعلیمات میں ملحوظ رکھا ہے۔

اسلام اور کسب معاش

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کسب معاش یعنی قوت بازو سے روزی پیدا کرنا خواہ صنعت و حرفت کے ذریعہ ہو یا تجارت و زراعت سے، ترقی کے لئے ایک بہترین آلہ ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے انسان محنت و مشقت کا عادی اور سرگرم عمل ہوتا ہے، اس کے خلاف ورزی کرنے کی صورت میں افراد میں سستی، کاہلی اور مفت خوری کے مہلک امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو قوم کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

یہی حقیقت کبریٰ تھی کہ اسلام نے اپنے متبعین کو کسب معاش پر اتنا زور دیا جس سے دیگر مذاہب کا دامن تعلیم یکسر خالی ہے، یوں تو کسب معاش کی مختلف صورتیں ہیں، لیکن قرآن حکیم میں زیادہ تر "تجارت" کا لفظ آیا ہے گویا یوں سمجھئے کہ ضمناً یہ بتایا گیا ہے کہ تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔

ہمیں نہایت حسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اپنے فطری مذہب کی مقدس تعلیم کو فراموش کر کے بیکاری کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں، غربت و افلاس کے مردم خوار دیو انھیں اپنے آہنی پنجوں میں دبوچے ہوئے ہیں، عرصۂ حیات ان پر ہر جانب سے تنگ ہو گیا ہے، ان کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے تعلیم کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے، لیکن تعلیم کی وسعت

کے ساتھ ساتھ بیکاری بھی بڑھتی جا رہی ہے، کیوں کہ مدرسوں کے نصاب خواہ وہ عربی ہوں یا انگریزی، اس قدر ناقص ہیں کہ ان میں صنعت و حرفت کا مطلقاً کوئی شعبہ نہیں رکھا جاتا، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اولاً صنعت و حرفت تو کوئی جانتا نہیں دوسرے یہ کہ خود اُسے عار سمجھا جاتا ہے، عموماً تعلیم یافتہ ملازمت کی فکر میں اپنی زندگی بے کار کھوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اصحاب کے مقابل میں عوام کی زندگی کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر ان کے ہاں کوئی آبائی پیشہ ہے تو غنیمت ورنہ وہ بھی اپنی جہالت سے دریوزہ گری جیسے مہلک مرض کا شکار ہو جاتے ہیں،

آئیے! تعلیمات اسلامیہ کو بہ نظر غائر دیکھئے، ہماری اقتصادی زندگی کامیاب بنانے کے لئے اس نے کیا سبق دیا ہے،

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قوت بازو سے روزی پیدا کرنے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ خود دار بننے کے لئے حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ سے ایک دقیق نکتہ نکالا ہے، اس کا ماخذ یہ ہے کہ جب حضرت خضر نے اہل قریہ سے کھانے کی درخواست کی اور وہ مسترد کر دی گئی تو حضرت موسیٰ نے فرمایا

لو شئت لاتخذت علیہ اجرا	تم نے مفت کھانا کیوں طلب کیا تمہیں چاہئے تھا کہ اس دیوار کی مرمت میں مزدوری لے لیتے اور اسی سے کھانے کا انتظام کرتے تو ردسوال کی خفت نہ ہوتی۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے، ایام حج میں اہل عرب خرید و فروخت کرنا تقوی کے منافی سمجھتے تھے، قرآن حکیم نے ان کے غلط خیال کی تردید کی اور فرمایا ایام حج میں خرید و فروخت کرنا تقوی کے منافی نہیں، احادیث میں تجارت کا ذکر اور اس کی تفصیل اس کثرت سے آئی ہے کہ محدثین کرام نے ایک خاص باب ہی کتاب البیوع کا باندھا ہے، فضیلت تجارت میں غالباً یہ ایک حدیث کافی ہوگی۔

التاجر الامین الصدوق	ایک مسلمان راست گو اور امین
المسلم مع الشہداء	تاجر قیامت کے دن شہداء کے
یوم القیامۃ	ساتھ ہوگا

احادیث میں جہاں فضیلت تجارت کا ذکر آیا ہے وہاں چند تجارتیں ممنوع قرار دی گئی ہیں جن سے قومی، معاشرتی اور اقتصادی نقصان ہو، مثلاً شراب کی تجارت، اس کا تیار کرنا اور مزدوری کرنا سب حرام ہے، مردار کی تجارت، کتے کی تجارت، مردار کی چربی کی تجارت، پھل پکنے سے پیشتر باغ خریدنا جنس پختہ ہونے سے پہلے کھیت کو لے لینا، بیع غرار میں وہ تمام صورتیں آجاتی ہیں، جن میں دھوکے کا احتمال ہو، مثلاً جانور کے پیٹ کا بچہ، تالاب کی مچھلیاں، یا شرط کے ساتھ یہ کہنا کہ جس مال پر یہ کنکری پڑے گی وہ ہمارا ہوگا، یہ سب ممنوع صورتیں ہیں،

تجارت کے ماسوا اور الفاظ بھی آئے ہیں مثلاً

فاذا قضیت الصلوٰۃ	نماز ختم ہونے کے بعد اللہ کا فضل

فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ۔ وجعلنا النہار معاشا

(رزق) تلاش کرو ہم نے دن کو روزی کمانے کے لئے بنایا ہے

صنعت و حرفت کا بھی متعدد جگہ ذکر آیا ہے مثلاً قرآن حکیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کو لوہے کی صنعت سے اچھی واقفیت تھی، حدیثوں میں ذکریا علیہ السلام کو بڑھئی بتایا گیا ہے نوح علیہ السلام کے متعلق بھی تاریخ یہی کہتی ہے کہ وہ بڑھئی تھے، ادریس علیہ السلام کھیتی کرتے تھے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جتنے انبیاء مبعوث ہوئے سبھوں نے بکریاں چرائی ہیں، صحابہ نے آنحضرت سے دریافت کیا۔۔۔۔ آپ نے بھی؟ آنحضور نے فرمایا

"ہاں" میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں اجرت پر چرائی ہیں،

احادیث کے اندر کسب کی فضیلت میں الفاظ عام آئے ہیں

مثلاً۔

ان اطیب ما اکلتم من کسبکم طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ ای الکسب اطیب قال عمل الرجل بیدہ طلب الحلال جہاد

بہترین روزی وہ ہے جو قوت بازو سے پیدا کی جائے فریضۂ عبادت کے بعد سب سے اہم فریضہ حلال روزی کا پیدا کرنا ہے بہترین کمائی کیا ہے؟ فرمایا ہاتھ اور قوت بازو کی کمائی حلال روزی پیدا کرنا جہاد ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ بخاری شریف میں بڑھئی، لوہار اور سنار وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے امام موصوف کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ یہ

تمام پیشے آنحضور کے زمانے میں موجود تھے، لیکن آپ نے کوئی ممانعت نہیں کی، اس سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

کسب معاش کا دوسرا مقابل پہلو بے کاری اور محتاجی ہے، اسلام نے اس کے متعلق سخت تہدید کی ہے اور بجز انتہائی مجبوریوں کے دست سوال دراز کرنے کو قطعاً حرام قرار دیا ہے مگر افسوس اس زرین تعلیم کو بھی لوگوں نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور ارباب دولت کی بے محل خیرات وزکواۃ نے فقراء کی کثیر تعداد کا جال پھیلا دیا ہے اس دریوزہ گری میں ان کو اتنی کافی آمدنی ہوتی ہے کہ اسی کو مستقل طور پر اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور صنعت وحرفت سے ان کو مطلقاً سروکار نہیں ہوتا اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب کاہلی بے کاری اور مفت خوری کسی قوم میں جتنی ہی زیادہ ہوگی اتنی ہی معاصی اور بد اخلاقی بھی بڑھتی جائے گی،

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے خیرات وزکواۃ پر بہت زور دیا ہے لیکن اس نے یہ طریقہ نہیں بتایا جو ہمارے زمانہ میں رائج ہے، بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ قوم کا کوئی فرد اگر حوادث زمانہ کی زد میں آگیا ہو اور اس بری طرح آیا ہو کہ تنگدستی کے مردم آزار دیو نے اس کے حوصلہ کو پست اور ہمت کو سست کردیا ہو، اس کا پیر توڑ کر گرا دیا ہو اور اس میں اب اتنی طاقت نہ ہو کہ اپنے بل پر کھڑا ہو سکے، اس وقت قوم کا یہ فرض ہے کہ اس کی اعانت کرے، اس کو سرمایہ دے کر اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے بل پر کھڑا ہو سکے، محنت ومشقت کرکے اپنی روزی

پیدا کر کے کھائے اور اپنا فرض بجا لائے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لا یسئلون الناس الحافا	ان فقیروں کے لئے جو اللہ کے راستے میں روک دئے گئے، کہ زمین میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں رکھتے، نہ جاننے والا ان کو عدم سوال کی بنا پر تونگر خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کے بشرے سے پہچان لوگے وہ لوگوں سے الجھ کر نہیں مانگتے،

بہتر ہوگا کہ ارباب دولت خیرات وزکوٰۃ کی رقم کو اس طرح غلط طریقہ پر تقسیم کرنے کے عوض کوئی ایسی تجویز اس کے مصرف کی نکالیں جس سے فقراء کی تعداد کم ہو۔ اور لوگ اپنے ہاتھ کی کمائی سے گزر اوقات کیا کریں' اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اسی رقم سے صنعتی مدارس کھولے جائیں جن میں بالخصوص یتیم اور نادار طلبہ کو داخل کیا جائے۔ یا کوئی بڑا کارخانہ کھول دیا جائے اور جتنے فقراء آئیں ان کو اس میں داخل کر کے کام لیا جائے۔ غرض کہ ہر شہر والے اپنی حالت اور حیثیت کے مطابق کوئی ایسی مناسب تجویز عمل میں لائیں جس سے ملک وقوم دونوں کا فائدہ ہو۔

مردوں کی طرح ہماری عورتوں کو بھی کاری کے روگ نے طرح طرح کی مصیبتوں میں پھنسا رکھا ہے، آج سے چند سال پیشتر یہ حالت تھی کہ عورتیں خانہ داری کے تمام امور کو بذات خود انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ وہ دھان تک کوٹ لیا کرتی تھیں اور چکی پیستی تھیں، لیکن جب سے

مشینیں ایجاد ہوئیں، ہماری طرح یہ بھی بیکاری کے پنجے میں پھنس گئیں اب تو گیہوں کی بجائے آٹا اور دھان کے عوض چاول خریدا جاتا ہے، صرف پکانے کی ایک زحمت باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن اب اکثر یہ شکایت بھی دفع ہو جاتی ہے، کیونکہ بعض بعض شہروں میں مامائیں رکھنے کا عام دستور ہو گیا ہے، غریب سے غریب آدمی بھی کم از کم ایک خادمہ ضرور رکھتا ہے، وہی کھانا پکاتی ہیں، پانی کھینچتی ہیں اور جھاڑو دیتی ہیں۔

ہم نے مانا کہ قانونی حیثیت سے عورتیں اس فرض سے سبکدوش ہیں، لیکن عرض یہ ہے کہ جس طرح مال اللہ کا فضل ہے اسی طرح قوت بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت عظمیٰ ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس سے کام لیں؟ اور اپنی زندگی کا ثبوت دیں آخر سلف کی عورتوں کے لئے بھی تو یہی قانون تھا، لیکن وہ اس طرح بیکار اور سست نہ تھیں محنت و مشقت کرتی تھیں، صنعت و حرفت سیکھتی تھیں، اپنی جائداد ملکیت کو بڑھاتی اور مذہبی و قومی کاموں میں خرچ کرتی تھیں حضرت فاطمہ کا ہاتھ چکی پیستے پیستے زخمی ہو گیا تھا، مہربان باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک خادمہ کی درخواست کرتی ہیں لیکن آنحضور اس کو رد کر دیتے ہیں، کیا حضرت فاطمہ آنحضور اور حضرت علی سے قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتی تھیں؟ اصل یہ ہے کہ اس زمانہ کے مرد اور عورت سب ہی سمجھتے تھے کہ زندگی نام ہے نقل و حرکت ہی کا۔

اب ذرا اسلاف کے مقدس حالات پر ایک نظر کیجئے، دیکھئے انھوں نے اس اصول کو کس طرح نبھایا، آنحضور کا ارشاد مبارک

ملاحظہ فرمائیے جتنے انبیاء آئے سبھوں نے بکریاں چرائیں اور میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں اجرت پر چرائی ہیں، آنحضور کی مبارک زندگی کو دیکھئے، آپ نے اپنی معاش کے لئے کسی طرح تجارت کی؟ دور دراز ملک کا سفر کیا اور اس میں کتنا کمال پیدا کیا، آپ کی خانگی زندگی یہ تھی کہ دست مبارک سے جوتیاں گانٹھ لیتے تھے کپڑے میں پیوند لگا لیتے اور گھر صاف کر لیا کرتے تھے، اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہ لیتے تھے، آج کتنے تعلیم یافتہ ایسے ہیں جو اس کام کو خود کرنا تو درکنار دوسرے کرنے والوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں،

صحابہ کرام کی جماعت کو دیکھئے اصولی حیثیت سے مہاجرین کا طبقہ مصروف تجارت نظر آئے گا اور انصار کو کاشتکاری میں سرگرم عمل پائیں گے، حضرت ابو بکرؓ تاجر تھے، ان کا بیان ہے کہ "میں قریش میں متمول تاجر تھا"، اسلام قبول کرنے کے بعد بھی آپ کا یہی مشغلہ رہا اور تجارتی مال لے کر آپ نے دور دراز ملک کا سفر کیا، چنانچہ آنحضور کی وفات سے ایک سال پیشتر تجارت کے خیال سے آپ بصرہ تشریف لے گئے تھے، مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد مجبوراً اس سے کنارہ کشی کرنی پڑی اور یہی حال حضرت عمرو حضرت عثمان وغیرہم کا بھی ہوا، حضرت عمر جب تک مکہ میں تھے ان کے حصول معاش کا اصلی ذریعہ تجارت تھا۔ مدینہ میں پہنچ کر زراعت بھی شروع کر دی تھی، اسی طرح حضرت عثمان کی معاش کا اصلی ذریعہ تجارت تھا، عرب میں ان سے بڑا اور دولت مند کوئی

تاجر نہ تھا، چنانچہ اس غیر معمولی دولت و ثروت کے باعث ان کو غنی کا خطاب دیا گیا، زراعت خود نہیں کرتے تھے لیکن اپنی زمین بٹائی پر دیتے تھے،

حضرت خباب زمانۂ جاہلیت میں لوہار تھے ذرا غور کیجئے سیدنا سلمان فارسی کی زندگی پر آپ مدائن کے گورنر تھے، لیکن بوریا بنا کر وجہ معاش پیدا کرتے، اکثر صحابہ محنت و مزدوری پر اوقات بسری کرتے تھے، پھاوڑا چلاتے چلاتے ایک صحابی کے ہاتھ سیاہ ہو گئے تھے، رسول اللہ صلعم نے دیکھا تو فرمایا "کیا تمھارے ہاتھوں پر کچھ لکھا ہوا ہے؟ بولے نہیں، بلکہ میں پتھر پر پھاوڑا چلاتا ہوں اور اس سے اپنے اہل و عیال کے لئے روزی پیدا کرتا ہوں، آپ نے یہ سن کر ان کے ہاتھ چوم لئے، اصحاب صفہ کا سارا دن تعلیم میں گزرتا تھا، فرصت کے وقت نہر سے شیریں پانی لاتے، رات میں جا کر جنگلوں سے لکڑیاں لاتے اور اسی سے اپنی معاش پیدا کرتے، ایک مرتبہ ایک صحابی نے آنحضور کی خدمت میں آکر سوال کیا آپ نے دریافت فرمایا تمھارے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟ بولے ایک کمبل اور ایک پیالہ ہے۔ آنحضور نے فرمایا "جاؤ اسے لے آؤ" جب وہ لے آئے تو آپ نے دو درہم میں نیلام کر دیا اور انھیں دے کر فرمایا ایک درہم کا غلہ خرید کر گھر میں رکھ اور ایک درہم میں بازار سے کلہاڑی خرید کر لاؤ، صحابی موصوف نے ایسا ہی کیا، آنحضور نے اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا "جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور فروخت کرو، پندرہ دن کے بعد میرے پاس آنا صحابی

موصوف جب پندرہ دن کے بعد آئے تو ان کے پاس دس درہم فاضل تھے آنحضورؐ نے فرمایا جاؤ اسی سے غلہ اور کپڑا خریدو، آئندہ سے سوال نہ کرنا،

ذرا نظر بصیرت سے دیکھئے یہ قدسیوں کا گروہ کس طرح اپنی معاش میں محنت و مشقت کرتا ہے حیف ہے ہم پر کہ ہم انھیں اسلاف کے اخلاف ہوکر اپنے طرزِ عمل سے ان کے دامنِ تقدس پر دھبہ لگاتے ہیں۔

یہ تو صحابۂ کرام کے واقعات تھے، اگر علماء سلف کے حالات پڑھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ لوگ اپنی معاش قوت بازو سے پیدا کرتے تھے اور ان کا رجحان خاطر اکثر تجارت کی طرف تھا، امام یونس بن عبید، داؤد ابن ابی ہند، وثیمہ، حافظ الحدیث مسدد البصری اور امام ابوحنیفہ یہ سب لوگ کپڑے کی تجارت کرتے تھے، امام ممدوح کی صدر دکان کوفہ میں تھی اور ان کے ایجنٹ جابجا ملک میں پھیلے ہوئے تھے، جو مال خرید کر صدر کو بھیجتے تھے، ہشام دستوائی بھی کپڑے کی تجارت کرتے تھے، دستوار اہواز کا پرگنہ تھا، وہاں سے کپڑے لاکر فروخت کرتے تھے، اسی لئے دستوائی لقب پڑ گیا، احمد بن خالد قرطبی جبہ فروش تھے، حضرتِ ابن عبداللہ بازار میں لین دین کرتے تھے، امام ذہبی سنار تھے، اسی لئے ان کا لقب ذہبی ہوا، ابو صالح سمان لکارد روغن زیتون اور روغن زرد کی تجارت کرتے تھے امام القراء حمزہ زیات کوفہ سے روغن زیتون حلوان کو لے جاتے وہاں سے پنیر اور اخروٹ لاکر کوفہ میں بیچتے، حسن بن ربیع کوفی امام بخاری کے

استاد بوریا بیچتے تھے، اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب بواری پڑگیا، امام ابن جوزی کے خاندان میں تانبے کی تجارت ہوتی تھی، آپ کبھی اپنے نام کے آگے صفار (ٹھیٹرا) لکھ دیتے تھے، حافظ الحدیث ابن رومیہ عطار تھے، اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب عطار ہو گیا، ابو یعقوب لغوی چوبی لٹھا فروخت کرتے اور محمد بن سلیمان گھوڑے کی تجارت کرتے تھے۔

علمائے سلف صنعت و حرفت سے بھی واقف تھے، ابو الفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور بڑھئی تھے، اس فن میں وہ بہت ماہر تھے اور کثرت سے ان کے پاس کام آتا تھا، بیمارستان کبیر شاہی شفاخانے کے اکثر دروازے ان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے، جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں انھوں نے درست کی تھی اور ان کی نگرانی کے متعلق انھیں تنخواہ ملتی تھی، ابن طاہر، امام ابن الخاضبہ، ابن الہیثم طبیب نامور اور ابو سعید نحوی کتابت کیا کرتے تھے، موخر الذکر دس ورق روزانہ لکھتے تھے، یہ کام کرکے عدالت قضاء میں اجلاس کرتے، انھیں اوراق کی اجرت پر بسر اوقات تھی۔

علمائے سلف اپنا کام خود کیا کرتے تھے، امام ابن طاہر جب فن حدیث کی تحصیل کے لئے امام حبال کی خدمت میں حاضر ہونے چلے تو لوگوں نے ان سے کہہ دیا کہ امام موصوف بازار سے اپنا کام خود کرلاتے ہیں وہاں بھی ان کو تلاش کرلینا۔ چنانچہ جب یہ ان کے شہر میں پہنچے تو پہلے بازاروں میں گشت لگائی، تلاش کرنے سے ان کو امام حبال ایک عطار کی دکان پر اس حالت میں ملے کہ دامن میں وہ تمام

ضروریات کی چیزیں بھری تھیں، جو بازار سے خرید کر لائے تھے، اس وقت امام موصوف کی عمر اناسی برس کی تھی،

امام بخاری نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی اس کی تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے ان میں خود امام بخاری بھی شامل تھے، یہ امام ربانی اپنے سر پر اینٹیں رکھ کر لے جاتے اور معماروں کو دیتے، ایک شاگرد نے عرض کی کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے؟ امام ممدوح نے فرمایا کہ اس میں میرا بہت فائدہ ہے،



پانچواں باب

بنی نوعِ انسان کے ساتھ حسنِ سلوک

حکماء نے کہا ہے کہ "انسان بالطبع تمدن پسند واقع ہوا ہے" اس کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور اسبابِ معیشت فراہم کرنے کے لئے اپنے ابنائے جنس سے انس و الفت رکھنا ضروری ہے اکثر و بیشتر حیوان ایک طرح سے جماعتی زندگی بسر کرنے میں انسان کے شریک ہیں، لیکن ان کے طرز زندگی اور مشارکت کی ترتیب وکیفیت مختلف و جداگانہ ہے؛

قرآن مجید نے اجتماعِ انسانی اور اس کے آداب و اصول کو اکثر مقامات میں بیان کیا ہے، قوموں کی باہمی برتری و شرف کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اور ہم نے تمھیں خاندانوں اور قبیلوں میں منقسم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں

بہتر وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے

تعاون اور امداد باہمی کی اس طرح ترغیب دی گئی ہے:۔

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

اور بھلائی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی امداد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہمی تعاون نہ کرو

اسی طرح قریبی رشتہ داروں، خاندان والوں اور سسرال کے حالات اور طرز معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آنحضور علیہ السلام نے اسلامی جماعت کے افراد کے درمیان باہمی تعاون و کفالت کو اجتماعی ادب اور اس کی بنیادی حقیقت قرار دی ہے:۔

المومن للمومن کالبنیان یشتد بعضہ بعضاً

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے بنیاد کی طرح ہے جس کو ایک دوسرا مضبوط و استوار کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتا ہے:۔

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم

یقیناً تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم کمثل الجسد اذا اشتکی عضو منہ تداعی

مسلمانوں کی مثال ان کے باہمی تعاون و مودت اور ان کے آپس کی رحمدلی میں ایسی ہے جیسے کہ ایک جسم جب

له سائرہ بالحمیٰ والسھر — اس کا کوئی عضو بیمار پڑتا ہے تو جسم کے تمام اعضا کو بخار اور بیداری لاحق ہو جاتی ہے

معاشرت کی اولین کڑی ازدواج ہے، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں سے قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا۔

النکاح من سنتی ومن یرغب عن سنتی فقد رغب منی۔ — نکاح میری سنت میں سے ہے جو شخص میری سنت سے اعراض کرے اُس نے مجھ سے روگردانی کر لی۔

ازدواج جماعتی توازن کو برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے حدیث میں آیا ہے۔

من تزوج فقد احرز شطر دینه فلیتق اللہ فی الشطر الثانی۔ — جس نے شادی کر لی اس نے اپنے دین کا ایک حصہ محفوظ کر لیا، اب دوسرے نصف حصہ میں اللہ سے ڈرتا رہے،

شادی نہ کرنے کی اس طرح تہدید اور اس کے کرنے کی جو ترغیب دلنشین اور حکیمانہ پیرایہ میں دی گئی ہے اس کا منشاء عین فطری قوانین اور طبعی و عمرانی اصولوں کے مطابق ہے۔ اسلام نے جس طرز زندگی اور نظام جماعت کے جن طریقوں کو پیش کیا ہے ان کا دارو مدار زیادہ تر افراد کے طبائع کی اصلاح و تہذیب اور ان کے اخلاق و کردار اور سیرت کی تعمیر پر ہے، اس کی اولین اصلاحی

کوشش شادی میں مضمر ہے۔

شادی کے اجتماعی فوائد جماعت کی تنظیم اور تمدن و تہذیب کی ترقی و اصلاح کے لئے شادی سے جو فوائد مترتب ہوتے ہیں وہ پانچ ہیں)۔

(۱) بقاء نسل اور جنس کی حفاظت کے لئے اولاد کی پیدا وار ضروری ہے، شادی کے فلسفہ میں یہی ایک اصل و بنیاد ہے تاکہ دنیا انسانوں سے کبھی خالی نہ رہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا یہی مقصد ہے "تناکحوا تناسلوا" یا ہمی شادی بیاہ کرو اور نسل کا سلسلہ جاری رکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وإمائکم ان یکونوا فقراء یغنہم اللہ من فضلہ ۔

تم اپنی جماعت کی بیواؤں نیک بندوں اور اپنی لونڈیوں سے نکاح کرو، اگر وہ فقیر و محتاج ہوں تو اللہ ان کو اپنے فضل و کرم سے مالدار کردے گا،

ان ہی الٰہی قوانین اور طبعی فرائض و واجبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہ تو اسلام نے رہبانیت کا حکم دیا اور نہ مسلمانوں کے کسی دور میں شادی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی، یا سوائے عذر شرعی کے دائمی تجرد پسندانہ زندگی کی اسلام نے کبھی تعلیم دی،

(۲) شادی کا دوسرا فائدہ طبعی ضرورت کو پورا کرنا ہے تاکہ خواہشات نفسانی کی آگ سرد پڑ جائے، نفس انسانی جذبات فاسدہ سے

محفوظ رہے، افراد کی سیرت عالیہ کی تعمیر ہو اور شرعی مطلوبہ عفت و عصمت کی بنیادیں محکم و استوار ہو جائیں، اس کے علاوہ شادی سوسائٹی کے اندر فاسد اخلاق اور مہلک عادتوں کے وقوع پذیر ہونے کو روکنے کا بہترین ذریعہ اور اہم حفاظتی تدبیر ہے،

(۳) شادی کا مقصد سکون نفس، راحت قلب اور نشاط روح ہے، تاکہ انسان اپنے حواس کو ناجائز کاموں میں صرف نہ کرے، اپنے دن کو نشاط اور فراغ دلی کے ساتھ اپنے معاشی کاموں میں گزارے اور زندگی کی مطلوبہ مشکلات کو برداشت کرے،

حدیث میں آیا ہے،

لا یکون العاقل طامعًا الا فی ثلاث، تزوّدٍ لمعاد و حرفة لمعاش ولذة فی غیر محرم

عاقل و دانا صرف تین چیزوں کی خواہش کرے، آخرت کا زادِ راہ تیار کرنا، اپنے معاش کے لئے کوئی پیشہ اختیار کرنا اور غیر محرم سے لذت حاصل کرنا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں "تم اپنے دلوں کو ایک ساعت راحت بخشو، کیوں کہ جب وہ سختی سہتے ہیں تو اندھے ہو جاتے ہیں"

(۴) گھریلو انتظام مثلاً کھانا پکانا، پوشاک، بستر، برتنوں کی صفائی اور گھر کے دیگر لوازمات کی فراہمی، اسی لئے لڑکیوں کو صحیح گھریلو تربیت دینا واجب ہے، کیونکہ جب وہ قوم کے مردوں کی عورتیں بنیں گی تو ان کو اس وقت اپنے گھر کے تمام فرائض

وواجبات کا سیکھنا ضروری ہوگا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من کان لہ ثلاث بنات فانفق علیھن واحسن الیھن حتی یغنیھن اللہ عنہ اوجب اللہ لہ الجنۃ البتۃ البتۃ۔

جس کے پاس تین لڑکیاں ہوں ان پر خرچ کیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا یہاں تک کہ اللہ نے اس کو ان سے بے نیاز کردیا تو اللہ اس کے لئے جنت واجب کردے گا۔

یہاں احسان سے مراد ان کی اچھی تربیت ہے،

(۵) مجاہدۂ نفس اور تلاش روزگار اور کسب حلال میں زیادہ جدوجہد کرنے پر آمادہ کرنا، حدیث میں آیا ہے

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

تم میں سے ہر ایک محافظ ہے اور ہر ایک اپنی رعایا کا ذمہ دار۔

آداب زوجین

شوہر اور بیوی کے درمیان حسن معاشرت اور خوشگوار تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے اسلام نے ان دونوں کے حقوق و آداب مقرر کردئے ہیں شوہر پر کیا ذمہ داریاں ہیں اور بیوی کو کن چیزوں کا پاس لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان دونوں کے اصول و آداب بے شمار ہیں جن میں سے یہاں چند پر روشنی ڈالی جاتی ہے:۔

(۱) میاں اور بیوی کے درمیان حسن معاشرت اور محبت والفت کو خوش گوار ہونے کے لئے اخلاق حسنہ کی ضرورت ہے اللہ تعالی فرماتا ہے،

وعاشروھن بالمعروف — اور عورتوں سے بھلائی اور نیکی کے ساتھ میل جول کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا والطفھم باھلہ — وہ مسلمان ایمان میں زیادہ کامل ہے جو بہترین اخلاق سے آراستہ ہو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ حد درجہ لطف وعنایت سے پیش آئے۔

(۲) خرچ میں بہرحال اعتدال کے دائرہ سے تجاوز نہ کریں، یہی اصول مرد اور عورت سے ہر چیز میں مطلوب ہے،

(۳) غیرت وحمیت کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں، غیرت کا مطلب یہ ہے کہ اُن ابتدائی اور بنیادی امور سے انجان نہ ہوں، جن کا انجام آئندہ خطرناک صورت اختیار کرلے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدگمانی میں مبالغہ نہ کیا جائے۔

اِنّ بعض الظّن اثم — کیوں کہ بعض بدگمانی گناہ ہے،

(۴) شوہر کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو دینی و دنیوی ضروری علوم و معارف کی تعلیم دے،

(۵) اپنی اولاد کو ادب سکھلائیں، ان کو بہترین تعلیم و تربیت سے سنواریں،

(۶) اگر میاں بیوی میں کوئی اختلاف اور ناچاقی کی صورت پیدا ہو جائے تو رشتہ داروں میں سے کوئی شخص حکم بن کر دونوں کے درمیان سمجھوتہ کرادے۔

فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا — ایک حکم شوہر کے رشتہ داروں میں اور ایک حکم بیوی کے رشتہ داروں میں سے روانہ کرو

لوگوں کے اختلافات کو عموماً اور میاں بیوی کی نااتفاقیوں کو خصوصاً درست کرنا اور ان کے درمیان مصالحت کرنا ایک مقصد عظیم ہے جس کی ترغیب پیغمبر اسلام نے دی اور اس کی طرف دعوت دی

(۷) شوہر کے لئے ایک سے چار بیویاں موجود ہوں تو اس کا فرض ہے کہ ان سب کے درمیان عدل کرے اور اُن شروط و قوانین کو ملحوظ رکھے جو کثرت ازدواج کے جواز میں پیش کئے گئے ہیں

افرادِ خاندان کے ساتھ حسن معاشرت

پیغمبر اسلام نے والدین سے اچھا برتاؤ کرنے بھائیوں اور بہنوں سے نرمی اور عنایت سے پیش آنے اور تمام رشتہ داروں کے ساتھ حسن معاملہ کرنے کی ترغیب دی ہے، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے، ان کے حقوق ادا کرنے، ان کے ساتھ ادب کو نگاہ رکھنے، صلہ رحمی کرنے اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت و مودت کرنے کے متعلق متعدد قرآنی آیات اور بیشتر نبوی احادیث وارد ہوئی ہیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلہ رحمی کی فضیلت میں فرماتے ہیں:-

من سرہ ان ینسأ لہ فی اثرہ ویوسع علیہ فی رزقہ فلیصل رحمہ — جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر میں تاخیر کی جائے اور اس پر رزق کے دروازے وسیع کردیے جائیں تو

اس کو چاہیئے کہ صلہ رحمی کرے۔

والدین کی نافرمانی اور قرابت داروں پر ظلم و ستم ان رذیل خصلتوں اور خلاف انسانیت حرکتوں میں سے ہے جن سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے،

اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بالخصوص اور بنی نوع انسان کے ساتھ بالعموم میل جول رکھنے کے بہت سے حقوق و آداب ہیں، جن سے ہر انسان کو آراستہ ہونا لازمی ہے کیونکہ انسان بذات خود کم صحبت کرتا ہے بلکہ اس کا اکثر وقت اوروں کے ساتھ گذرتا ہے، اجتماعی محبت و الفت میں وسیع پیمانہ پر اثرانداز ہونے والی چیز عام طور سے حسن خلق ہے، دین اسلام نے اس پر اکثر مقامات میں زور دیا ہے، کیوں کہ یہ باہمی محبت، اتحاد اور الفت کا موجب ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی مدح سرائی حسن خلق کے ذریعہ کی ہے

وانك لعلى خلق عظيم — یقیناً آپ عظیم الشان اخلاق کے مالک ہیں۔

حدیث شریف میں وارد ہے۔

اكثر ما يدخل الناس الجنة تقوى الله وحسن الخلق — اللہ کا تقویٰ اور حسن خلق اکثر و بیشتر لوگوں کو جنت میں داخل کر دیتے ہیں

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے۔

احسن الحسن الخلق الحسن — حسن صورت حسن سیرت سے ہے،

حسن اخلاق اُس نفسی تقویٰ شعاری کا نام ہے جو نفس مطمئن

اور ذوق سلیم کے ہم آہنگ ہے جو بہترین معاشرتی حالات سے آراستہ ہونے سے حاصل ہوتا ہے خواہ دینی طریقہ سے ہو یا اجتماعی آداب کے وسیلہ سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لو انفقت ما فی الارض جمیعًا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم

اگر تو زمین کی تمام چیزوں کو بھی خرچ کرتا تو ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان الفت پیدا کردی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہونے والوں کی مدح میں ارشاد فرماتے ہیں،

اقربکم منی مجلسا احاسنکم اخلاقا الموطئون اکنافا الذین یالفون و یولفون

میری مجلس کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق بہترین ہوں، جو اپنے بازوؤں کو جھکائے رہتے ہیں، یہ الفت کرتے ہیں اور دوسرے بھی ان سے الفت کرتے ہیں۔

دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا۔

المومن الف مالوف ولا خیر فیمن لا یالف ولا یولف

مسلمان سراپا الفت ہے اور دوسروں کی الفت کا سامان اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو نہ الفت کرتا ہے اور نہ اس سے کوئی الفت کرسکتا ہے۔

دوستی کے حقوق و آداب

جماعت انسانی کے افراد مختلف ذوق اور گوناگوں مسلک رکھنے والے ہوتے

ہیں، دوستی افرادِ انسانی کو ہم ذوق و ہم مشرب بنانے اور مختلف طبائع کے مابین اتحاد و یگانگت کے رشتہ کو مضبوط و مربوط کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، انسانی نفوس میں باہمی کشش اور جاذبیت رکھی گئی ہے جس کا مظہر ہم آہنگی و رفاقت ہے، لوگوں کی طبیعتیں مختلف، مزاج جدا گانہ اور شکلیں الگ ہوتی ہیں، جس میں قریبی مشابہت اور جاذبیت رہے گی اسی قدر دوسرا اس کی طرف کشاں کشاں چلا آئے گا۔

دوستی کے چند حقوق و آداب ہیں، حق دوستی کو ادا کرنے کے لئے ان کا لحاظ ضروری ہے، وہ حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) دوست کو مال میں حق پہنچنا چاہیئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

مثل الاخوین مثل الیدین تغسل احدھما الاخریٰ — دو بھائیوں کی مثال دونوں ہاتھوں کی طرح ہے۔ کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو دھوتا ہے۔

آنحضورؐ کی مراد یہ ہے کہ مالی شعبوں میں قرض کے ذریعہ دستگیری کی جائے اور امداد کے لئے ہاتھ بڑھایا جائے خواہ اس کے لئے اپنے اوپر ایثار ہی کیوں نہ کرنا پڑے، جیسا کہ عہد نبوی میں اسلامی مروت درجۂ کمال تک پہنچ چکی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ — اور مقدم رکھتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر خواہ ان پر فاقہ ہی ہو۔

(۲) بھائیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں نفسی اعانت کرنا

(۳) دوستوں کی عیب جوئی، ان کی نکتہ چینی اور ان کی تحقیر

کرنے سے زبان پر مہر سکوت لگانا، ان کی جان یا آبرو یا مال میں ایسا رشک و حسد کرنے سے باز رہنا جس کو وہ ناپسند سمجھتے ہوں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

أیحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتًا	کیا تم میں سے کوئی اس کو پسند کرے گا کہ اپنے بھائی کا مردار گوشت کھائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ولا تجسسوا ولا تحسسوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباداللہ اخوانا	تم آپس میں ایک دوسرے کا کھوج نہ کرو، کان دھرے نہ رہو، باہمی بغض نہ رکھو، ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو اور تم اللہ کے بندے اور مخلص دوست بن جاؤ،

(۴) شیریں کلامی کرنا، بھائیوں کی خوبیاں اور ان کے محاسن کو شمار کرنا، دوستوں کے درمیان بات چیت میں لطیفہ گوئی کو رائج کرنا، ادبی ذوق کو تازہ کرنا اور فحش گوئی اور غیبت سے پرہیز کرنا،

(۵) معمولی لغزشوں کو درگزر کرنا اور ادنیٰ گستاخیوں سے چشم پوشی اختیار کرنا جن سے کوئی انسان محفوظ نہیں، نیز اس کا لحاظ رہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو قطع تعلق اور مفارقت کا موجب ہو،

(۶) اخلاص و وفا یہ دونوں دوستی کے دوام و پختگی میں نہایت قوی عنصر ہیں، اخلاص کی وجہ سے رشتۂ مودت کبھی نہیں ٹوٹتا خواہ

جسمانی دوری ہو۔ وفا کی وجہ سے زندگی میں، اور موت کے بعد محبت کے قدم ثابت و پائدار ہوتے ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

قلیل الوفاء بعد الممات   موت کے بعد کی تھوڑی سی وفا
خیر من کثیرہ حال للحیاۃ   زندگی کے زمانے کی زیادہ وفا
داری سے بہتر ہے۔

(۷) میانہ روی و اعتدال پسندی اور تکلف سے احتراز بہترین آداب اور عظیم الشان اصولوں میں سے ہیں، بعض حکماء نے کہا ہے کہ "جو شخص اپنے دوستوں کے نزدیک اپنے آپ کو اپنی طاقت سے بڑھ کر پیش کرے تو وہ بھی گنہگار رہا اور اُنھوں نے بھی گناہ مول لیا، جو اپنی قدرت کے مطابق پیش کرے تو خود بھی تکلیف اٹھایا اور ان کو بھی زحمت دی اور جو اپنی طاقت سے کم پیش کیا تو وہ محفوظ رہا اور وہ بھی بچ رہے" میانہ روی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ تکلف سے کنارہ کشی نہ اختیار کرلی جائے۔

لوگوں میں الفت و محبت کو زیادہ کرنے والی چیزیں یہی ہیں سلام کو عام کرنا، نرم کلامی، زبان کو ایذا رسانی سے محفوظ رکھنا اور اعضاء و جوارح سے کسی کو تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، حدیث کا مصداق بھی یہی ہے:۔

المسلم من سلم الناس   مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور
من لسانہ و یدہ   ہاتھ سے لوگ صحیح سالم رہیں،

نیز بعض لغزشوں سے درگزر کرنا، سن رسیدہ اور ذی مرتبت

اشخاص کی قدر و منزلت، نیکی و احسان، کمزوروں اور مسکینوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ، مظلوموں کی داد خواہی، برائیوں کا ازالہ اور لوگوں کے درمیان مصالحت یہ تمام دوستی اور مودت میں اضافہ کرنے والی چیزیں ہیں،

عام معاشرتی امور و معاملات میں صداقت، راست بازی، امانت و دیانت داری لین دین میں عدل و انصاف، عہد و پیمان میں وفا کا پاس، اپنے اوپر انصاف ان تمام اصول کی نگہداشت ضروری ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابودردار سے فرماتے ہیں!۔

یا ابا الدرداء أحسن مجاملة من جاورك تكن موافقا واحب للناس ماتحب لنفسك تكن مسلما

اے ابودردار! اپنے ہمسایہ سے حسن دوستی سے پیش آ جو تیرے مزاج کے موافق ہو جائے، اور لوگوں کے لئے وہ چیز پسند کر جو تو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو پورا مسلمان ہو جائے گا۔

اسلام میں حقوقِ ہمسائگی

اسلام نے جس نظام کی بنیاد ڈالی تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ ملت اسلامی کو ایک خاندان کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ کشمکش حیات کی تمام دشواریوں پر قابو پایا جا سکے، وہ تمام اسباب و وسائل، جن سے اس قسم کے تعاون کی راہیں کھلتی ہیں،

اسلام نے ان کی طرف دعوت دی، ان پر گامزن ہونے کے لئے آمادہ وطیار کیا، کہا گیا۔

تعاونوا علی البر والتقوی	نیکی اور پرہیزگاری کے معاملہ
ولا تعاونوا علی الاثم	میں ایک دوسرے سے تعاون
والعدوان	کرو، گناہ وظلم سے نہیں،

ان اسباب ووسائل میں حقوق ہمسائگی کا پاس ایک بنیادی چیز ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو صرف اسی ایک چیز کی تکمیل امت کو ایسی وحدت میں تبدیل کرسکتی ہے، جسے "بنیان مرصوص" کہنا بالکل بجا ہوگا، اور جس میں دوسروں کی ریشہ دوانیوں کے لئے کوئی راہ باقی نہ رہے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا یومن عبد حتی یامن	کسی کے ایمان کی تکمیل اس وقت
جارہ بوائقہ	تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ
	اس کا پڑوسی اس کی ہلاکت باریوں
	سے مامون ومطمئن نہ ہو جائے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ تکمیل ایمان کے لئے ایک خاص شرط کا وجود ضروری ہے، اب سوچنا یہ ہے کہ ایمان ہی وہ چیز ہے، جس پر دنیا وآخرت کی بھلائیوں کا دارومدار ہے، اور ایمان کی تکمیل اس بات پر موقوف ہے کہ مومن کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے محفوظ ومامون ہو جائے تو معلوم ہوا کہ پڑوسی کی مامونیت ایک اہم ترین شے ہے،

آنحضرتؐ نے پڑوسی کی تین قسمیں کی ہیں :-

(۱) جس کا ایک حق ہو۔ (۲) جس کے دو حق ہوں۔
(۳) جس کے تین حق ہوں۔

تین حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ قرابت دار بھی ہو اس کے تین حق اس طرح پر ہیں،
(۱) حق ہمسائگی۔ (۲) حق اسلام۔ (۳) حق قرابت۔

دو حق والا وہ پڑوسی ہے جو مسلمان ہو اس کا ایک حق "ہمسائگی" دوسرا حق "اسلام"

ایک حق والا وہ پڑوسی ہے، جو غیر مسلم ہو،

نظام اجتماعی کی یہ کس قدر بلند سطح ہے، جس کے اوپر کسی اور چیز کی گنجائش نہیں، سلسلۂ حق ہمسائگی کی یہ درازی کہ جس میں غیر مسلم بھی پرو دے گئے ہوں، زمانہ قبل اسلام میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آتی، اس لئے یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ اسلام نظم اجتماعی کی ان تمام راہوں کی پاسبانی کرتا ہے، جو انسانیت کے ہر شعبہ کے لئے ضروری ہیں اور مقتضائے مدنیت کی یہی آخری انتہائی منزل ہے،

متمدن زندگی بسر کرنے والا انسان، ناممکن ہے، کہ ارد گرد کچھ ایسے پڑوسی نہ رکھتا ہو جن کا بلحاظ مذہب مختلف ہونا یقینی نہ ہو، اور جن سے اس کا مختلف قسم کا معاملتی تعلق نہ ہو، تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ ان کے ساتھ معاملہ تو جائز ہو، لیکن ان کے ساتھ اچھا سلوک جائز نہ ہو، اسی لئے اسلام نے اس معاملہ میں بھی مساوات کا حکم دیا ہے خواہ مسلم ہوں، یا غیر مسلم،

آنحضرت صلعم نے اہل کتاب سے تبادلۂ ملاقات، ان کی

شادی وغمی میں شرکت، ان کے ساتھ اکل و شرب، حتیٰ کہ شادی بیاہ کے تعلقات کو بھی جائز قرار دیا ہے، دوسرے مذاہب کے لوگوں نے مسلمانوں کی ہمسائگی میں ان تمام حقوق کو ہمیشہ حاصل کیا، جو ایک قلت ایک شریف و متمدن کثرت سے حاصل کرسکتی ہے،

مجاھدؒ کہتے ہیں، میں عبداللہ بن عمر کے پاس موجود تھا آپ کا غلام بکری بھون رہا تھا، آپ نے فرمایا، جب بھون چکو تو پہلے ہمارے یہودی پڑوسی کو دو، اور اس جملہ کو کئی مرتبہ دہرایا، خادم نے عرض کیا، کئی مرتبہ فرمائیے گا ؟ آپ نے جواب دیا، کہ رسول اللہ ہم لوگوں کو پڑوسی کے متعلق ہمیشہ وصیت فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا، کہ کہیں آپ پڑوسی کو وارث بھی نہ بنا دیں،

غور کرنا چاہیے ... بن عمر نے اپنے یہودی پڑوسی کا کس قدر لحاظ کیا، اپنے مذہب اور اس میں کوئی تفریق نہ کی، بلکہ خادم کو حکم دے دیا کہ پہلے یہودی کو پہنچنا چاہیے، اس حکم سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ خادم کو کہیں یہ شبہ نہ ہو جائے کہ یہودی اپنی یہودیت کی بنا پر ہمسائگی کے حقوق سے مستثنیٰ ہوگا، اور اسی کے ساتھ آنحضرت صلعم کا قول نقل فرمادیا، یہ نظم و تمدن کا کتنا کھلا ہوا ثبوت اسلامی اصول سے ملتا ہے ؟

حقوق ہمسائگی کے سلسلہ میں سب سے اہم نقطہ جو ایک مسلمان کے لئے جاذب توجہ بن سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے پڑوسی کی شہادت کو خدا کے ہاں نیکی و بدی کا معیار قرار دیا، ابن عمر سے

روایت ہے۔

"ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ (صلعم) جب میں کوئی نیکی یا بدی کروں تو میں اسے کس طرح جان سکتا ہوں، آپ نے فرمایا، جب تم اپنے پڑوسیوں کو کہتے ہوئے سنو، کہ تم نے نیکی کی، یہ سمجھ لو کہ تم نے نیکی کی، اور جب تم یہ کہتے ہوئے سنو کہ تم نے برائی کی تو سمجھ لو، کہ تم نے برائی کی"۔

سوچو، اور غور کرو، کہ اس حدیث کو سن کر کس شخص کی یہ مجال ہوگی، کہ اپنے پڑوسی کو اپنی مذمت میں مصروف دیکھے، اور اس پر کوئی اثر نہ ہو، نہیں، بلکہ اس کی انتہائی کوشش اس بات پر صرف ہوگی کہ اپنے پڑوسی کی مذمت تعریف سے بدل جائے، عمرو بن شعیب (چند واسطوں سے) آنحضرت صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:۔

أتدرون ما حق الجار؟	کیا تم لوگ جانتے ہو، پڑوسی کا کیا حق ہے؟
اذا استعان بك اعنته	اگر تم سے مدد چاہے تو اس کی مدد کرو،
وان استنصرك نصرته	اگر تم سے قرض مانگے تو قرض دو،
وان استقرضك اقرضته	اگر محتاج ہو تو اس کو سامان بہم پہنچاؤ،
وان مرض عدته، وان	مریض ہو تو اس کی عیادت کرو، مر جائے تو
مات شيعت جنازته	تو اس کے جنازے میں شریک ہو،
وان اصابه خير هنأته	اُسے کوئی اعزاز ملے تو مبارک باد دو،
وان اصابته مصيبة عزيته	مبتلائے مصیبت ہو تو ہمدردی کرو،

وَلَا تستطل علیه بالبناء فتحجب عنه الریح الا باذنهٗ ولا تؤذه و اذا اشتریت فاکهة فاهد لهٗ وان لم تفعل فادخلها سرًا ولا یخرج بها ولدك لیغیظ بها ولدهٗ ولا تؤذه بقتار قدرك الا ان تغرف له منها (ثم قال) أتدرون ما حق الجار؟ والذی نفسی بیده لا یبلغ حق الجار الا من رحمه الله	اپنی عمارت کو اس قدر اونچا نہ بناؤ کہ اس کے مکان کی ہوا رک جائے مگر ہاں اس کی اجازت سے اس کو تکلیف نہ دو، پھل خریدو تو اس کو ہدیتًہ بھیجو، اگر ایسا نہ کرو تو چھپا کر لاؤ۔ لیکن تمہارے بچے اس کو لے کر باہر نہ نکلیں کہ اس (پڑوسی) کی اولاد کو رنج و تکلیف پہنچے گی، پھر آپ نے فرمایا۔ تم جانتے ہو، پڑوسی کا کیا حق ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، پڑوسی کے حق کو پورا پورا وہی ادا کرسکتا ہے جس پر اللہ مہربان ہو۔

اس حدیث میں پڑوسی کے حق کے متعلق پوری تفصیلات موجود ہیں کسی گوشہ کو نہیں چھوڑا گیا، لیکن ہوسکتا ہے کہ آج کی تہذیب و تمدن کے پیش نظر کوئی شخص اس وہم میں مبتلا ہو جائے کو حقوق کی یہ صورت ادا کرنا ناممکن ہے، مگر اس کا وہم ایک خیال باطل سے زیادہ نہیں، اس لئے کہ یہ تمام حقوق مقتضائے عقل کے مطابق ہیں، معمولی عقل رکھنے والا انسان صرف عقل پر اعتماد رکھتے ہوئے

پڑوسی کے حقوق کی اس تفصیل کو بالکل ضروری قرار دے گا۔ بشرطیکہ وہ بہیمیت و حیوانیت کے اثرات کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے دل سے نکال دے،

اب ذرا تفصیل کے ساتھ اس اجمال پر نظر ڈالئے' بھلا سوچئے' کہ یہ کتنی پست ہمتی ہوگی کہ کسی افتادِ ناگہانی سے تنگ آکر ایک پڑوسی آپ سے امداد کا طالب ہو اور آپ انکار کردیں' اس کے گھر میں چور یا بھیڑیا گھس آیا ہے' وہ آپ سے مدد کا خواستگار ہے' اور آپ منہ پھیر لیتے ہیں' پروا بھی نہیں کرتے' کہ وہ درندے کی نذر ہو جائے گا' وہ اپنی پریشانی میں چندے آپ سے قرض کے طور پر مانگتا ہے' مگر آپ دینے سے انکار کرتے ہیں' اس کے اہل و عیال بھوک کے پنجے میں گرفتار ہیں' آپ قدرت کے باوجود اس کی مصیبت کا ازالہ نہیں کرتے وہ بیمار ہے' آپ سے دلجوئی و غمخواری کا طالب ہے مگر آپ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے' وہ مرچکا ہے۔ مگر آپ چند قدم اس کے جنازے کے ساتھ چلنے میں بخل کرتے ہیں' اس کے ہاں کوئی خوشی کی بات ہوئی ہے اور آپ ایک کلمۂ تہنیت کے لئے تیار نہیں' وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے' لیکن اس سے ہمدردی کرنے میں آپ کی شان گھٹتی جاتی ہے' آپ اپنے مکان کو بلند کرکے اس کے مکان سے دھوپ اور ہوا کو روک دیتے ہیں اور ذرا بھی اپنی دنارتِ طبع کا احساس نہیں کرتے' آپ اپنی اولاد کے لئے الوانِ نعمت مہیا کرتے ہیں' لیکن پڑوسی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی آپ کو کوئی پروا نہیں ہوتی'

اگر آپ ان مذکورہ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں تو کیا یہ آپ کی کوتاہی اور بے راہ روی نہیں ہے؟ ہے اور یقیناً ہے، تو پھر موجودہ تہذیب و تمدن میں اس کے وجوہ جواز کی تلاش عبث و بیکار ہے، اس لئے کہ یہ تہذیب تو نام ہی ہے، سخت دلی، بخل، لاپروائی، غیرانسانیت، اور بے تعلقی کا، حقیقت یہ ہے کہ تہذیب حاضرہ ان تمام خصائل حسنہ سے ناآشنائے محض ہو چکی ہے اور اسی غفلت شعاری کا نتیجہ ہے کہ قوم کی قوم مبتلائے مصیبت ہے فقیروں کو مالداروں کی ثروت ایک آنکھ نہیں بھاتی، ناکاروں کو کامیابوں پر حسد ہے، ایک دوسرے کو مبتلائے آلام کرنے کی فکر میں غلطاں ہے۔ صاحب حاجت اس فکر میں ہے کہ کس طرح نظام عالم میں برہمی پیدا کر کے حصول مطلب کی سعی کرے ان بیماریوں کا یورپ خصوصیت سے بے انتہا شاکی ہے، بلکہ ان بیماریوں کے یوماً فیوماً بڑھتے رہنے سے وہ اس قدر خوف زدہ ہے کہ حد بیان سے باہر ہے، یہ سب موجودہ تمدن کی برکات ہیں، ورنہ جیسا کہ بیان کیا گیا، اسلام نے حقوق ہمسائگی کو اس جامعیت کے ساتھ بیان کیا اس سے زیادہ ناممکن، اس نے پڑوسی کی ایذا رسانی کو سخت ترین جرم قرار دیا، یہاں تک کہ حکم دے دیا، کہ ایسے لوگوں کے اعمال صالحہ برباد و ضائع ہو جائیں گے، آن حضرت صلعم سے عرض کیا گیا کہ

"فلاں شخص دن کو روزہ رکھتا ہے، رات کو مصروف عبادت رہتا ہے، لیکن پڑوسی کو تکلیف دیتا ہے"۔

تو آپ نے فرمایا "دوزخ میں داخل کیا جائے گا"

اس سلسلہ میں سخت سے سخت تنبیہ جو کی جا سکتی تھی، کر دی گئی۔ فرمایا:

"اگر تم نے پڑوسی کے کتے کو مارا، تو تم نے گویا اپنے پڑوسی ہی کو ایذا پہنچائی"

مسلمانوں نے اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا تھا، حالت یہ ہو گئی تھی، کہ اتنی تکلیف بھی پڑوسی کو پہنچانا گوارا نہ تھا، جتنی کہ اس کی جانب سے پہنچتی تھی، ایک روایت ہے کہ ابن مسعودؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ "مجھے میرا پڑوسی تکلیف پہنچاتا ہے، گالیاں دیتا ہے، اور تنگ کرتا ہے" آپ نے فرمایا "جاؤ، اگر وہ تیرے معاملہ میں خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے، تو تم ایسا نہ کرو" آپ نے اس کو بدلہ لینے کی اجازت نہیں دی، اس لئے کہ پڑوسی کی ایذا رسانی پر اس طور پر اغماض کرنا کہ وہ از خود نادم و شرمندہ ہو، قرآن کی اس آیت کا مصداق بنتا ہے:۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم

بطریق احسن مدافعت کرو، پس وہ شخص جس سے تمہارا جھگڑا ہے وہ ایک مخلص دوست بن جائے گا۔

اگر ابن مسعودؓ یہ مشورہ دیتے کہ تم بھی ویسا ہی کرو، جیسا کہ پڑوسی نے کیا ہے، تو درحقیقت یہ اصول تمدن پر ایک کاری ضرب ہوتی، اس لئے کہ یہ معاملہ پھر ایک تک محدود نہ رہتا، بلکہ ہر شخص اپنے پڑوسی کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا، لہذا ابن مسعودؓ نے اس مصیبت کا پہلے ہی سے اندازہ کر کے اس کی کم سے کم صورت کا بھی سد باب کر دیا، اور آنے والے کو صبر کی نصیحت کی، یہ دراصل آنحضرت صلعم کے

اس ارشاد کی تعمیل ہے جو ایک آنے والے شخص سے فرمایا گیا تھا جس نے پڑوسی کی سخت گیریوں کی شکایت کی تھی، اور آپ نے اسے تلقین صبر کی تھی، وہ کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، مگر ہر مرتبہ صبر کی ہدایت کی گئی، البتہ جب چوتھی بار آیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنا اسباب سر راہ بکھیر دو، اس نے تعمیل ارشاد کی، اب ہر راہ گیر اس سے پوچھتا کہ کیا ہوا، وہ پڑوسی کی بدسلوکی کا دکھڑا سنا دیتا، لوگ ہمسایہ کو برا بھلا کہتے، اس چیز نے ہمسایہ کو متاثر کیا، وہ دوڑا ہوا آیا اور کہا اپنا اسباب اٹھا لے جاؤ، واللہ اب پھر ایسا نہ کروں گا،

امام زہری رحؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضور کی خدمت میں آیا اور پڑوسی کی شکایت کی، آپ نے فرمایا، مسجد کے دروازے پر یوں منادی کردو، کہ

الا انّ اربعین داراً جار — سن لو! کہ واقعی اس نے چالیس گھروں پر ظلم کیا،

زہری نے چاروں سمت اشارہ کرکے اس حدیث کو روایت فرمایا، مقصد یہ تھا کہ ہر سمت کے چالیس چالیس گھروں کو تکلیف پہنچائی گئی، حضور نے یہ صورت شکایت کرنے والے کے جواب میں ارشاد فرمائی، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ایک شخص مسلسل چالیس گھروں کا پڑوسی ہے، اور جو چالیس کے حقوق کی رعایت و نگہداشت کا مکلف ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ایک کو ذرا سا بھی تنگ کرے، تادیب و تعلیم کی یہ کتنی بہترین صورت ہے، جو دربار رسالت کے سوا کہیں نہیں ملتی،

حقوق ہمسائگی سے متعلق تاریخ اسلام میں صدہا عجیب و غریب اور حال صد عبرت واقعات تلاش و جستجو سے مل سکتے ہیں سنا گیا ہے کہ ابن المقفع کو معلوم ہوا کہ اس کا مقروض پڑوسی ادائگی قرض کی کوئی صورت نہ دیکھ کر اپنا مکان فروخت کر رہا ہے، ابن المقفع نے جو اس کی دیوار کے سایہ میں بیٹھا کرتا تھا، کہا اگر وہ افلاس کے باعث ایسا کر رہا ہے تو میں وہ ہوں جو ہم سایہ سے استفادہ کی مکافات کا اب تک کوئی طریقہ نہ اختیار کر سکا، اس کے بعد پڑوسی کو گھر کی قیمت یہ کہتے ہوئے حوالہ کی، کہ "اسے نہ بیچو"

کسی نے ابن المقفع سے شکایت کی کہ تمھارے گھر میں چوہے بہت ہیں، بلی پال لو تو پھر بہتر ہے، اس نے کہا، میں یہ ڈرتا ہوں کہ بلی کی آواز سن کر چوہے پڑوسیوں کے گھروں میں پہنچیں گے، اور یہ بھی مجھے گوارا نہیں کہ اپنے آرام کی خاطر پڑوسی کی تکلیف کا باعث بنوں،

بطور نمونہ یہ دو واقعے پیش کئے گئے، ذرا آپ ایک سرسری نظر ہی ڈالئے، اور پھر آج جو کچھ آپ دیکھ اور سن رہے ہیں اس سے مقابلہ کیجئے، باہمی اجنبیت کا یہ حال ہے، کہ ایک ہی عمارت میں دس آدمی رہتے ہیں، اسی طور پر مدتیں گزر جاتی ہیں، مگر ایک دوسرے سے آشنا نہیں ہوتے، اور جو لوگ الگ الگ گھروں میں رہتے ہیں، ان کا تو ذکر ہی کیا، یورپ کے تمام متمدن ملکوں کا حال یہی ہے، اور اس کے ۹۹ فی صدی اثرات ہندوستان میں بھی پہنچ چکے ہیں:

پڑوسیوں کی اتنی قسمیں ہو چکی ہیں، جن کا احاطہ ناممکن ہے
کم سے کم اور چھوٹی سے چھوٹی تکلیف جو پڑوسی کو پہنچائی جا رہی ہے
یہ ہے کہ نوجوان کھلنڈرے کھڑکیوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے
ہیں، دروازوں کی سیدھ میں بیٹھ جاتے ہیں، تاکہ گھر والے اپنی بے
تکلفیوں کو جاری نہ رکھ سکیں، اور تنگ آکر اپنی کھڑکیوں کو بند رکھنے
پر مجبور ہو جائیں، اور آفتاب کی شعاعوں اور اس کی روشنی سے محروم
ہو جائیں، درآں حالیکہ یہ دونوں صحت جسمانی کے لئے ضروریات
سے ہیں،

کھلم کھلا سخت تر تکلیف یہ پہنچائی جاتی ہے، کہ گھر کا بہارن
پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے، اور ذرا بھی ڈالنے والے کو
اس حرکت بیجا کا احساس نہیں ہوتا، دوپہر کے وقت لڑکوں کو بے
لگام چھوڑ دیا جاتا ہے، وہ ساری دوپہر پڑوسیوں کے آرام میں
خلل انداز ہوتے ہیں، شام کے وقت گرد و غبار اڑانا ان کا بہترین
مشغلہ ہوتا ہے، ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کہ پڑوسی کو اس سے
تکلیف ہوتی ہے مگر ہم ذرا محسوس نہیں کرتے۔

شہر کو چھوڑ کر مضافات میں جائیے، وہاں بھی یہی زبون حالی
نظر آئے گی، مگر دوسری شکل میں، بچوں کی طفلانہ لڑائیوں سے متاثر
ہو کر ماؤں کا گالی گلوج کرنا، پھر اس میں مردوں کی مداخلت کبھی
گالیوں پر خاتمہ ہو گیا، کبھی مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی، باغوں اور
زمینوں کے معاملہ میں بھی یہی حال ہے، کہ چھوٹے سے چھوٹے حق کا
لحاظ نہیں کیا جاتا ایک شخص پڑوسی کی ملحقہ زمین پر قبضۂ غاصبانہ

کر بیٹھتا ہے یا موقعہ پاکر اپنے مویشیوں کو پڑوسی کے کھیت میں چھوڑ دیتا ہے، کبھی کھیتوں کے سیراب کرنے والے پانی کے معاملہ میں جھگڑتا ہے، کبھی بلا وجہ پانی کی راہ روک دیتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیم کو ایمان داری کے ساتھ پیش کیا جائے، اور پیش کرنے سے پیشتر خود اس پر پوری طرح عامل ہوں، تاکہ کامیابی کی توقع کی جاسکے، اس سلسلہ میں ایک مفید عملی اقدام یہ ہے کہ مکاتب اسلامیہ کا ایک جال پھیلا دیا جائے

چھٹا باب

عدالت و سیاست

کائناتِ عالم ایک محکم نظام اور عجیب ترتیب کے ساتھ قائم ہے، قرآن مجید میں بنظرِ غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سات سو بیس کے قریب آیتیں نظامِ کون اور ترتیبِ کائنات میں مشاہدہ و نظر کرنے کے باب میں وارد ہوئی ہیں اور دو سو پچاس آیتیں احکامِ شرعیہ کے بارے میں آئی ہیں، یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انسان، نظمِ عالم اور اس کے حسنِ سلیقہ کو دیکھ کر قوانینِ الہیہ کو، جو اس عالم میں جاری وساری ہیں، اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کرے، اپنے تمام حالات و اعمال کو ایک نظام کے ساتھ چلائے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک ایسے خلیفہ و امیر کو پیدا کرتا رہے جو مخلوق خداوندی میں حکومتِ الہیہ کو نافذ کرتا رہے، قدرتی قوانین کو جاری کرے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً، اسی لئے کہا گیا ہے کہ "بادشاہ پرتوِ خداوندی ہے"

اعتدال اور نظام ہی کے ساتھ آسمان و زمین اپنی جگہ قائم ہیں، قرآن مجید نے اجتماعی نظام کے معاملات کو عدل قائم کرنے اور مخلوق کے سیاسی امور کو خوش اسلوبی سے انجام دینے پر منحصر قرار دیا ہے، مادی و ادبی ضروریات کے مطابق سیاسی امور کو انجام دینا اور مختلف مصلحتوں کی نگہداشت کرنا رعایا اور بادشاہ کا فریضہ ہے اجتماعی نظم قائم کرنا، امن عامہ کو پھیلانا، سوسائٹی میں دولت و ثروت کے راستوں کو ہموار کرنا، قانونی و شرعی نقطۂ نظر سے عادلانہ قضاء کی میزان کو برقرار رکھنا، مملکت کی طرف سے مدافعانہ تیاریاں علم و علماء کی حوصلہ افزائی، علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں اسباب سہولت کی فراوانی، رعایا کے درمیان امر بالمعروف و نہی عن المنکر یہ تمام وہ حقوق و واجبات ہیں جو اسلام کی نظر میں حکومت کے لئے ضروری اجزاء و عناصر ہیں، جن پر پیغمبر اسلام نے آمادہ کیا اور انہی کے لئے قرآن مجید نازل ہوا، اس لحاظ سے امن کو پھیلانے اور انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کو شریعت اسلامیہ نے حکومت کے آداب و ضروریات میں سے قرار دیا ہے

نظام عدالت کے قیام ہی سے رعایا کے احوال منظم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں مختلف حالات و امور میں، تمام معاملات و حقوق میں، میزان عدل کو قائم و برقرار رکھنے پر اشارہ کیا ہے،

اسی لئے اسلامی سوسائٹی کے نظام اور اس کے آداب و قوانین میں قاضیوں، والیوں اور دیگر کارندوں کو اہل علم و تقویٰ سے

انتخاب کرنا واجبی ہے، حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔

ان اللّٰہ یحب البصر الناقد عند ورود الشبہات ویحب العقل الکامل عند حلول الشہوات

اللہ تعالی اُس مبصر اور ناقد کو پسند کرتا ہے، جو شکوک و شبہات کے پیدا ہونے کے وقت اپنی نقد و بصیرت سے ان کو جانچتا اور پرکھتا ہے، اُس پختہ کار دانش مند کو دوست رکھتا ہے جو خواہشات نفسانی کے پیدا ہونے کے وقت عقل و تجربہ سے کام لیتا ہے،

رشوت کا لین دین، سود اور ناجائز طریقہ سے لوگوں کا مال کھانا اسلام کی نظر میں حرام ہے، اگر باطل کی طرف داری میں کسی کا مال کھایا جائے تو وہ ایسا بدترین ظلم وستم ہوگا، جس کا مرتکب اللہ کے عذاب سے کبھی چھٹکارا نہیں پاسکتا، اسی طرح وہ مال بھی حرام ہے جس کو ایک محکوم حاکم کے لئے بطور ہدیہ پیش کرتا ہے، یہ کھلم کھلی رشوت ہے،

صحیح بخاری و مسلم میں ابو حمید ساعدی سے ایک روایت آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ ازد کے ایک شخص ابن اللتیبہ کو صدقہ وصول کرنے پر مقرر کیا، جب وہ آیا تو کہنے لگا یہ صدقہ تمھارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا اس شخص کو کیا ہو گیا ہے، جس کو ہم ایسے کام پر جس کا اللہ نے ہمیں والی بنایا ہے، کارندہ بنا کر بھیجتے ہیں تو کہتا ہے "یہ تمھارا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں دیا گیا ہے؟ کیوں نہیں وہ اپنے باپ یا اپنی

ماں کے گھر بیٹھ رہے دیکھے کہ اس کی طرف ہدیہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اُس مال میں سے وہ جو کچھ لے گا تو قیامت کے دن اس کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے آئے گا، اگر وہ اونٹ ہوگا تو آواز کرے گا۔ اگر وہ گائے ہوگی تو آواز کرے گی اور اگر وہ بکری ہوگی تو چلائے گی" پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ ہم کو آپ کی بغل نظر آنے لگی اور فرمایا "خداوندا! کیا میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا"

یہ باطن کارندوں کا رشوت لینا اور حکومت میں خیانت کرنا حکومت کے ادارہ کو فاسد اور رعایا کی مصلحتوں کو بگاڑنے کا بڑا سبب ہے، اس لئے عاملوں اور کارندوں کو دیکھ بھال کر انتخاب کرنا ضروری ہے اور ان کو ایک ضابطہ اور نظام میں منسلک کرنا لازمی،

قیام مملکت کے اصول میں سے ملک کی حفاظت اور مملکت اور قوم کی داخلی و خارجی مدافعت کے لئے لشکر کی تنظیم بھی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَاَعِدّوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم

اور تیار کرو تم ان کے لئے جو کچھ تم کرسکو قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے، ڈراؤ گے تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو، جن کو

الله یعلمھم۔ تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ (انفال)

اس بناء پر امت اسلامیہ کے شایان شان یہ ہے کہ فنون عسکریہ میں مہارت حاصل کرے اور بہترین عملی تدابیر کرنے میں۔ احتیاط اور دور اندیشی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دے، قرآن مجید نے اس کے لئے بہترین اصول یہ ارشاد فرمایا ہے۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص
اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کے راستہ میں صف باندھے ہوئے لڑتے ہیں گویا کہ وہ مضبوط دیوار ہیں۔

فوج کی تنظیم کا مظاہرہ اور مجاہدین کی مادی تیاریاں اس امر کی مقتضی ہیں کہ لشکر کے لئے غذائی رسد فراہم کی جائے عسکری زیب زینت اور شان و شوکت کو بڑھانے کے لئے بہترین اسلحہ و آلات اور پوشاک سے آراستہ کیا جائے۔

امام طرطوسی اپنی کتاب سراج الملوک میں لشکری فضیلت اور اس کی اصلاح کی طرف توجہ کرنے کی ترغیب مین فرماتے ہیں:۔

"لشکر ملک کا قلعہ، فصیل اور سازوسامان ہے، یہی لوگ بسیط محافظ ہیں اور بیرونی و اندرونی خرابیوں کی روک تھام کرنے والے اور مدافعانہ تدبیر کرنے والے ہیں، یہی لوگ حوادث کا مقابلہ کرتے اور فصیلوں کی نگرانی کرتے ہیں"

ساتواں باب

اخوت و مساوات

اشخاص و افراد کے درمیان جمعیت کا رشتہ اس وقت تک مضبوط نہیں ہوسکتا تا وقتے کہ ان کے دل ایک محکم اساس اور ایک مضبوط رابطہ کے ساتھ مربوط و مطمئن نہ ہوں، کوئی رشتہ اسلامی رابطہ سے بڑھ کر محکم و استوار نہیں، اسلام کا یہ رابطہ "اُخُوّت" کہلاتا ہے یہی وہ مقدس رشتہ ہے جو حقیقی فرزندی کے رشتہ سے بھی مضبوط اور قوی ہے، کیوں کہ فرزندی (بُنوت) کا اتصال ایک شرعی امر ہے، جس کے درمیان کفر حائل ہے، جب لڑکا کافر ہوجائے تو اس کا رشتہ اپنے ماں باپ سے جدا ہو جائے گا جب ماں باپ کافر ہو گئے تو ان کا رشتہ اپنے بیٹے سے کٹ جائے گا نہ یہ اس کے وارث ہوں گے اور نہ لڑکا ان کا وارث بنے گا، حالاں کہ ان دونوں حالتوں میں حقیقی فرزندی کا رشتہ ثابت ہے

اس سے یقینی طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ رابطۂ اُخُوّت، اسلامیہ جو حکم الٰہی سے محکم و مربوط ہے، تمام رشتہ داریوں پر مقدم ہے اس کے

بعد کے درجہ میں قرابت داروں اور برادروں کے مراتب کا شمار ہوگا، پھر اسلام نے اخوت اسلامیہ کو عالم اسلامی کے مابین رنگ نسل اور قبیلہ و وطن کے اختلاف و رنگا رنگی کے باوجود برقرار رکھا کہا گیا انما المومنون اخوۃ، تمام مسلمان بھائی ہیں۔

النبی اولی بالمومنین من انفسھم و ازواجہ امھاتھم	نبی زیادہ مقدم ہیں مومنوں پر ان کے نفسوں سے اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

یہ مذہبی و اسلامی نسبت ہے، جو حکم الٰہی سے قائم ہے کس طرح یہ رشتہ منقطع نہیں ہوتا، حکم دیا گیا کہ تمام مسلمان آنحضرت صلعم کی ازواج طاہرات کے، جو امہات المومنین ہیں فرزند کہلاتے ہیں، اس کی تائید آنحضرت صلعم کے اس قول سے ہوتی ہے۔

انما انا لکم بمنزلۃ الوالد اُعلمکم	میں بلا شک تمہارے لئے باپ کے قائم مقام ہوں جو تمہیں تعلیم دیتا ہوں،

نیز آپ سے یہ قول بھی مروی ہے "انا جد کل تقی" میں ہر تقویٰ شعار کا جد امجد ہوں، ابتداء اسلام میں ہجرت کے زمانے میں آنحضرت صلعم نے اپنے عمل سے مواخاۃ (بھائی چارہ) کو انجام دیا، کیوں کہ آپ نے ہر دو مہاجروں کے مابین اخوت اور بھائی چارہ پیدا کرا دیا ان میں سے ہر محتاج و مالدار کو رشتۂ اخوت سے مضبوط کر دیا تاکہ وہ دونوں تنگی و مصیبت کے وقت باہمی تعاون کریں، اسی طرح آپ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کا حکم دیا۔

چونکہ قبیلوں اور خاندانوں پر فخر و غرور اخوت اسلامیہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے القاب و اسماء کے ساتھ عُجب و تعلی کرنے سے منع فرمایا اور ان کی علت غائی یہ بتلائی گئی۔

وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا

ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا کہ تم ان کے ذریعہ باہمی تعارف حاصل کرو۔

یہاں لام تعلیل کا ہے، یعنی یہ گروہ اور قبائل اس لئے بنائے گئے ہیں تاکہ لوگ ان سے ایک دوسرے کو پہچانیں، اس لئے نہیں کہ ایک دوسرے کو برتر اور مافوق سمجھیں اور اپنے قبیلہ پر فخر و غرور کرنے لگ جائیں، کیوں کہ یہ سارے قبائل ایک اصل پر منتہی ہوتے ہیں، گویا یہ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ہیں جو تمدنی و عمرانی حاجتوں اور ضرورتوں کی بنا پر جدا جدا ہو گئے اور مختلف گروہ میں تقسیم ہو گئے ہیں، پھر اللہ نے فخر و کرامت کو اس طرح محصور کر دیا۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

بے شک تم میں زیادہ قابل تکریم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

تقویٰ و پرہیزگاری اور خشیت الٰہی ہی مجد و کرامت کا موجب ہے اور اس کے علاوہ معیار فخر باطل اور زوال پذیر۔

ومن یھن اللہ فما لہ من مکرم۔

اللہ جس کو ذلیل کر دے تو پھر اس کو مرتبہ و مقام بخشنے والا کوئی نہیں۔"

اس کی تائید اللہ نے آخرت کے ہولناک منظر کو پیش کرتے ہوئے کی ہے۔

فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینھم یومئذٍ ولا یتساءلون

جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان کے سارے رشتے کالعدم ہوجائیں گے اور نہ یہ باہم کچھ پوچھیں گے،

دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم یوم القیامۃ یفصل بینکم واللہ بما تعملون بصیر

قیامت کے دن ہرگز نہ تمھاری رشتہ داریاں فائدہ پہنچائیں گی اور نہ تمھاری اولاد، تمھارے درمیان جدائی رہے گی اور اللہ جو کچھ تم کررہے ہو اس سے بہت باخبر ہے۔

اسی حقیقت کے اظہار میں بے شمار احادیث آئی ہیں آنحضرت صلعم فرماتے ہیں،

ان اللہ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء مومن تقی وفاجر شقی انتم بنو آدم من تراب" لینتھین عن رجال فخرھم باقوام

اللہ نے تم سے جاہلیت کے عیب ونخوت اور باپ دادا پر فخر کرنے کو دور کردیا ہے، مسلمان پرہیزگار ہے اور بدکار گنہگار تم آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے،

انما هم فحم من فحم جهنم او ليكونن اهون على الله من الجعلان التي تدفع بانفها الفتن۔

لوگوں کو اپنی قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دینا چاہئے کیوں کہ وہ جہنم کا ایندھن ہیں، ورنہ وہ اللہ کے نزدیک اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے جو اپنی ناک سے گندگی برپا کرتا ہے؛

دوسری جگہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

ليس منا من دعا الى عصبية وليس منا من قاتل على عصبية وليس منا من مات على عصبية

یہ اشخاص میری جماعت سے نہیں ہوں گے (۱) جو عصبیت کی طرف دعوت دے (۲) جو عصبیت پر جنگجوئی کرے (۳) جو عصبیت کی موت مر جائے۔

اسی قبیل سے وہ حدیث ہے، جس کو حصین بن عبد الرحمٰن بن عقبہ نے اپنے باپ سے بیان کی ہے، یہ ایک غلام تھے غزوۂ اُحد میں آنحضرت صلعم کے ساتھ شریک رہے، اور مشرکین کے ایک شخص پر یہ کہتے ہوئے وار کیا۔

"اس وار کو سنبھال میں فارسی غلام ہوں" ان کا ارادہ اس سے اپنی قوم کو باعزت سمجھنا تھا، نبی کریم صلعم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا" تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ یہ میرا وار سنبھال میں انصاری غلام ہوں" اس سے آپ کا اشارہ وحدت جامعیت اسلامیہ کی طرف تھا اور عصبیت وجنسیت کی طرف دعوت دینے یا اس کو

یا عزت سمجھنے سے روکنا مقصد تھا، اس کی تصدیق حضرت عائشہ کی اس روایت سے ہوتی ہے آپ فرماتی ہیں کہ "میں نے آنحضرتؐ کو حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔

ولا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی	سوائے تقویٰ کے نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت و فوقیت ہے اور نہ گورے کو کالے پر،

اس لئے کہ جمہور حاضرین کی تعداد عربوں کی تھی، معلوم ہے کہ وہ اپنے حسب و نسب پر آپس میں فخر کیا کرتے تھے، اس تصریح سے اوروں پر ان کی فضیلت کا مدار تقویٰ ہی پر رکھا گیا،

اس کو ثابت کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ نبی کریم صلعم کے پاس ایک وفد حاضر ہوا ان میں سے ایک نے کہا "آپ ہمارے آقا ہیں" آپ نے فرمایا "آقا تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے" اُنھوں نے کہا آپ ہم میں افضل اور جود و کرم میں ہم سے بڑھ کر ہیں" آپ نے فرمایا تمھارے اس قول میں تمھیں شیطان نہ ابھارے"

آپ نے غلام یا لونڈی کو اُس کے لقب سے یاد کرنے کو بھی منع فرمایا اسی طرح غلاموں کو یہ کہہ کر پکارنے سے منع فرمایا "میرا آقا" میری بیگم"

آپ نے ہر اُس شخص کو تہدید شدید فرمائی، جو اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر و توہین کا ارادہ کرے فرمایا،

کل المسلم علی المسلم حرام مالہ وعرضہ ودمہ	ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا مال اس کی آبرو اور اس کا خون حرام ہے

حسب امرئ من الشر یحقر اخاه المسلم

کسی شخص کو صرف اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

ما من امرئ یخذل امرءاً مسلماً فی موضع تنتهک فیه حرمته وینتقص فیه من عرضه الا خذله الله فی موطن یحب فیه نصرته وما من مسلم ینصر مسلماً فی موضع ینتقص فیه وینتهک فیه من حرمته الا نصره الله فی موطن یحب فیه نصرته

جو مسلمان کسی مسلمان کو ایسے مقام میں اپنی مدد کرنے سے چھوڑ دے گا جہاں اس کو بے حرمت کیا جا رہا ہے اور اس کی آبرو ریزی ہو رہی ہے تو خدا اس کو بھی ایسے موقعہ پر رسوا کرے گا جب کہ وہ اس کی مدد چاہتا ہے، جو مسلمان کسی مسلمان کی ایسے مقام پر مدد کرے گا جہاں اس کی بے عزتی اور حرمت ریزی ہو رہی ہے، تو اللہ اس کی ایسے موقعہ پر امداد کرے گا جس میں وہ اس کی مدد کا طالب ہے،

دوسری جگہ آپ نے ارشاد فرمایا

المسلم اخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه من کان فی حاجة اخیه فان الله فی حاجته

مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ یہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس سے کنارہ کشی کرے، جو شخص اپنے بھائی کا محتاج ہو تو سمجھنا چاہیے کہ اللہ کو اس کی حاجت ہے، جو شخص

ومن فرج عن مسلم کربة فرج الله عنه بها کربة

من کرب یوم القیامۃ — کسی مسلمان کی تکلیف کو دور کرے گا
ومن ستر مسلماً سترہ اللہ — تو اللہ اس کے ذریعہ قیامت کے
یوم القیامۃ — دن کی تکلیف کو دور کردے گا،
جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا
تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی
بھی پردہ پوشی کرے گا۔

اسلام نے غیبت اور کسی کی عیب جوئی و نکتہ چینی سے منع کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

أیحب احدکم ان یاکل — کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ
لحم اخیہ میتاً — اپنے بھائی کا مردار گوشت
کھاؤ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کا معنی اس طرح واضح کیا

ذکرك اخاك بما یکرہ — تم اپنے بھائی کا تذکرہ ایسے الفاظ
میں کرو کہ وہ سن پائے تو اس کو
ناپسند معلوم ہو۔

لوگوں نے دریافت کیا "خواہ اپنے بھائی کے اندر وہ سب کچھ موجود ہو جو میں کہتا ہوں" آپ نے فرمایا "جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر اس کے اندر موجود ہو تو تم نے اس کی پس پشت عیب جوئی کی، اگر جو کچھ تم کہتے ہو اس کے اندر نہ پایا جائے، تو تم نے اس پر بہتان تراشی"

آنحضرت صلعم نے اس معاملہ میں انتہائی سختی برتی اور وعید سنائی ہے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "ایک شخص زنا کرے اور توبہ کرلے تو اللہ

اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، لیکن پس پشت عیب جوئی کرنے والا کبھی معاف نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ عیب زدہ اس کو نہ معاف کردے"

نیز آپ نے ارشاد فرمایا۔

لایومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ	تم میں سے کوئی مسلمان نہ ہوگا تاوقتیکہ اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

لایحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث	کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ تین دن سے زائد جدا رکھے۔

قرآن مجید کی آیتوں اور نبی کریم صلعم کے ارشادات سے ثابت ہوگیا کہ اخوت اسلامیہ کے لئے شریعت کی نظر میں عظیم الشان مقصد ہے۔

اب میں یہاں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اس دعوت و تبلیغ کا اجتماعی حیثیت سے کیا اثر ہوا، وہ تبلیغ جو ایک خاندان اور گروہ میں قابل پذیرائی نہیں ہوسکتی تھی، کس طرح چند ہی سال کے اندر یعنی بیس سال کی قلیل مدت میں مشرق و مغرب میں پھیل جاتی ہے،

اس دعوت کا فوری اثر یہ ہوا کہ اس نے ایک قوم کے اندر حیرت انگیز انقلاب برپا کردیا اور اس کو بالکل جداگانہ شکل و صورت میں بدل دیا، وہ قوم جس میں اخوت اسلامیہ کی نشوونما ہوئی، امت عربیہ ہے،

عربوں کی قوم تنگدست تھی، زمین کے پست حصہ میں سکونت گزیں تھی روم و فارس کی متمدن و مہذب اور شایستہ قوموں کی نظر میں

ذلت و حقارت سے دیکھی جاتی تھی، اس کے لئے نہ کوئی نظام فکر تھا اور نہ کوئی قدر و منزلت، عرب کے لوگ جاہلیت میں مختلف قبائل میں منقسم تھے ان میں ہر دم جنگ و جدل کا سلسلہ جاری تھا، سرداری کے لئے باہم معرکہ آرائی ہوتی، آپس میں معمولی سی بات پر جھگڑ بیٹھتے تھے، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ پر غلبہ حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا، اور اپنے حسب و نسب کے ساتھ فخر و مباہات کیا کرتا تھا، ان کا فخر و ناز تمام تر لوٹ مار، قتل و غارت اور ظلم و فساد پر ہوتا، ظلم و ستم ان کی زندگی کا بیش بہا سرمایہ اور لازمہ ہو گیا تھا۔

عمرو بن کلثوم کہتا ہے۔

"ہم سرکش باغی اور ظالم ہیں، مظلوم نہیں ہیں، لیکن ہم نے ظلم سے ابتداء کی ہے"

زہیر کہتا ہے :۔

"جو شخص اپنے حوض کی اپنے ہتھیار سے حفاظت نہ کرے گا تو وہ ڈھا دیا جائے گا اور جو شخص لوگوں پر ظلم نہیں کرتا ہے، اس پر ظلم کیا جائے گا"

اسلامی شاعر قسطامی، اسلامی قبائل میں جاہلیت کی صفت کی تعریف بیان کرتا ہے۔

جس شخص نے لشکر جمع کیا تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے پاس بھی سخت اور ٹھوس نیزے اور بہترین گھوڑے ہیں، اور ہم جب کسی پر لوٹ مار کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو جناب اور ضبہ پر اور کبھی ہمارے بھائی بکر پر ہی،

جب کہ ان کے سوا کوئی نہ ملے، لوٹ مار کرتے ہیں"

یہ اشعار جاہلیت کے عربی قبائل کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اس تبلیغ کے اثر نے ایک ایسی قوم کو جو اپنے بھائیوں اور ہمسایہ پر لوٹ مار کرنے کو باعث فخر و ناز گردانتی تھی ایشیا، و افریقہ میں سیاہ و سفید کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے والی، قانون دان اور مبلغ اسلام بنا دیا' ایسی وحشی اور بدوی قوم کے افراد ایک ہی صدی کے اندر تہذیب و تمدن کے علمبردار اور نظام عالم کے مالک ہو جاتے ہیں'

جاہلیت میں ہر شخص اپنے قبیلہ کا پابند تھا اور دوسرے قبیلہ پر عرصۂ حیات تنگ کر چکا تھا' قبیلوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور باہم نصرد تعاون مفقود اور بھلائی کا نام ناپید تھا' بلکہ یہ لوگ ان چیزوں کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے' جس طرح یہ انسانیت سے ناآشنا تھا' اسی طرح امت عربیہ کے وجود کا انکار کرتے تھے' محض دشمنی و بغض و عناد کو زندگی کا واحد مقصد اور ذریعہ جانتے تھے' ہر قبیلہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی حفاظت و حمایت اور سرداروں پر غلبہ حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا' اس وقت دعوت محمدی نے ان کی تمام برائیوں کو دور کر دیا اور عصبیت و جنبیت کے فتنہ و شر کا انسداد کر دیا اور تمام قبائل اور خاندانوں کو ملا کر ایک ہی امت بنا دیا' انسانی حقوق کو قائم کیا' لوٹ مار' قتل و خونریزی کے بجائے باہم نصرو اعانت' اتحاد و اتفاق' اور پاک عقیدہ پیدا کر دیا' عربوں نے اس دعوت کو قبول کیا اور انسانیت و اخلاق کے اعلیٰ صفات سے

متصف ہوگئے، اسلامی شریعت تمام پر فایق ہوگئی، اس نے قصاص کو برقرار رکھا، ظلم وستم کی بیخ کنی کردی، اور عدل وانصاف کو عام کردیا، ہر فرد، ہر سوسائٹی اور ہر قبیلہ کو اپنا اپنا ذمہ دار ٹھرایا۔

ولاتزروا زرۃ وزرا اخری" — ایک کا بوجھ دوسرے کی گردن پر ڈالا نہیں جاتا۔

"کل نفس بما کسبت رھینۃ" — ہر نفس اپنی کمائی کا آپ مرہون ہے"۔

"وان لیس للانسان الا ماسعی — اور یہ کہ انسان کو اس کی کوشش کے موافق ہی صلہ ملے گا"۔

عزت وغلبہ کو شریعت اور اس کے چلانے والے کے لئے خاص کردیا، اور جاہلیت کے تمام دعوے باطل کردئے گئے، غرض کہ قانون عدل وانصاف اور تبلیغ اخوت اسلامیہ کا بول بالا ہوگیا۔

ہر شخص کو اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا گیا، کسی حیثیت سے اس کو جاہلیت کا دعوی کام نہیں دے سکتا، اور وہ میدان عمل میں اپنے حسب ونسب اور جاہ ومال کو پیش نہیں کرسکتا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ — پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا تو وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا تو وہ اس کا پھل دیکھے گا"۔

نیز کہا گیا۔

انھا ان تک مثقال حبۃ — بے شک اگر وہ رائی کا دانہ برابر بھی ہو

من خردل فتکن فی صخرۃ او فی السمٰوات او فی الارض یات بھا اللہ

اور وہ چٹان میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں اللہ تعالیٰ اس کو حاضر کرے گا۔"

دعوت محمدی سے تمام لوگوں میں مساوات قائم ہو گئی، اخوت اسلامیہ کا بول بالا ہو گیا، آقا و غلام، شریف و کمتر کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا، عمل سے ہر ایک کو فضیلت ہے، ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خدا سے ڈرنے والا ہی عزت مند ہے،

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے ہیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

آنحضرت صلعم خطبۂ حجۃ الوداع میں عربوں کی اس مساوات و اخوت کو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں، اے لوگو! تم تمام آدم کی اولاد ہو، اور آدم ہی سے پیدا کئے گئے ہو، کسی عربی کو عجمی پر سوائے تقویٰ و پرہیزگاری کے فضیلت و فوقیت نہیں، یہی وہ اصل الاصول تھا، جو عربوں کی فتوحات میں اساسی

دستور کا حکم رکھتا تھا، اس جنسیت اور قومیت کے عدم امتیاز نے اسلامی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کر دیا اور اس کے ہمیشہ باقی رہنے والے اثرات مشرق و مغرب میں پائے جاتے ہیں۔

دعوت محمدی نے راہ حق پر گامزن ہونے اور بھلائیوں میں سبقت کرنے اور باہم غالب آنے اور اعمال صالحہ میں ایک دوسرے پر بڑھنے کی اجازت دی اور تشویق و ترغیب دلائی اور اس کے علاوہ ناجائز غلبہ و مسابقت کو حرام قرار دیا،

فاستبقوا الخیرات الی اللہ مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون	بھلائیوں میں تم ایک دوسرے پر سبقت کرتے رہو تم تمام کا ٹھکانا اللہ ہی کی طرف ہے، پس وہ تم کو خبر کر دے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے

شریعت اسلامیہ نے قبیلہ کی جگہ قوم، ظلم کی جگہ انصاف بے جا فضل و تعلی کی جگہ مساوات اور حسب و نسب پر فخر کرنے کی جگہ عمل صالح کو اصل الاصول قرار دیا، عربوں سے بغض و عناد اور نفرت کے خیالات کو دور کرکے، ان کے دلوں میں محبت و ہمدردی اور اتحاد کے جذبات کو بھر دیا اور علی الاعلان کہدیا:۔

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم "الی قولہ" لعلکم تتقون	اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمھارے پروردگار نے کیا چیز حرام کی ہے "اللہ تعالیٰ کے اس قول" شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ" تک

عرب میں بت پرستی کا دور دورہ تھا اُن کے مختلف اور بے شمار دیوتا اور خدا پائے جاتے تھے، ان سے کبھی اپنی مرادیں مانگتے اور کبھی ان سے نفرت کرنے لگتے، اور بھلائی طلب کرتے اگر وہ اپنے مقاصد اور اپنی مرادوں میں کامیاب نہ ہوتے تو ان کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے جیسا کہ آج کل بھی بعض حبشی قبائل کیا کرتے ہیں، کہ وہ اپنے فرضی معبودوں سے بارش مانگتے ہیں، اگر وہ ناامید ہو گئے تو اپنے معبود کو قتل کر دیتے ہیں۔

عربوں کو اپنی زندگی میں عمل کرنے کے لئے کوئی واضح راستہ نہیں تھا، تو دعوت محمدی نے ان کو ایک خدا پر ایمان لانے کی تلقین کی اور حلال و حرام کو سمجھا دیا۔

لوگوں کے معاملہ میں ہر چیز میں توحید کو پیش کیا، اور سکھلایا کہ اللہ ایک ہے، تمام انسانوں کی اصل ایک ہے، لوگ آپس میں برابر ہیں اور تمام قومیں کارگاہ حیات میں برابر اپنا حق رکھتی ہیں، جن رسولوں نے ادیان پیش کئے وہ سب ایک ہیں ان کے حقایق مقاصد اور اغراض ایک ہیں،

شرع لکم من الدین ماوصیٰ بہ نوحاوالذی اوحینا الیک الآیۃ

تمہارے لئے وہ دین جاری کیا گیا ہے، جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی ہے،

اور ایک ہی نصب العین بتایا، جس سے وہ اپنے لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ کر سکے، تبلیغ محمدی نے اس متحد قوم کے اندر

وہ روح پھونکی کہ اس کے سامنے دنیوی شان و شوکت، لشکر کی کثرت، فوجی قوت، موروثہ باطل عقائد، بادشاہوں کا دبدبہ اور روساء کا طنطنہ و طمطراق غرض کہ کوئی چیز حائل نہ ہو سکی، اور ان کی نظروں میں نہ جچی اور نہ ان کے مقاصد کو روک سکی۔

آٹھواں باب

حکومت الہیہ کی تشکیل

قبل اس کے کہ ہم حکومت الہیہ کے مفہوم اور آنحضرت صلعم کی اُس جدوجہد پر روشنی ڈالیں، جو آپ نے حکومت الہیہ کی تشکیل میں صرف کی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحدت ریاست اسلامیہ کو چند مختصر الفاظ میں بیان کردیں۔

وحدتِ ریاست اسلامیہ اس سے مراد تمام عالم اسلامی کا ایک ہی اسلامی رئیس کے جھنڈے کے نیچے زبان و دل کے ساتھ جمع ہونا ہے، اس نیت اور عہد و پیماں کے ساتھ کہ احکام و اوامر الہی کے دائرہ میں حسب طاقت بشری اس کی اطاعت و محبت کو لازمی گردانا جائے گا تاکہ اس کے ذریعہ دنیا میں قوانین اسلامیہ اور نوامیس الہیہ کو نافذ کیا جا سکے، لاغوتی حکومتوں کو زیر اور ایمانی قوتوں کو اُجاگر کیا جائے، بمصداق اس آیت خداوندی کے اعتصام و اطاعت ضروری ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ اللہ کی رسی کو سب کے سب مضبوطی
جمیعًا ولا تفرقوا سے تھام لو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا

اطیعو اللہ واطیعو الرسول خدا کی اطاعت کرو اور رسول
واولی الامر منکم اور تمہارے امیروں کی۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین اسلامی محض عبادت کا دین نہیں ہے بلکہ اس کے ایک بازو میں دنیوی نظام اور دوسرے بازو میں اخروی نظام رکھا ہوا ہے، ان دونوں نظاموں کو کتاب وسنت کی روشنی میں چلانے کے لئے پیشوائے عظام کی ضرورت ہے، تاکہ وہ نبی کریم صلعم کے نقش قدم پر چل کر امت کے افراد کو بھی چلنے کی دعوت دیں، جیساکہ آپؐ نے عبادات اسلامی مثلاً جمعہ، عیدین، زکاۃ، حج اور جہاد وغیرہا میں ہرزمانہ اور ہرحال میں امت پر یکجہتی اور وحدت دینی کا فریضہ عاید کیا ہے، دوسری طرف دنیوی امور میں مثلاً لشکر کی تیاری، دین کی مدافعت، دشمنوں سے جنگ، حکومت الٰہیہ کے قیام، اعلاء کلمۃ اللہ، مسلمانوں کے درمیان اختلافات و مناقشات کے ازالہ کے لئے متحدہ اقدام اور مرکزی ارادہ کی ضرورت ہے، ان تمام مقاصد کو انجام دینے کے لئے ایک ایسے امیر کی ضرورت ہے، جو قوت ارادی کا مالک، اسلامی تعلیمات سے متصف اور قرآنی افکار و نظریات پر حاوی ہو،

حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے آنحضرت صلعم کی جدوجہد

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت الٰہیہ کے قیام اور اس کی تشکیل کے لئے جو جدوجہد اور سعی فرمائی، وہ سیاست دانوں، حکمرانوں اور قائدین کے لئے ہر اصلاحی و اخلاقی نظام کیلئے نمونہ اور مثال ہے، اور جن میں انسانوں کی فلاح و بہبود کے راز مضمر ہیں، آنحضرت جس قسم کے سیاست دان دور اندیش اور مآل کار واقع تھے اور جو کامرانی و فتح آپ کو نصیب ہوئی، وہ نہ کسی شخص کو حاصل ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی؛

آپ کی زندگی کی یہی وہ اعلیٰ ترین خصوصیت ہے جس میں آپ حکومت الٰہیہ کو دنیا میں رائج کرنے کے لئے ایک بے نظیر ہستی تصور کئے جاتے ہیں، اس پہلو میں آپ تمام انبیاء و مرسلین میں ممتاز نظر آتے ہیں، آپ کی زندگی مدینہ میں زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے جہاں کے احوال کا اقتضا یہ ہے کہ وہاں کا زعیم و قائد امت کا نبی ہو، سیاسی اجتماعی زندگی کے متعلق اسلامی شریعت کے اصول و احکام جس قدر تفصیل و وسعت کے ساتھ مدینہ میں وتوع پذیر ہوئے اس قدر مکہ میں نہیں تھے بلکہ یہاں تبلیغ و دعوت کی ابتدا رکھی، لوگوں کو اللہ کی حقیقت سے روشناس کرانے اور ان کو قیامت، حشر و نشر اور حساب و میزان سے خبردار کرنے پر پوری قوت صرف کی گئی، اس طرح دو مختلف مقامات میں دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینے کی وجہ سے بعض غیر اقوام کے مصنفین و مورخین کو آنحضرت کی مکی و مدنی دو شخصیتیں تصور کرنی پڑیں،

چنانچہ ان کا خیال ہے کہ مکہ میں آپ نبی ہیں اور مدینہ میں حکمراں اور بادشاہ،

اگر یہ لوگ اس وہم و گمان کو چھوڑ کر انصاف کی نظر سے دیکھتے، تو ان کو معلوم ہو جاتا، کہ جو محمدؐ مکہ میں وعظ و تبلیغ فرماتے ہیں، وہی مدینہ میں اس قدر عبادت کرتے ہیں، کہ آپ کے قدم مبارک طویل وقفہ تک دربار الٰہی میں مصروف ہونے کی وجہ سے متورم ہو جاتے ہیں، یہ وہی محمدؐ ہیں کہ آپ کی وفات اس حالت میں ہوتی ہے، کہ دولت کے ڈھیر کے مالک ہیں، لیکن آپ کا بکتر ایک یہودی کے پاس رہن ہے

بلکہ یہ لوگ مشاہدہ کریں گے، کہ طائف کے اُن اوباشوں آوارہ منش لوگوں اور غلاموں کے حق میں؟ جنھوں نے آپ کا پیچھا کیا مذاق اُڑایا، پتھروں سے زخمی کیا یہاں تک، کہ آپ کو ایک مقام پر بیٹھنے بھی نہ دیا آنحضرتؐ اللہ سے ہدایت کی دعا فرماتے ہیں، وہی محمدؐ ہیں، جو فتح مکہ کے دن عثمان بن طلحہ کو کعبہ کی کنجیاں عطا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں آج کا دن بھلائی، احسان اور وفاداری کا دن ہے"

اگر یہ لوگ، جنھوں نے آپ کو مکہ میں نبی اور مدینہ میں سلطان اور صاحب دولت قرار دیا ہے، غور سے مطالعہ کرتے کہ کس جانفشانی اور کدو کاوش سے مصیبت و ابتلاء کے زمانے میں مکہ میں حکومت و دولت کا خاکہ تیار کیا گیا، تو ان کو مدینہ ہی میں اس کی داغ بیل ڈالنے کا گمان نہ ہوتا، بلکہ وہ جان لیتے، کہ یہ تیرہ سال کی مسلسل کوششوں اور جانفشانیوں کا نتیجہ اور خدائے تعالیٰ کے اس قول " فاصدع بما

تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" جو تجھے حکم دیا جاتا ہے، اس کی پیروی کر اور مشرکین سے اعراض کر" کی دعوت کا ثمرہ ہے،

مدینہ میں حکومت و دولت کا قیام و استحکام تو آنحضرتؐ کے اُن تلامذہ اور پیرؤوں کے ہاتھوں ہوا جنھوں نے پہلی اور دوسری مرتبہ اللہ کے حکم سے اللہ کے راستہ میں حبشہ کی طرف ہجرت کی، اور اس کے بعد مدینہ کی جانب رجوع ہوئے، نیز اس میں اُن انصار کا بھی حصہ تھا، جنھوں نے مکہ کی گھاٹی میں آنحضرتؐ سے پہلی اور دوسری مرتبہ بیعت کی،

یہی وہ امت کے مقدس تخم ہیں، جنھیں رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھوں سے سرزمین مدینہ میں بویا تھا، انہی کے ہاتھوں دولت اسلامیہ قائم و مستحکم ہوئی پھر اس کے بعد اسلامی شہنشاہیت کے دور کا ظہور ہوا۔

آنحضرتؐ مکہ اور مدینہ میں اپنے شعور سنی سے لے کر اپنی وفات تک، دور اندیش، مدبر و مفکر، عقل خداداد کے مالک اور پختہ کار سیاست داں تھے، آپ نے مکہ کی مشہور و معروف ہستیوں سے فائدہ اٹھایا، عبدالمطلب کے زیر سایہ پرورش پائی، طائف سے واپسی کے بعد مطعم بن عدی کی حمایت میں جو مشرک تھے، مکہ میں داخل ہوئے آپ نے بت پرستوں کے ربط و تعلق کو اس لئے قبول فرمایا، تاکہ مکہ سے بتوں کو منہدم کرنے میں سہولت پیدا ہو، اور مدینہ میں یہاں کے لوگوں کی تنظیم و اتحاد، معاہدہ اور نصرت و مدد کو اس لئے قبول فرمایا، تاکہ اس کے ذریعہ آپ اپنی جان اور اپنے اصحاب کو محفوظ رکھ سکیں اور

بتوں کی بھی بیخ کنی ہو جائے، آپ کا مقصد و مدعا ایک غرض و غایت ایک اور نقطۂ نظر ایک تھا، لیکن اس کی صورتیں مختلف احوال جداگانہ اور مظاہر گوناگوں تھے، صور و اشکال کی تبدیلی سے کیفیت وہیولی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل وقوع پذیر نہیں ہو سکتا، لیکن غیر منصف مزاج ناقدین و مورخین نے ان تصویروں کو سمجھنے میں فاش غلطی کی اور ان کو ان مختلف مظاہر سے غلط فہمی پیدا ہو گئی،

اگرچہ مدینہ میں زندگی کے مختلف ادوار و مراحل کے مدنظر بے شمار تشریعی احکام اور تنظیم و تصریف امور کے اصول پیش کیے گئے، لیکن یہ آپ کی شخصیت کے تبدیل ہونے پر برہان و دلیل نہیں ہو سکتے، بلکہ آپ کی جلالت شان، حسن رائے اور عقلی برتری پر دلالت کرتے ہیں،

آنحضرت جس شخصیت کے ساتھ مکہ میں مشرکین کا بے خوف و ہراس مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، آپ مدینہ میں بھی اسی شان سے دنیا کے مختلف کام انجام دیتے ہیں، اس سے آپ کی ذات کی اُن قوتوں اور روحانی طاقتوں کا پتہ چلتا ہے، جنھوں نے آپ کو ہر دشوار گزار مراحل میں حسب اقتضائے حال اور مناسب مواقع پر کامیابی و تسلط عطا کیا،

آپ کی شخصیت میں یہی وہ عظیم الشان صفات اور اولوالعزم قوتیں جمع تھیں جن کی بدولت آپ نے اپنے اخلاق کا مجسمہ پیش کیا اور ہر حیثیت سے امتیاز پیدا کیا، آپ انھی صفات و قویٰ کے مجموعہ سے تبلیغ و دعوت کے زمانے میں خواہ وہ مکہ میں طاقت و قوت سے

محرومی کا دور ہو، یا مدینہ میں سیاست و دولت کی فراوانی کا، آپ ایک مستقل اور کامیاب حکمراں و فاتح نظر آتے ہیں، جو پوری توجہ کے ساتھ اللہ کی یاد میں مصروف تھے اور یہی توجہ آپ کی منزل مقصود تھی اس کے سوائے تمام اشیاء کو دوسرے درجہ میں شمار کیا تھا، آپ دونوں مقامات (مکہ و مدینہ) میں عبادت گزار، پرہیزگار اور زہد خالص کا نمونہ تھے آپ کے صحابہ آپ کے لئے ایک عمدہ بستر تیار کرنا چاہتے ہیں، آپ فرماتے ہیں، مجھے دنیا سے کیا سروکار، میری اور دنیا کی مثال اس سوار کی طرح سے ہے، جو درخت کے سایہ تلے آرام کیا پھر وہاں سے چل دیا آپ کو کسی جاہ و حشمت اور سلطنت و دولت کے زور نے مغلوب نہ کیا، نیز آپ نے تواضع اور بردباری سے باہر ایک قدم بھی نہیں بڑھایا،

لیکن اب سوال یہ ہے کہ ناقدین آنحضرت ﷺ کی زندگی میں وہ کونسا تضاد اور اختلاف پاتے ہیں، جس کی بنا پر وہ آپ کو دو شخصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ آپ مکہ میں کس مپرسی اور بے چارگی کی حالت میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور مدینہ میں آپ اس حالت میں جہاد کرتے ہیں، کہ آپ کے پاس دولت و قوت کا سرمایہ موجود رہتا ہے؟ آپ کے پیش نظر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک دونوں مقامات میں صرف ایک ہی مقصد و مدعا دین کی نشر و اشاعت اور اعلاء کلمۃ الحق تھا اور شرک و بت پرستی کا قلع و قمع کرنا ہے۔

ناقدین کو آنحضرت ﷺ کی مکی مدنی زندگی میں کونسا تناقض اور

تضاد نظر آتا ہے؟ حالاں کہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے، تو بآسانی اس کا پتہ چل سکتا ہے، کہ آپ مکہ میں اذیتوں اور تکلیفوں پر صبر کرتے ہیں، جاہلیت کے سربر آوردہ اشخاص کی آڑ میں اپنے نفس کو بچاتے ہوئے ان کے دین کو منہدم کرنے کی کوشش ہی مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم کرتے، اپنے دین کے معاملہ میں بحث و مباحثہ کرتے سبھوں کو دین اسلام کی طرف دعوت دیتے، ہر دشوار اور مشکل ترین کام کو اپنی حسن رائے اور فکر و تدبر سے انجام دیتے ہیں، مدینہ میں آپ یہاں کے لوگوں سے نصرت و امداد طلب کرتے، یہود و مشرکین سے معاہدہ کرتے، اپنی حفاظت اس حکومتی قوت کے ذریعہ کرتے ہیں جس کی آپ نے تنظیم کی تھی مختلف پیچیدہ مراحل پر اور مختلف جنگوں میں اپنی دوربینی، اولوالعزمانہ قوتوں اور بہترین عقل و تدبر سے غلبہ و تسلط پاتے ہیں،

مکہ میں تیرہ سال تک ضیغم اسلام اپنی قوتین اور اپنی توجہ صرف کئے بغیر خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، اور یہی ضیغم دس سال تک مدینہ میں اپنے شکار کو تھامے ہوئے رکھتا ہے ان دونوں زندگیوں میں آنحضرت کی حسن رائے، صبر و استقامت کا جوہر، ملکہ سیاست اور وسعت تدبر و عزیمت کا نمایاں اظہار ہوتا ہے، آپ کو جب حیرت انگیز کامیابی اور عظیم الشان فتح و نصرت نصیب ہوتی ہے، تو کفار انگشت بدنداں ہو جاتے اور کہتے ہیں "اگر آپ سلطنت نہ قائم کرتے، اور لشکر کی قیادت نہ فرماتے تو خالص نبی متصور ہوتے"

اگر یہ لوگ جو آنحضرتؐ کو یہ سمجھتے ہیں، کہ آپ نے اپنی زندگی محض وعظ و نصیحت تک محدود نہ رکھی، بلکہ آپ نے اپنی دعوت و تبلیغ کو پہنچانے میں اپنی جان کی بھی پروانہ کی، ٹھنڈے دل سے یہ بھی سوچتے اور غور کرتے، کہ آپ کو اپنے پیغام حق کے پہنچانے اور کلمۃ اللہ کو سربلند کرنے کے لئے کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی، تو وہ آنحضرت کو ایک پیشوا اور رہبر اور مصلح و فاتح سمجھنے میں ہمارا ساتھ دیتے،

بت پرست، عصبیت پرور، سنگ دل و خون ریز اور غارت گر قوم کے نزدیک آنحضرتؐ کی دعوت و تبلیغ کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اُنھوں نے آپ کا تمسخر آمیز اور مضحکہ خیز انداز میں استقبال کیا، کیونکہ قریش نے آپ کی دعوت کا رد کرنے کے لئے یہی ایک طریقہ موثر جانا اُنھوں نے آپ کو اور بنو ہاشم کو ایک ایسے درجہ پر پہنچا دیا تھا، کہ زبان ہلانے کا یارا تک نہ تھا۔

اگر یہ ناقدین عربوں کی زندگی کو چشم بصیرت وا کر کے دیکھتے، تو ان کو بآسانی صورت حال کا اندازہ ہو گیا ہوتا، اگر آنحضرتؐ حکومت الٰہیہ کے قیام کی جد و جہد نہ فرماتے اور اپنی تمام زندگی میں ایک ہی مقام پر توقف فرماتے، تو آپ کے دین کی چند واعظانہ یادگاریں باقی رہ جاتیں، جو تاریخی حکایات و واقعات کے ضمن میں دہرائی جاتیں، یا آپ کا پیغام دیگر انبیاء کے ادیان کی طرح برائے نام باقی رہ جاتا، اس وقت اعدائے اسلام اور مخالفین دین میں سے کوئی اس دعوت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوتا

اور دین اسلام کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا، علاوہ اس کے ناقدین کی ایک ایسی ہستی کے بارے میں کیا رائے ہے، جو عقل و تدبیر میں پختہ کار اور جواں مرد ہے، اُدھر اس کی قوم نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اور وہ ان سے روپوش ہو جاتا ہے، پھر قوم کے افراد اس کا تعاقب کرکے اس کا خاتمہ کردینا چاہتے ہیں، ہرچند کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان محض عقیدہ کا نزاع تھا، جس نے آپ کو اس راہ میں بے شمار اذیتوں اور تکلیفوں کے برداشت کرنے پر آمادہ کیا، اور جو آپ کی زندگانی کا اساس اور حیات جاودانی کا سرمایہ تھا، کیا آپ ایسی حالت میں مدینہ میں اپنی قوم کا انتظام کرتے ہوئے بیٹھ جاتے کہ وہ آکر آپ کو قتل کردیں ؟ اگر نکتہ چیں حضرات کو اس امر سے اختلاف ہوتا، کہ آپ کا مقصد دنیا کی دولت سے فائدہ کمانا تھا، تو ہم ان کی نکتہ چینیوں کے اصل مدعا میں غور کرسکتے، لیکن واقعہ اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے، آپ کی غرض و غایت کبھی دنیا کمانے اور مال و زر جمع کرنے کی نہ تھی،

آنحضرت ؐ کمالِ عقل و دانائی اور دور اندیشی کے مالک تھے، مدینہ میں پہنچتے ہی آپ نے اپنی دعوت کی حفاظت اور اپنی قوم کی مدافعت کے لئے، جنھوں نے تیرہ سال کی مسلسل مشقتوں کے باوجود آپ کی نصیحت کو قبول نہ کیا، ساز و سامان کی تیاری شروع کردی، اپنی بالغ نظر اور روشن فکر سے اپنے اور اپنے اصحاب کی مدافعت کے وسائل میں غور کیا، اس کو بہترین طریقہ سے استعمال کرنے کا

وسیلہ سوچا، آخرکار آپ کو وہ عظیم الشان کامیابی اور حیرت انگیز فتح نصیب ہوئی، جس کے بارے میں دائرۃ المعارف برطانیہ رقمطراز ہے،

"یہ وہ کامیابی ہے، جو آپ کے قبل کسی دور میں بھی کسی دینی مصلح کو نصیب نہ ہوئی"

یہ بے مثال فوز و فلاح آنحضرتؐ کے نہ صرف زہد و عبادت، تواضع و انکسار، رحمت و رافت، ظاہر و باطن اور مقصد و مدعا کی تصویر کو بلا کم و کاست پیش کرتی ہے، بلکہ مدینہ میں آپ کی تبلیغ کے اس تکمیلی خاکہ کو ظاہر کرتی ہے، جو مکہ میں حاصل نہ ہو سکا تھا، حکومت کے نقطۂ نظر سے جو عظمت و فوقیت آپ کو حاصل ہے، وہی نبوت میں بھی جھلکتی ہے، آپ کے طریقۂ حکومت سے آپ کی نبوت کی شان پر بھی روشن دلیل قائم کی جا سکتی ہے، کیونکہ فاتحین کی تاریخ میں آپ ہی ایک ایسی ہستی ہیں، جو حکومت و دولت کے حاصل ہونے کے باوصف ایک فقیرانہ اور زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں، پھر جب اس دنیائے فانی سے رحلت فرماتے ہیں، تو اپنی خلافت کا جانشین کسی کو نہیں بناتے، بلکہ اپنے وارثین کے لئے بھی کسی قسم کی تصریح نہیں فرمائی، اس کے برعکس فرماتے تھے"

"ہم انبیاء کی جماعت ہیں، کسی کو وارث نہیں بناتے، جو کچھ ہمارا ترکہ ہے وہ صدقہ ہے"

آپ کو نماز میں یاد آگیا کہ آپ کے گھر میں کچھ سونا باقی رہ گیا ہے تو آپ نماز میں جلدی فرماتے ہیں اور گھر آکر بقیہ سونا تقسیم کر دیتے ہیں محض اس خیال سے کہیں آپ اس حال میں انتقال نہ فرما جائیں، کہ

آپ کے پاس دنیا کی کوئی چیز باقی رہ جائے۔

آپ اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوتے ہیں اور اپنا سر جھکائے ہوئے ہیں، ادھر آپ کے سامنے دشمن عاجز و ذلیل ہو کر کھڑے ہوئے ہیں، آپ کو خدشہ ہونے لگتا ہے، کہ کہیں آپ کے دل میں خود پسندی اور کبر کا شائبہ پیدا ہو جائے،

بلا شک و شبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اپنی مدنی زندگی میں امت کی قیادت فرماتے ہوئے اپنے دور حکومت میں رسالت کے اُن فرائض کو جنھیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذمہ گردانے تھے، نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سرحد انجام تک پہنچایا، ہماری آنکھوں کے روبرو آپ نے اپنے واجبات و فرائض کو، مناسب اوقات اور موزوں مواقع پر عملی جامہ پہنا کر دکھایا،

اگر آپ دنیا سے رخصت فرما جاتے، اور اپنا یہ حیرت انگیز عملی کارنامہ دنیا کے روبرو پیش نہ کرتے، تو بطلِ اعظم اور بے مثال ہستی نہ بن سکتے، اگر محض وعظ و نصیحت کی باتیں اصلاح و انقلاب کی ذمہ دار ہو سکتیں، تو لوگوں کو مصلحین اور قائدین کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، کتابوں کے ذریعے سے لوگ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے،

لیکن آنحضرتؐ کی شخصیت میں ایسے کردار جلوہ گر نظر آتے ہیں، جو آپ کے اقوال سے ہم آہنگ ہیں، جنھیں آنکھیں مشاہدہ کرتی ہیں، کان سنتے ہیں اور حسِ مشترک غور کرتی ہے، یہی وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کو بے نظیر ہستی بناتی اور انسانوں کو بلند مرتبے تک پہنچاتی ہیں، چنانچہ

بقول بوزرز اسمتھ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) علی الاطلاق دنیا کے مصلح اعظم ہیں"

ہم نے اپنے گزشتہ بیان میں دیگرادیان کے بعض مصنفین و ناقدین کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے' جنھوں نے آنحضور اکرم کو مکی اور مدنی دو شخصیتوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے' اب میں یہاں آنحضرت کی اُس اہم خصوصیت پر روشنی ڈالوں گا جو اس باب کا اصلی مدعا ہے' جو ہمارے اخلاق کی روح کو زندہ کرنے کے لیے سامان حیات فراہم کرتا ہے'

آنحضرتؐ اپنے رفیق ابوبکرؓ کے ساتھ سفر کی مشقیں برداشت کرتے ہوئے مدینہ میں تشریف لائے' آپ نے اپنے اور اپنے اصحابؓ کے لئے یہاں کے لوگوں کی حمایت کا عہد لینا چاہا، تو آپ کو اس میں کامیابی نہ ہوئی' بالآخر آپ نے اپنے ضمیر کی روشنی میں صلح و آشتی، تنظیم داخلی اور امن خارجی کی ضرورت محسوس کی

مدینہ میں آپ اس وقت تشریف لائے جب کہ اوس اور خزرج کی باہمی جنگ و جدل کو ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا' ان دونوں کی عداوت اور باہمی فتنہ پردازیاں قیامت کا سامان فراہم کر چکی تھیں' ادھر یہود فتنہ و فساد کا بازار گرم کرنے اور عداوت و عناد کی چنگاریاں بھڑکانے کی کوشش میں مصروف تھے' کیوں کہ ان کو اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اوس و خزرج کہیں متحد و منظم ہو کر اُن کی مصیبت کا موجب نہ بن جائیں'

مدینہ کی جانب جن اصحاب نے ہجرت کی تھی ابھی ان میں اتنی طاقت فراہم نہ ہوئی تھی' کہ وہ آپ کو پناہ دے سکیں' آپ ایسی

قوم میں پناہ گزیں ہوئے، جس کو آپ کے اہل و عیال اور خاندان سے سخت نفرت تھی، مسلمانوں نے آپ کا شجاعت اور دلیری سے شاندار استقبال کیا، ادھر یہود مشرکین نے بھی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا، مسلمانوں کی یہ آرزو تھی، کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے ان لوگوں کی اصلاح کرے اور نفاق و شقاق کو دور کردے، اس طرف یہود و مشرکین اس امر کے متمنی تھے، کہ ایک عرب کا رہنے والا جس کو اہل کتاب سے الفت و مودت ہے یتوں کی حمایت کرے گا تاکہ ایک طرف عرب پر غلبہ پاسکیں اور دوسری جانب شمال میں نصرانیت کا مقابلہ کرسکیں، اس لحاظ سے آپ کو نت نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہاں بھی یہود و مشرکین کی نگاہوں کا شکار ہونے کا اندیشہ ہوگیا،

اب غور طلب امر یہ ہے کہ آپ نے ایسے نازک مواقع پر کس حکمت عملی اور دور اندیشی سے کام لیا اور اس دشوار گزار اور خطرناک منزل کو کیوں کر طے کیا؟ آپ کے اندر ہر مہم کام کو انجام دینے کی صلاحیت و استعداد موجود تھی، اللہ نے آپ کو نہ صرف وحی سے سرفراز فرمایا تھا، بلکہ انسانیت کا بلند مرتبہ عطا کر کے حسن تدبیر اور کمال دانائی سے آراستہ کیا تھا،

سب سے پہلے آپ نے ایک مسجد تعمیر کرنی شروع کی، یہی وہ مسجد تھی جس کے اندر دین و دنیا کی فلاح و بہبودی کا سرمایہ پوشیدہ تھا، اسی میں اسلامی پارلیمنٹ قائم ہوتی، یہی اسلامی سلطنت کا پایہ تخت اور قیادت کا اعلیٰ مرکز سمجھی جاتی تھی، جہاں سے تبلیغی احکام

اور اصلاحی قوانین تمام جگہ نافذ کرائے جاتے تھے، اسی مقام پر سیاسی تدابیر اور فوجی احکام کو روبہ عمل لایا جاتا تھا، اسی میں وفد آیا کرتے تھے اور اسی جگہ تمام کو کتاب و حکمت کی تعلیم سے نوازا جاتا تھا،

مسجد کی تعمیر بہت ہی سادہ تھی، جو آپ کے اور آپ کے صحابہ کی تواضع پسند طبیعت کے بہت موزوں تھی، ہر وقت آپ لوگوں کے سامنے اسی حقیقت کو بیان فرماتے تھے، کہ حوادث زمانہ پر قابو پانے اور انقلاب روزگار میں فلاح و کامیابی کا دارومدار محض روحانی قوت اور اخلاقی اصولوں پر ہے، یہ چیز شاندار عمارتوں اور شان و شوکت کے مظاہرہ سے حاصل نہیں ہو سکتی،

اسی چھوٹی سی مسجد کے ذریعہ رفتہ رفتہ ایک ایسے اسلامی ادارہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے، جو تمام جزیرۂ عرب پر مستولی ہو جاتا ہے، روم اور ایران کی بڑی بڑی سلطنتیں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں، اسی مسجد میں مناسب اوقات و احوال میں مختلف تدبیریں اور منصوبے سوچے جاتے ہیں، لیکن جو انقلابی طریقۂ کار اختیار کیا گیا تھا اور جس شاندار اصول کو پیش نظر رکھا گیا تھا، وہی آگے چل کر حکومت الٰہیہ کی وسعت و تشکیل کا پیش خیمہ اور انسان کی عظیم الشان اصلاحی قوانین کی تمہید ثابت ہوا، ان تدابیر کی وجہ سے مدینہ مسلمانوں، یہود و مشرکین الغرض عرب و عجم کے مختلف و متضاد قبائل و طبقات کا وطن قرار پا گیا،

پہلے ہی مرحلہ میں وطنیت کا مفہوم ذہن نشین کرا دیا گیا، کہ لوگ بلا تفریق حسب و نسب اور بلا امتیاز عصبیت نسل و قوم ایک ہی نظام میں مربوط جملہ حقوق اور احکام و قوانین میں مساوی درجہ رکھتے ہیں،

آنحضرت نے مختلف اقوام و ادیان کے لوگوں کے لئے ایک جدید وطنی دستور بنایا، جس میں تمام کو وطنی قرار دے کر اُن پر یہ امور عائد کر دئیے، کہ ملک کی ہر قسم کی مدافعت اُن پر لازمی ہے، وہ صلح و جنگ کے ذمہ دار ہیں، اپنے غیر کی مدد نہیں کرسکتے، اہل وطن کے خلاف، خواہ ان کے رشتہ دار، باپ اور اولاد ہی کیوں نہ ہوں امداد بہم نہیں پہنچا سکتے، آپ نے اہل وطن کے مالوں، جانوں اور اُن کی آبروؤں کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ان کو عقیدہ و مذہب کے معاملات میں آزادی دے دی،

اس دستوری صحیفہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے، کہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ خط پیغمبر محمدؐ کی جانب سے قریش و یثرب کے مومنوں، ان کے پیروکاروں، رشتہ داروں اور مجاہدوں کے لئے لکھا جاتا ہے، اور ان کو آگاہ کیا جاتا ہے، کہ وہ سب ایک ہی پارٹی اور جماعت ہیں، جو یہود ہماری اتباع کریں اُن پر کبھی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا، ان کی مدد کی جائے گی اور اُن کے خلاف کوئی سازش نہ کی جائے گی، بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ ہیں، مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور ان کے جو غلام ہیں وہ انھی کے ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا دین ہے، باقی رہے وہ

یہودی جنھوں نے معاہدہ کیا ہے، ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ اور سلوک کیا جائے گا، جو بنو عوف کے ساتھ کیا گیا ہے، یہودیوں اور مسلمانوں کو آپ اپنے نفقات و مصارف برداشت کرنے ہوں گے جو لوگ اہل صحیفہ کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہوں، تو یہودیوں کا فرض ہے، کہ ان کے خلاف ہر قسم کی امداد بہم پہنچائیں۔ ان کے ساتھ ہر قسم کی بھلائی، احسان اور حسن سلوک روا رکھا جاتا ہے مدینہ کے حدود اہل صحیفہ کے لئے حرام ہیں، اپنے ہمسایہ کو اپنی طرح سے سمجھنا چاہئے، اس پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے، نیز اُسے کسی طرح کا نقصان بھی نہ پہنچایا جائے، اہل صحیفہ کے درمیان ایسے اختلافات اور مناقشات برپا ہو جائیں، جن سے فتنہ و فساد کے پھیلنے کا اندیشہ ہو، تو ان کو فیصلے کے لئے اللہ عزوجل اور محمد رسول اللہؐ کے حوالے کر دینا چاہئے"،

اس جدید دستوری صحیفہ کی وجہ سے مدینہ کی حکومت کی زمام آنحضرتؐ کے ہاتھوں بلا قصد و مطالبہ چلی آئی، عہد و پیمان شکنی کی صورت میں ایک حکم کی ضرورت لاحق ہوا کرتی، لیکن آپ ہی حکم مقرر ہوتے، چنانچہ اسی وقت سے اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا،

آنحضرت نے پہلی مرتبہ بلاد عربیہ میں امت کے حق کو قبیلہ کے حق پر ترجیح دی اور تمام حدود و احکام کا دار و مدار اللہ کی شریعت اور اس کے پیغامبر پر رکھا، اس وقت عصبیت جاہلیہ کا طوفان بہت زور و شور پر تھا، جس کی رَو میں مجرم و غیر مجرم گنہگار

و نیکو رتمام بہ رہے تھے، اس لئے آپ نے جابر و متکبر قوموں میں تمدن کا تخم بویا اور اسلامی جمہوریت کی تشکیل کی، جو صدیوں تک دنیا پر حکمراں رہی؛

آنحضرت نے اپنی بصیرت افروز عقل اور ذہن رسا سے معلوم کر لیا، کہ اولًا مدینہ کے لئے اور ثانیًا تمام عالم کے لئے جو نظام آپ قائم کرنا چاہتے ہیں؛ وہ اُس سرکش و باغی قوم میں جو فتنہ و فساد میں مبتلا اور عصبیت کے پنجوں میں گرفتار رہے محض دستوری صحیفہ سے جاری نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس دعوت کی حمایت اور اپنے نظام کی حفاظت کے لئے، جس کے قوانین و اصول صحیفہ میں مقرر کئے گئے ہیں، اور ان تمام عہد و پیمان کی نگرانی و پابندی کے لئے جن سے وطن کا ایک نیا دستور تشکیل پذیر ہوا ہے؛ قوت و طاقت اور عسکری تنظیم کی ضرورت ہے، یہ قوت صرف اُن مہاجرین کے ذریعہ نشو و نما پاتی ہے، جنھوں نے اپنے پرانے نظام سے بھاگ کر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی، یہی لوگ سب سے پہلے آنحضرت کے لائحہ عمل کی حفاظت اور نظامِ حُریت کی حمایت کے علم بردار ہوئے، جیش محمدی کی ترتیب و تنظیم مہاجرین و انصار کے افراد سے ہوئی، اُنھوں نے دعوت اسلامی کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا، اور آپ کے ہر اشارہ پر جان نثاری کا ثبوت دیا، قریش اور دیگر قبائل میں سے سوائے مہاجرین اور انصار کے کوئی اور قوم اس جدید نظام کی حمایت میں بطور سند کے نہیں پیش کی جا سکتی، انصار تو قریش کے دشمن اور حریف تھے،

اہل مدینہ کے درمیان کینہ و عداوت اور بغض و منافرت کی جو چنگاریاں بھڑک اُٹھی تھیں، قریب تھا، کہ وہ آنحضرتؐ کی ظہور قدسی سے پیشتر قبیلۂ اوس کے وجود کا خاتمہ کردیں۔

مہاجرین اور انصار کے اس لشکر کی باہمی ترتیب و تنظیم اُن کی تعلیم و تربیت سے ان کو ایک رشتہ میں منسلک کرنا ان کو دعوت و تحریک اسلامی کی تائید اور اطاعت و ایمان کے لئے تیار کرنا، یہ آنحضرتؐ ہی کا حصہ تھا، جس میں آپ کی عسکری شان نمایاں طور پر نظر آتی ہے، سب سے زیادہ تعجب اور حیرت کا مقام تو یہ ہے، کہ آپ کو مدینہ پہنچے ہوئے ابھی چھ ماہ کا عرصہ نہیں گزرتا کہ اس درمیان میں ایک ایسے لشکر کی تنظیم کرتے ہیں، کہ دو سال ہی کی مدت میں بدر کے میدان میں، باوجود دشمن کی قوت و طاقت سامان و اسلحہ کی زیادتی اور بڑے بڑے سورماؤں کی شہرت کے ان کی تین گنی فوج پر غلبہ و تسلط پا لیتے ہیں اور دنیا نے آپ کے اس نظام کے معجزہ کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا اور بدر کی شکست کے بعد یہ روشن ہوگیا، کہ بت پرستوں کے قدم ڈگمگا گئے، نہ صرف یہی بلکہ کچھ عرصہ کے اندر آنحضرتؐ کا یہ اسلامی لشکر فرانس اور ہندوستان تک فاتحانہ شان سے داخل ہوجاتا ہے، ـــــ آنحضرتؐ نے دیکھا، کہ قبیلۂ اوس آپ کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل اور مدینہ میں عصبیت کی آماجگاہ ہے، تو پہلے اس کو اخوت کی طرف بلایا، قریش اور اوس و خزرج کے مابین بھائی چارہ اور برادرانہ تعلقات پیدا کرادئے، حتیٰ کہ اس کا اثر تیزی کے ساتھ مختلف قبیلوں اور

خاندانوں میں سرائیت کر گیا، جس نے تمام کو انسانیت و اخوت کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا،

یہ مواخات اور بھائی چارگی، جس کی اکثر حکایات اور بیشتر واقعات تاریخ و سیر میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں، جن میں ناموں اور نسبوں کی طول طویل فہرست ہے، امت اسلامیہ کی تنظیم و جمعیت اور اسلامی فتح و نصرت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی،

ابوسفیان فتح مکہ کے دن اسلامی فوج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، جب ایک فوج پرے سے گزرتا تو کہتا یہ کون لوگ ہیں؟ جواب دیا جاتا یہ سلیم کی فوج ہے یہ مزینہ کی، یہ فلاں کی" مگر کوئی اس کی نظروں میں نہ جچتا، یہاں تک کہ ان کے ہی بھائیوں کا ایک لشکر نمودار ہوا، اس نے حضرت عباسؓ سے جو اس کے ساتھ تھے، پوچھا یہ لوگ کون ہیں؟ آپ نے کہا، یہ مہاجرین اور انصار کی فوج ہے، ابوسفیان نے کہا کل تک تو ان کی کوئی قوت اور طاقت نہ تھی، اے ابوالفضل خدا کی قسم تمہارا بھتیجہ آج ایک بڑے لشکر کا مالک بن گیا ہے،

یہی وہ اخوت ہے، جس کو آنحضرتؐ نے قوموں اور قبیلوں کے درمیان عصبیت جاہلیت کو دور کر کے برادرانہ تعلقات کی اسپرٹ پیدا کر دی تھی، جس نے امت عربیہ کو نفاق و شقاق سے نکال کر شاہراہ اتحاد پر گامزن کر دیا، اور نظام جمہوریت کی ایسی تشکیل کی جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے،

آنحضرتؐ بلاشک و شبہ مفکر اعظم تھے، آپ نے اپنی بصیرت کی

روشنی میں مشاہدہ کرلیا، کہ مدینہ میں امن قائم کرنے کے لئے یہاں
کے مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین حریت کی ضمانت کے لئے محض
ایک دستوری صحیفہ اور مدینہ کے داخلی نظام کی حفاظت کی ذمہ داری
کے لئے مسلمانوں کے درمیان محض مواخات و برادرانہ تعلقات کافی
نہیں، تاوقتیکہ مدینہ جزیرۂ عرب کے مشابہ نہ ہوجائے جس میں
مشرکین کی اجازت کے بغیر داخلہ ناممکن ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ
آپ نے اس پیچیدہ معمہ کو کس طرح حل کیا اور اس مہلک مرض
سے کس طرح نجات حاصل کی، پھر کیوں کر مدینہ پر جزیرۂ عرب کے
قواعد نافذ کردئے اور کس طرح چند ہی سال کے اندر یہاں اسلامی
جمہوریت و ریاست کی تشکیل ہوئی،

آپ نے مدنی زندگی میں دو طریقے اختیار کئے، ایک وہ
جس کو دیگر ادیان کے بعض مصنفوں اور بعض تنگ نظر و سطحی
اشخاص نے سمجھا ہے، یہ ہے جب ان کو زندگی کی دشوار گزار
گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ درماندہ و عاجز ہوجاتے ہیں،
دوسرا طریقہ وہ ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے منتخب
فرمایا تھا، جس کو آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ ظاہر کردیا،
پہلا طریقہ خاموش اور پر اسرار تھا، دوسرا علی میدان میں مظاہرہ
کرنے کا تھا، پہلے طریقہ میں جس طرح آپ نے مکہ میں وعظ و نصیحت کی
مدینہ میں بھی تبلیغ و دعوت کے فرائض انجام دیتے رہے، مدینہ
میں ان لوگوں پر اعتماد کیا، جنھوں نے آپ کی حمایت کا معاہدہ کیا
تھا، قریش اور مدینہ کے اطراف کے اعراب کی کارروائیوں اور

عملی اقدامات پر نگرانی فرماتے رہے اُنھیں اس بات سے آگاہ کردیا، کہ اگر وہ آپ سے حسن سلوک سے پیش آئیں اور آپ سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں، تو ان کا یہ رویہ سراسر بھلائی پر محمول ہوگا، اگر وہ آپ کی حمایت اور راہ حق میں مارے جائیں، تو ان کے لئے شہادت کا ثواب اور آپ کی امداد کا فخر حاصل ہوگا۔

آپ کی عملی کارروائی یہ تھی، کہ جب آپ نے اندیشہ کو پالیا، تو اس کی مدافعت اور اپنی دعوت میں ہمت و استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اس راہ کی تمام مشکلات کا مقابلہ کیا، یہاں تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے، جو لوگ آپ کے پاس پناہ لینے کی خاطر آئے آپ نے ان کو امداد پہنچائی، اور جن لوگوں نے ہجرت کی، ان کے فضل و شرف اور مرتبہ کو بڑھا دیا،

آنحضرتؐ ان واعظین وقائدین میں سے نہ تھے، جو اپنی زندگی لوگوں کو بھلائی کا حکم کرنے اور خود اُس پر عمل پیرا نہ ہونے میں گزارتے ہیں، آپ اپنی رسالت و نبوت اور بے نظیر بہادری کے مطابق ایمان اور عمل صالح کی زندہ تصویر تھے،

آپ کے مدینہ میں آنے کی غرض و غایت یہ نہ تھی، کہ کوئی گرجا تعمیر کردیں اور یہودیوں اور مشرکین سے اپنی حمایت طلب کریں آپ کی طبیعت کا تقاضا یہ تھا، کہ آپ حق بات کہنے میں خاموشی کے طریقہ کو چھوڑ کر انقلابی روش اختیار کریں،

بعض اہل مدینہ نے آپ پر ایمان لاکر آپ کی امداد کی اور مشرکین نے بھی مکہ پر غلبہ حاصل کرنے کی حرص و تمنا میں اور مدینہ کے

بازاروں میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کی ہوس میں آپ کا ساتھ دیا، مدینہ میں یہود اس زعم میں مبتلا تھے، کہ وہ اللہ کے خاص چہیتے اور لاڈلے ہیں، ان کے سوائے کسی اور کو اللہ تعالیٰ نبوت سے نہیں سرفراز کرسکتا، ان کی بھی یہ تمنا اور آرزو تھی، کہ آنحضرتؐ کے ذریعہ عرب پر غلبہ حاصل کریں اور اپنی دعوت دین کو پھیلائیں،

مدینہ میں مہاجرین پہلی ہی مرتبہ بخار یثرب میں مبتلا ہوگئے اس سے اُنھوں نے اپنی عورتوں کے بانجھ ہوجانے کا شگون بدلیا، زبیرؓ کی بیوی کے جب بچہ پیدا ہوا، تو اُس وقت جشن منایا گیا، ان لوگوں نے مکہ میں اپنی جائدادیں اور اموال چھوڑ دئے تھے مدینہ آکر فقروفاقہ میں مبتلا ہوگئے، یہ وہ مشقت آگیں زمانہ تھا، جس میں ایمان اور عمل صالح کے بغیر قدم لغزش کھا جانے کا اندیشہ تھا، آنحضرتؐ نے اپنی عقل خداداد اور حسنِ سیاست کے ذریعہ اس پیچیدہ گتھی کو اس انداز سے سلجھایا، کہ یہ خصوصیت کسی مصلح اور فاتح کو کسی دور میں بھی نصیب نہ ہوئی اور نہ ہوگی،

ہم نے گزشتہ بیان میں مدینہ کی حالت کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچا ہے اور مجمل طور پر یہودیوں کی تمناؤں، مشرکین کے ارادوں اور مسلمانوں کے عملی اقدامات پر روشنی ڈالی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ آنحضرتؐ کے لئے بغیر عملی اقدام کے کوئی چارۂ کار نہ تھا، اب ہم یہاں مدینہ کے اطراف و اکناف کے مشرکین اور اہل مکہ کی حالت کو بیان کرتے ہیں، تاکہ آنحضرت کی حسن سیاست اور فکر و تدبر کا اندازہ ہوسکے،

لوگوں کا خیال ہے، کہ مکہ ایک خشک سرزمین اور بے آب و گیاہ مقام ہے جہاں میووں اور غلوں کا نام و نشان نہیں ایک وادی ہے، جس میں کاشت نہیں کی جا سکتی، لیکن بہت کم افراد اس سے واقف ہیں، کہ دعوت اسلامیہ کے ظہور کے وقت مکہ تمام بستیوں میں ایک خوش حال مقام تھا، بلکہ قدیم زمانے میں بہت بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا، قریش اس کے اندر اپنی تجارت کا بیشتر حصہ لیا کرتے اور وہ بہت بڑے تاجر تھے، یہ لوگ اپنے اطراف و اکناف کی قوموں کے احوال سے بخوبی واقف تھے، ان کی ترقی و خوش حالی کا تمام تر دارو مدار یہی سیر و سیاحت اور خانہ بدوشی تھی، انھوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دور دور ملکوں میں تجارت کی غرض سے سفر کرنا شروع کیا، چنانچہ تاریخ سے یہ امر واضح ہوتا ہے، کہ ترقی کا اصلی راز تجارت اور سیر و سیاحت میں مضمر ہے قدیم زمانے کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے، کہ فنیقیہ کے باشندوں نے اسی تجارت و سیاحت کے ذریعہ کتنی ترقی کی، اور عالم کی جدید تاریخ شاہد ہے، کہ برطانیہ نے کس قدر حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا، ان قوموں کی ترقی کا راز صرف اسی میں پوشیدہ تھا، کہ وہ اپنے وطن میں زندگی کی ضرورتوں اور اہم حاجتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے عاجز تھے، اسی وجہ سے ان کو اپنی ضروریات زندگی نے عالم کے دور دور ملکوں میں اپنی کسب معاش کے لئے آمادہ کر دیا، چنانچہ وہ تمام قوموں اور ملکوں سے دولت و سرمایہ میں سبقت لے گئے، یہی حال دعوت محمدیہ کے ظہور کے وقت مکہ کا بھی تھا، یہاں کے لوگ

بہت ہی خوش حال اور فارغ البال تھے، اور قدیم زمانے کے نتائج و ثمرات اُن کی آسائش کے سامان فراہم کر چکے تھے،

اس تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا، تجارت صرف ایک خاندان یا گروہ میں محدود نہ تھی، بلکہ سیرت کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے، کہ ابو سفیان نے جب بدر کے دن اپنے قافلہ پر خطرہ کا اندیشہ محسوس کیا، تو تمام باشندگانِ مکہ کو جمع کیا اور ایک ہزار کا لشکر لے کر نکلا، جس کے ساتھ ایک سو گھوڑے، سات سو اونٹ تھے، جب قریش کو بدر کے موقع پر شکست فاش کھانی پڑی، تو مکہ والے ابو سفیان کے قافلہ کے ساتھ آنحضرتؐ اور آپ کے صحابہ سے انتقام لینے کے لئے اکٹھا ہوئے، اس وسیع تجارت میں مکہ کے منافع کا اندازہ راس المال سے فی صد پچاس کا لگایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اپنے مہمانوں اور تمام جزیرہ کے حاجیوں کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی کیا کرتے تھے، اپنے، قرابت داروں پر جود و کرم کی بارش برساتے، لہو و لعب، شراب نوشی، جوا بازی اور گانے بجانے کی محفلوں وغیرہ میں فضول خرچ کر دیا کرتے تھے،

نبی اکرمؐ اور آپ کے صحابہ کا مدینہ میں جو حال تھا، اس کا ذکر ہم نے گزشتہ بیانوں میں کر دیا ہے، مہاجرین، جن کے مال و اسباب اور مکانات و باغات وغیرہ مکہ میں چھین لئے جا چکے تھے مدینہ میں اس طرح خالی ہاتھ آتے ہیں، کہ ان کے پاس سوائے اساس ایمان اور سرمایۂ اسلام کے کوئی اور چیز نہیں رہی، یہی وہ عمیرؓ ہیں کہ ان کو اپنا بدن تک ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر نہیں ہوتا ہے، یہی علی بن

ابی طالب ہیں، کہ ایک یہودی کے پاس اس کے باغ میں مزدوری کرتے ہیں، اور ایک ڈول پانی کھینچنے پر ایک کھجور ملتا ہے "۔ یہی آنحضرتؐ ہیں، کہ مسجد کی طرف گھر سے باہر تشریف لاتے ہیں، تو ابوبکرؓ و عمرؓ کو راستہ میں پاتے ہیں اور فرماتے ہیں، تم دونوں کس لئے باہر پھر رہے ہیں؟ وہ عرض کرتے ہیں، کہ ہم کو بھوک نے بے تاب کر دیا ہے، اس لئے ہم گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ فرماتے ہیں، مجھے بھی بھوک نے بے تاب کر دیا ہے اسی وجہ سے میں بھی نکلا ہوں" آپ نے جب مکہ چھوڑ دیا تو کیا اس کے سبب سے آپ کی دعوت و تبلیغ کی نشر و اشاعت اور کفر و شرک کی رسوائی و ذلت میں آپ کو کچھ تائید پہنچی؟ ہر گز نہیں، بلکہ قریش کے لوگ تو مسلمانوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، ان کو استہزا اور مضحکہ خیزی کا نشانہ بنا رکھا تھا، قوم کے قوی اور سر برآوردہ افراد کمزوروں اور مرعوب اشخاص کو مکر و فریب میں مبتلا کر کے اپنی طرف مائل کر لیتے، اپنے لات و ہبل کی مدد کے لئے قید کر دیتے اور مسلمانوں کو اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتے، کہ انھوں نے لات و عزیٰ کو رضا مند کر دیا،

آنحضور اکرمؐ اپنی رسالت کے علم بردار، عالی ہمت، بلند حوصلہ تھے اور اپنے اصحاب میں سب سے زیادہ نیک اور شجاع ہستی تھے آپ نے تمام مصائب و مشکلات کو برداشت کیا، ان کی مدافعت میں عملی قدم اٹھایا، قریش کو، ان کی تجارت میں جو ان کے پاس عزیز تھی، سہولتیں بہم پہنچا کر، ہدایت پر لانے کی کوشش فرمائی، مدینہ کے

اردگرد کے عربوں کو شرک و بت پرستی سے باز رکھا، مدینہ کی ان فتنہ و شر اور عصبیت کی چنگاریوں کو بجھانے میں، جن کو یہود اوس اور خزرج اور مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان بھڑکا رہے تھے، کوشش کی اور امن و امان قائم کرنے میں مصروف رہے۔

یہی وہ تین مہتم بالشان اغراض و مقاصد ہیں، جن کو حاصل کرنے کے لئے اولوالعزمی، ہمت و استقامت اور تنظیم کی اشد ضرورت ہے، یہ وہ علو ہمتی کا کام ہے، جس میں آنحضرت صلعم کو وہ امتیازی کامیابی نصیب ہوئی، جو آپ سے قبل کسی نبی نے حاصل نہیں کی، یہ دور جس میں مدینہ کی اصلاح، مہاجرین اور انصار کی دینی و تمدنی تربیت اور ان کے ذریعہ سے تمام لوگوں کی مشکلات مقابلہ کرنا پڑا، آنحضرت صلعم کے لئے حد درجہ آزمائش اور کٹھن مشکلات کا دور تھا، جس میں آپ کو سیاسی تجربہ اور عسکری نظام کی قوت نصیب ہوئی۔

مدینہ پہنچے ہوئے آپ کو ابھی چھ ماہ گزرے تھے، کہ آپ نے پہلا اسلامی جھنڈا عبید اللہ بن حارث کے ہاتھ بلند کرنے کے لئے عطا کیا، اس کے بعد آپ کے غزوات کا سلسلہ برابر جاری رہا، جنگ بدر سے پہلے آپ کے پورے لشکر نے کوئی مادی اور دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا تھا، انھوں نے تو محض سیاسی اور عسکری اغراض کو، جو استقلال و ثبات قدمی اور سلطنت کے استحکام کے لئے ضروری تھے، کافی طور پر حاصل کر لیا تھا، مہاجرین کے دلوں میں آرزوئیں جوش مارنے لگیں، ان کی باطنی حالت شاندار ہو گئی، اور ان کے

بدنوں میں، جو یثرب کی بیماری کا شکار ہو گئے تھے، طاقت و توانائی اور شگفتگی پیدا ہو گئی، مسلمان ایک منظم اور متحد طاقت میں عمل کرنے کے عادی ہو گئے تھے، جس میں اُن کے حسب و نسب کا کوئی شائبہ نہ تھا، بلکہ اُنھوں نے اپنے دلوں سے عصبیت و خبیث اور قبیلہ و خاندان کے امتیازی جذبات و احساسات کو مٹا دیا تھا۔

اہل مدینہ نے مسلمانوں کی اس فوجی نقل و حرکت سے محسوس کر لیا، کہ آنحضرتؐ یقیناً اینٹ کا جواب اینٹ سے پتھر کا جواب پتھر سے اور قوت کا جواب قوت سے دینے والے ہیں ادھر اعراب نے اچھی طرح جان لیا، کہ جو ہستی قریش کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے لشکر کو ساتھ لے کر نکلی ہے، اس کے بازو کسی کے رعب و قوت سے دبنے والے نہیں، اگر آپ میں کچھ ضعف و اضمحلال کے آثار ان کو نظر آئے تو وہ آپ سے پہلے مدینہ پر چڑھائی کر دیتے اور یہاں کے جانوروں اور چرواہوں کو قتل و غارت کر کے اپنے قصوں اور افسانوں میں نہایت فخر و شان کے ساتھ بیان کرتے جنھیں ان کی عورتیں تک پڑھتی رہتیں، اسی طرح قریش کو بھی اس کا بخوبی علم ہو گیا تھا کہ نبی اکرمؐ اور آپ کے اصحاب کو صرف اس بنا پر ان کے گھروں اور وطن سے نکال دیا گیا ہے، کہ وہ اللہ کے دین پر قائم تھے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت دیتے تھے، مدینہ میں انھوں نے اپنی اقتصادی زندگی خطرناک اور ردی صورت میں اور دینی زندگی بے خوف و خطر حالت میں گزاری، قریش کو معلوم ہو گیا تھا، کہ آپ ان کی عزیز ترین چیز یعنی تجارت کو ایسا ہی روک دینا چاہتے ہیں، جس طرح سے کہ

اُنھوں نے آپ کی محبوب ترین شئی یعنی عقیدۂ دین کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے، اگر وہ تجارت میں آزادی کے طالب و خواہش مند ہیں، تو ان پر ضروری ہے، کہ وہ حریت اعتقاد کا بھی اعتراف کریں، جس کا معاہدہ بدر، اُحد اور احزاب کی خوں ریز جنگوں کے بعد کیا گیا، جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے،

عسکری تنظیم اور فوجی تربیت مسلسل دو سال تک برابر جاری رہی، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے اندر جنگ کی قدرت، اور معرکہ میں استقامت و استقلال کی صلاحیت کا یقین کرلیا، تو آپ نے عملی قدم بڑھانے میں کوئی پس و پیش نہ کیا، چنانچہ آپ نے میدانِ بدر میں اپنے صحابہ کے ساتھ قریش کے آنے کا انتظار کیا، قریش کثیر ساز و سامان، ایک ہزار مسلح لشکر، سو شہ سواروں اور سات سو اونٹوں کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے میدان میں اُترے، آپ کے ساتھ صرف تین سو چودہ کا لشکر تھا، جس کے پاس چند تلواریں، تین گھوڑے اور سات اونٹ تھے،

آپ نے اپنے اطمینان نفس کی خاطر کہ صحابہ میں جنگ کرنے کی کہاں تک استعداد اور اس کا جذبہ موجود ہے، ان سے اس بارے میں رائے دریافت کی، مہاجرین نے سب سے پہلے گفتگو کی اور اپنی بہترین رائے اور اپنی آمادگی کا اظہار کیا، مقداد بن عمرو نے یہاں تک کہا کہ یا رسول اللہ! آپ اپنے مقصد کو جاری رکھئے قسم اس ذات کی، جس نے آپ کو حق پر مبعوث کیا ہے، اگر آپ

ہمیں برک غماد (ملک یمن میں ایک مقام ہی میں بھی جا کر جنگ کرنے کا حکم دیں، تو ہم آپ کی قیادت میں اُس کے اُس پار بھی جنگ کرنے تیار ہیں، رسول اللہؐ نے اُن کا شکریہ ادا کیا، پھر آپ نے فرمایا اے لوگو اب مجھے مشورہ دو، گویا آپ کا اشارہ انصار کی طرف تھا، کیوں کہ آپ کے ساتھ اُن کی بیعت صرف اس حد تک تھی کہ آپ جب تک اُن کے ملک کے حدود میں رہیں، یہ حفاظت کریں گے، اس لئے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا، کہ مدینہ میں اگر دشمن آپ پر حملہ آور ہو، تو شاید اس صورت میں یہ آپ کی امداد کریں گے اور اگر ان کے بیرون حدود میں حملہ آور ہو، تو یہ حمایت اُن پر فرض نہ ہوگی، چنانچہ سعد بن معاذ نے کہا یا رسول اللہؐ! کیا آپ ہماری رائے پوچھنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، سعد نے کہا ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور شہادت دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ برحق ہے، اُس پر ہم نے آپ کی اطاعت دیا بندی کے لئے عہد و پیمان باندھا آپ نے جو ارادہ فرمایا ہے یا رسول اللہ؟ اس کو پورا کیجئے، ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو حق پر مبعوث کیا ہے اگر آپ دریا میں گھسنے کا حکم دیں، تو ہم آپ کے حکم سے اس میں کود پڑنے کے لئے تیار ہیں، ہمارا ایک فرد بھی اس کا خلاف نہ کرنے پائے گا، ہمیں کبھی یہ چیز ناپسند نہیں کہ آپ کل کے دن دشمن سے مقابلہ کریں، ہم آپ سے عہد کرتے ہیں، کہ لڑائی میں صبر و استقامت سے

لڑیں گے، جنگ کے وقت جواں مردی اور بہادری کے جوہر دکھائیں گے، شاید خدا ہماری وجہ سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کردے، آپ اللہ کا نام لے کر ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائیے" آپ حضرت سعدؓ کی اس تقریر سے بہت ہی خوش ہوئے آپ نے فرمایا آگے بڑھو اور خوش ہو جاؤ یہ خوش خبری بھی سن لو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فتح و نصرت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، بخدا میں قوم کے پچھڑے جانے کے مقامات کو دیکھ رہا ہوں"

جنگ بدر کے دن لشکر اسلامی کی یہ وہ روح تھی، جس نے مہاجرین و انصار کے دلوں میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی آمادگی پیدا کر دی، ان کے نفوس بادہ ایمان سے لب ریز اور ان کے قلوب تنظیم و اتحاد کی طاقت سے صیقل شدہ تھے، بطل اعظم کی دور اندیشی اور عقل و بصیرت کی یہ روشن دلیل ہے، کہ آپ مشورہ و وفاداری کو ملحوظ رکھتے ہیں، آپ کے مشورہ کا ثبوت یہ ہے کہ آپ لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ مشورہ دیں حالانکہ آپ بخوبی جانتے تھے، کہ اگر آپ ان کے ساتھ دریا میں گھس پڑیں یا غار میں کود پڑیں تو یہ ہرگز آپ کی مخالفت نہ کریں گے، آپ کا ادب اور پاس وفاداری یہ ہے، کہ آپ انصار سے اجازت طلب فرماتے ہیں، کیوں کہ ان سے اس سے قبل ایسی جنگ کے لئے بیعت نہیں لی گئی تھی،

جب معرکہ آرائی کی گھڑی آ پہنچی، تو ایک قلیل گروہ نے ایک بہت بڑی تعداد پر فتح پائی، آنحضرتؐ کا لشکران دو ظاہری

اصول کی وجہ سے غالب رہا پہلا اصول تنظیم و اتحاد کی قوت، اور
دوسرا موت کو حقیر سمجھنا، لوگوں نے بدر کے دن اس نظام کے معجزہ
کو مشاہدہ کر لیا، جب کہ مشرکین کے لشکر نے مضبوط اور مستحکم صفوں
پر دھاوا بول دیا، اور ان کو ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا سکے، اور
ایسی ثابت قدمی اور استقلال کے جوہر دکھائے، جو اس سے پیشتر
شاید ہی سننے میں آئے ہوں، لوگوں نے غزوۂ بدر میں اس امر کو
بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، کہ تین سو آدمی جن کی آنحضرت نے
تربیت و تنظیم فرمائی تھی، قلیل مدت کے اندر روئے زمین کو،
خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے، فتح کر لیتے ہیں اور سیاہ و سفید
اور سرخ و زرد کے مالک بن جاتے ہیں، جنگ بدر کے خاتمہ کے
بعد تمام دنیا نے معلوم کر لیا، کہ تنظیم و اتحاد اور موت کو حقیر سمجھنے
کے اندر کس قدر زبردست قوت پوشیدہ ہے، پھر اس کے
بعد جنگ احزاب میں بھی لوگوں نے اندازہ کر لیا، کہ ایک وہ قوم
جو اپنی زندگی سے زیادہ حق سے محبت رکھتی ہے، کس طرح فتح یاب
ہو جاتی اور تنظیم کی بدولت ایک بہت بڑے لشکر پر غالب آجاتی
ہے، واقعہ خندق میں منافقین کی قلعی کھل گئی، یہودیوں نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا، لیکن آنحضرت کے
لشکر کی تنظیم و تربیت میں کوئی خلل اور آپ کی زیر قیادت استقلال
و استقامت میں کوئی لغزش واقع نہ ہوئی، یہ سب آپ کی عقل و
و تدبیر اور صبر و شجاعت کے بہترین نتائج تھے، کہ مشرکین کی جماعتیں
مدینہ سے تاریک رات میں واپس لوٹ گئیں، ان کا شیرازہ منتشر اور

ان کی قوتیں تتر بتر ہو گئیں،

آنحضور اکرم کی یہی وہ سچی قیادت اور پیشوائی تھی، جس نے مدینہ کو جنگ اُحد میں نجات دلائی، اور آپ نے اُس وقت اقدام میں تیزی سے کام لیا، جب کہ آپ کا لشکر دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو گیا تھا، اگر آپ اپنے لشکر کے ساتھ، جس میں تنظیم و اطاعت کی طاقت پیدا ہو چکی تھی، عجلت نہ فرماتے، تو قریش کی قوم مدینہ پر دھاوا بول دیتی اور مسلمانوں کے باقی ماندہ لشکر کا بھی خاتمہ کر دیتی، یہی وہ اعلیٰ قیادت ہے، جس نے قریش پر غلبہ پا لیا اور ایک ایسا دن آیا، جس میں ہزیمت خوردہ لوگ فتح مندوں کی پیروی کرنے لگتے ہیں،

یہ بعض حقایق و واقعات ہیں، جن کو ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، جو تاریخ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ پائے جاتے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ آنحضرتؐ کی جلالت و منزلت ایک بادشاہ اور سیاست دان ہونے کی حیثیت سے کیا تھی، اور آپ کے اندر قیادت کی قوت کہاں تک کارفرما تھی،

تعجب و تحیّر خیز امر تو یہ ہے، کہ اس عسکری نظام و ترتیب نے اور واقعات و غزوات، تدبیر و تدبر اور مشورہ و رائے کی وجہ سے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اسلامی سلطنت کی تشکیل عمل میں آتی ہے، جو مقصود بالذات نہیں تھی، جس نے تاریخ عالم میں جمہوریت و ریاست کے لئے سنگ بنیاد قائم کیا،

اب ہم پوری بحث کا خلاصہ مختصر طور پر یوں بیان کرتے ہیں،

ہرگز اس بات کا شبہ نہیں کیا جا سکتا، کہ سلطنت وحکومت آنحضرت کی حقیقی غرض وغایت تھی، بلکہ یہ ایک ضمنی اور عرضی شئی تھی اور یہ ایک ذریعہ تھا شرک و بت پرستی کو دور کرنے کا، وسیلہ تھا خدائے وحدہٗ لا شریک کا کلمہ بلند کرنے کا، تدبیر وصورت تھی تبلیغ و دعوت کی نشر و اشاعت کی، کیوں کہ مکہ والوں نے مسلمانوں پر حد درجہ مظالم ڈھائے اور ان کو بے جا اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں، جب ان کے انسداد کے لئے آنحضرتؐ کی تمام جد و جہد رائگاں گئی، اسلامی عقیدہ کی آزادی دشوار اور اس کے مقتدوں اور پیروکاروں کی زندگی دوبھر کردی گئی اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں ایک خلیج حائل ہوگئی تو آپ قوت کا جواب قوت ہی سے دینے کے لئے مجبور ہوگئے اور آپ کو آزادی کامل کا مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اسی طرف قرآن مجید نے فصیح و بلیغ انداز میں اشارہ فرمایا ہے!

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ	اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا، تو گرجا گھر، مندر، عبادت خانے، اور مسجدیں، جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے تباہ کر دیئے جاتے۔

الغرض اس جہد و اجتہاد، عملی اقدام اور جارحانہ مدافعت سے ایک اساسی اور بنیادی اصول کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہے کہ زبردست اور تشدد پسند قوموں میں حریت اعتقاد کو رائج

کیا جائے، جس طرح بطل اعظم نے شروع اسلام میں مصیبتوں اور ایذاؤں پر صبر و عزیمت سے کام لیا، اسی طرح آپ نے تنظیم و اتحاد کو مستحکم کرنے اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی سعی فرمائی،

نواں باب

مخلوق کی خیر خواہی

دین اسلام کے احکام و اصول نہایت سہل اور قابل عمل ہیں، اسلام نے روا داری کا حکم دیا ہے۔ وہ مسلمانوں پر یہ لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اوروں کے لئے بھی وہی پسند کریں جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں، لوگوں کو اسلام کی طرف حکمت و موعظت کے پہلو سے دعوت دیں اعتدال کو ملحوظ رکھیں اور پراگندگی و انتشار برپا کرنے سے پرہیز کریں، حق کی تبلیغ نہایت واضح انداز اور سہل ترین طریقے سے کریں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا، جب تک انسان نامعلوم چیزوں کا علم حاصل نہ کرے اس وقت تک وہ نہ ان کا

اعتقاد رکھ سکتا ہے اور نہ ان پر عمل درآمد کر سکتا ہے، ان کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں، ان کو تاوقتیکہ وہ بحث و تمحیص سے دور نہ کرے کسی طرح وہ مطمئن نہیں ہو سکتا،

دعوت و تبلیغ حق کے باب میں مسلمانوں کا شعار آنحضورؐ کا اُسوۂ حسنہ ہونا چاہیئے، آنحضور اکرمؐ دعوت الی اللہ میں کائناتِ ارضی و سماوی کی کھلم کھلی نشانیاں اور آثار قدرت کو پیش کیا کرتے تھے، جن لوگوں کو آپ اسلام کی دعوت دیتے ان سے نرمی کا سلوک کرتے اور وقت ضرورت اُن کے شکوک و شبہات کو باحسن وجوہ دور فرماتے، اگر وہ آپ سے دور بھاگتے تو آپ اپنی اُلفت و محبت اور اپنے اخلاق و کردار کی کشش سے ان کو اپنی طرف مائل کر لیتے، اگر وہ جلد بازی کرتے تو آپ ان کو مہلت دیتے، اگر وہ سختی اور تیزی کرتے تو آپ ناراض نہ ہوتے کسی معاملہ کی تحقیق و تمحیص کے وقت اگر وہ ہیجان میں آجاتے تو آپ غضب ناک نہیں ہوتے، آپ ان کو اس وقت تک یوں ہی نہیں چھوڑ دیتے تاوقتیکہ ان کے شکوک و شبہات کو ایسے دلائل و براہین کے ذریعہ دور نہ فرمادیتے جو ان کے اذہان و عقول کے مناسب ہوتے تھے۔

اسلام نے اسلامی مبلغین پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ

کسی انسان سے بُرا برتاؤ نہ کیا جائے، جہلاء و عوام کو معذور سمجھ کر ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، واضح دلیلوں اور تشفی بخش بیانوں سے ان کے شک و شبہ اور جہل و نادانی کو رفع کرنے کی سعی کی جائے، اگر وہ ماننے سے انکار کر دیں، اور گھمنڈ اور سرکشی کریں تو یہ شیوہ ہونا چاہیئے کہ ان کے افکار و آراء پر تنقید و تبصرہ کرنا چاہیئے نہ کہ ان کی ذاتیات اور شخصیات کو نشانۂ طعن و تشنیع بنایا جائے، راہ حق پر ان کو گام فرسا کرنے کے لئے صبر و استقامت سے کام لیا جائے جذبۂ انتقام کو کسی صورت استعمال نہ کیا جائے،

کیا یہ واقعہ نہیں کہ جب سید الشہداء حضرت حمزہ رضؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تو مشرکین عرب نے آپ کی نعش کی بے حرمتی کی، جب مسلمانوں نے بھی مشرکین کے مقتولوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انسانیت سوز ارادہ سے مسلمانوں کو باز رکھا، کیونکہ جہاد کا یہ مقصد نہیں کہ جنگجو اشخاص سے ذاتی عداوت رکھی جائے، یہ جہاد اسلام میں محض اس لئے مشروع ہوا ہے کہ ان گھنگھور گھٹاؤں کو زائل کیا جائے جس کی وجہ سے مخالفین کی آنکھیں الٰہی نورانی شعاعوں کو دیکھنے سے معذور ہیں، ان لوگوں سے جنگ اسی لئے کرنی پڑی کہ یہ عداوت حق کا مظہر تھے۔

اس کی بین دلیل یہ ہے کہ وحشی حبشی جس نے حضرت حمزہؓ کو قتل کیا تھا جب اسلام سے مشرف ہوا تو نبی کریمؐ نے اس سے کوئی باز پرس نہ کی، بلکہ وہ آپ کے صحابۂ کرامؓ کی صف میں داخل ہوگیا۔

ہند نے حضرت حمزہ کی نعش کے ساتھ کیسا انسانیت سوز سلوک کیا، حتی کہ اس نے آپ کا کلیجہ نکال کر چبایا اور اپنی عداوت اور اپنے بغض و کینہ کا ثبوت دیا۔ فتح مکہ کے دن آنحضور صلعم نے اس کا خون بہانے کا حکم دے دیا جب عرصۂ حیات اس پر تنگ ہوگیا تو وہ بھیس بدل کر آپ کے پاس آئی اور مسلمان ہوگئی، اسلام لا چکی تو اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا، آپ اس کو پہچان گئے لیکن آپ نے اس کو درگذر کر دیا اور کوئی باز پرس اس سے نہ کی۔

ان تمام آثار و شواہد سے یہ ظاہر ہوگیا کہ اسلام انسانوں سے کوئی مواخذہ نہیں کرتا تا وقتیکہ ان پر حق و صداقت واضح طور پر روشن نہ ہو جائے، یہاں سے یہ امر بھی صاف ہوگیا کہ اسلامی مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی جائے، حتی الامکان ان کی مصیبت کو دور کیا جائے، اس کے ساتھ حق کو قبول کرنے اور اسلامی اصول و نظریات کو تسلیم کرنے کے لئے ان کو حریت فکر و ضمیر عطا کی جائے، لیکن تبلیغ و

و ہدایت کے کام کو کسی طرح چھوڑا نہیں جا سکتا، کیوں کہ ناآشنائے حق مرد بیمار کی طرح ہے، اس کا علاج تبلیغ دین اور ارشاد ہے، اس کی طرف سے بے رخی برتنا اس کے لئے موجب ضرر و ہلاکت ہے، علماء کا فریضہ ہے کہ جہلاء کو تعلیم دینے سے کسی طرح پیچھے نہ ہٹیں۔

دسواں باب

مکارمِ اخلاق سے آراستگی

انسان[1] کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جلی بھی، اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبعیات و حیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں، اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات و وسائل پر ان مادی ذرائع پر اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے، یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے

---

[1] اقتباس از روداد جماعت اسلامی تقریر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

قوانین طبعی کے تحت، آلات و وسائل کے ذریعہ سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے، اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں، دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے کی، یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔

یہ اخلاقی وجود طبعیات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے، یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے، اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں اور اس پر فرماں روائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی و ناکامی اور اس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت سے، اُسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے لیکن اگر غائر نظر سے

دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی کی، اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لئے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالم طبعی میں رہتا ہے یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی، مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اُٹھاتی ہے جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے، ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے، آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے، بلکہ اس کی وجہ امتیازی خصوصیت جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں، خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے وہ اس کا اخلاقی اختیار ہے اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے، پس جب اصل جوہر انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرماں روا ہیں،

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں

منقسم نظر آتے ہیں. ایک بنیادی انسانی اخلاقیات، دوسرے اسلامی اخلاقیات،

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے، اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لئے بہرحال شرط لازم ہیں، خواہ وہ صحیح مقصد کے لئے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لئے ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں، طہارت نفس اور نیتِ خیر اور عمل صالح سے آراستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لئے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کے لئے، قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو، اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اور اس کی سعی کا مقصد اچھا ہو یا برا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہو گا جو دنیا میں کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہوں گے، مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مفسد، غرض جو بھی ہو وہ کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو عزم اور حوصلہ ہو، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی و جفاکشی ہو

اپنے مقصد کا شوق اور اس کے لئے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ہو، باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ ہو، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو موہنے، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔ پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جوہر آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً خود داری، فیاضی، رحم دلی، ہمدردی، انصاف وسعت قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاس عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت، اور ذہن و نفس کا انضباط، یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھئے کہ اس کے پاس وہ سرمایۂ انسانیت موجود ہے، جس سے ایک طاقتور جماعت وجود میں آسکتی ہے، لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہو کہ بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کہ کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان مال اور اولاد سے بھی

عزیز تر رکھیں، ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انھیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کے لئے ناگزیر ہے، وہ صحیح و غلط رہنما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں، ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں اور خود قوم یا جماعت اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو، نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لئے نقصان دہ ہو۔"

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں "بنیادی انسانی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں، کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں اور انسان کسی مقصد کے لئے بھی دنیا میں کامیاب سعی نہیں کر سکتا، جب تک کہ ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو، ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے، جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی واستحکام رکھتا ہے اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لئے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لئے، آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہو تب بھی تو آپ کے لئے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو

نہ کہ سڑی ہوئی پھس پھسی لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو، یہی وہ بات ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام "تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں" یعنی زمانۂ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہر قابل رکھتے تھے وہی زمانۂ اسلام میں مردانِ کار ثابت ہوئے فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آکر انھیں صحیح راہ پر لگا دیا، مگر بہرحال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لئے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کیرکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی، اگر خدا نخواستہ آپ کو بودے، کم ہمت، ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو لیجئے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں، یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی

تصحیح اور تکمیل ہے:

اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں، اپنی ابتدائی صورت میں یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں، جو خیر بھی ہو سکتی ہے اور شر بھی، جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو کے ہاتھ میں جا کر آلۂ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر وسیلۂ خیر بھی، اسی طرح ان اخلاقیات کی طاقت بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو، یہ اس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے، اسلام کی دعوتِ توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں اور دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو، والیک نسعی ونحفد۔ اور اس کا پورا دائرۂ فکر و عمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے ایاک نعبد ولک نصلی ونسجد۔ اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے، بجائے اس کے کہ نفس یا وجدان یا قوم یا ملک کی

سر بلندی ہر ممکن طریقے سے صرف ہو، خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں سے صرف ہونے لگتی ہے یہی چیز اس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے اٹھا کر ایجابًا ایک بھلائی اور دنیا کے لئے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے مثال کے طور پر صبر کو لیجئے، بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو صبر دنیوی اغراض کے لئے ہو اور جسے شرک یا مادہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو، اس کے برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی بس ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اٹھتا ہے لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لئے نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے لئے ہو وہ تحمل و برداشت اور پامردی کا ایک اتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے، اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی تو گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقع سامنے آیا تو وہ نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلہ میں بھی نہ ٹھہر سکا، لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے

صرف خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ تمام ایسے لالچوں، خطروں، اندیشوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں بھی ٹھہراؤ کی ایک ایسی زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے والے ہوں، درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرزِ خیال اور صحیح طرزِ عمل پر قائم رہو، خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے اور کبھی فکر و عمل کی برائی نہ اختیار کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوش نما سبز باغ تمھارے سامنے لہلہا رہا ہو، یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور لازماً ان شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں، اسی خیال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاق فاضلہ کی ایک نہایت شاندار

بالائی منزل تعمیر کرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے، وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے انانیت سے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے، اس میں خدا ترسی، تقویٰ و پرہیزگاری اور حق پرستی پیدا کرتا ہے، اس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس ابھارتا ہے، اس کو ضبط نفس کا خوگر بناتا ہے، اسے تمام مخلوقات کے لئے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض خیر خواہ، بے لوث منصف، اور ہر حال میں صادق و راستباز بنا دیتا ہے اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیث رسول کے الفاظ میں وہ اُسے مفتاحٌ للخیر مغلاق للشرَ یعنی بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے یعنی وہ ایجاباً یہ مشن اس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے، اس سیرت و اخلاق میں فطرتاً وہ حسن ہے، وہ کشش ہے، وہ بلا کی قوت تسخیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اس مشن کے لئے سعی کرے، جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے۔ تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

گیارھواں باب

انسانی طبقات و مدارج کا اقرار

اسلام نے نسلی، وطنی اور قومی برتری و تفوق کو ایک دم کالعدم قرار دیا ہے، لیکن وہ اس سے انکار نہیں کرتا ہے کہ انسانی فضائل و کمالات کے چند حدود و مدارج ہیں، علم و جہل، روشنی اور تاریکی، قوت و ضعف اور شرافت و ذلت کے درمیان حد فاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولو شاء اللہ لجعل الناس اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو
اُمۃ واحدۃ۔ ایک ہی اُمت بنا دیتا۔

لیکن اس نے انسانوں کے طبقات و مدارج بنائے ہیں اور ہر ایک کے لئے ایک خاص مرتبہ اور ایک خاص مقام ہے اگرچہ تمام انسان خدائی قوانین و احکام اور اسلامی اوامر و نواہی میں یکساں ہیں، معاملات اور حدود میں عالم و جاہل برابر ہیں، ہر ایک کا ایک حق ہے جس سے اس کو محروم نہیں

کیا جا سکتا، ایک حد ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرسکتا، ایک فریضہ ہے جس کو وہ چھوڑ نہیں سکتا، ان تمام کے مابین فضیلت وکرامت، تفوق و برتری کا معیار محض تقویٰ پر ہے۔ علم اور جہل کبھی ایک نہیں ہو سکتے اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا۔

ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔	کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

بنی اسرائیل سے مخاطب ہوکر فرمایا۔

یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العلمین	اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے میں نے تم کو نوازا ہے اور یقیناً میں نے تمھیں تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی۔

عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے باب میں فرمایا۔

وللرجال علیھن درجۃ واللہ عزیز حکیم	اور عورتوں پر مردوں کا درجہ ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔

تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض منھم من کلم اللہ۔	یہ رسول ہیں جن کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔

اللہ نے بعض کو انسانوں میں سے اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمایا۔

ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراھیم وآل عمران علی العالمین

بے شک اللہ تعالیٰ نے آدمؑ نوحؑ، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر برگزیدہ کیا

حضرت مریم علیہا السلام کی برگزیدگی کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

یامریم ان اللہ اصطفاك وطھرك واصطفاك علی نساء العالمین

اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاکیزہ بنایا اور تجھے تمام جہانوں کی عورتوں پر پسند کیا۔

آنحضور اکرم صلی اللہ کی ازواج مطہرات اُمت کی دوسری عورتیں کی طرح سے نہیں

یانساء النبی لستن کاحد من النساء

اے نبی کی عورتو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔

امت محمدیہ کو عالم کی تمام اقوام پر ترجیح اور فوقیت عطا کی۔

کنتم خیر امۃ اُخرجت للناس

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے۔

اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والا اور اللہ کو ناراض رکھنے والا یہ دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔

أفمن اتبع رضوان الله كمن باء بسخط من الله ومأواه جهنم وبئس المصير۔

کیا اللہ کی خوشنودی طلب کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے جو اللہ کے غضب سے پھر گیا جس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے

پاک اور بری چیز میں یقینا زمین آسمان کا فرق ہے۔

لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرة الخبیث

برا اور اچھا کبھی برابر نہیں ہوتا اگرچہ تجھے برے کی بہتات تعجب میں ڈالے۔

اللہ تعالی نے ہر طبقہ کے رجحانات اور آرزوئیں مخصوص کر رکھی ہیں، کسی کو ایک دوسرے کی سرحد میں قدم رکھنا سزاوار نہیں۔

ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضکم علی بعض للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن

اللہ نے تمہارے ایک دوسرے پر جو فضل و کرم کیا ہے تم اس کی تمنا نہ کرو مردوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے۔

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یقیناً اُن لوگوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔

فضل الله المجاهدین

اللہ نے مجاہدین کو ان کے مالوں

بامو الھم و انفسھم علی القاعدین درجۃ — اور نفسوں میں بیٹھے رہنے والوں پر ایک درجہ بڑھایا ہے

اندھا اور نابینا دونوں برابر نہیں ہیں۔

قل ھل یستوی الاعمی والبصیر افلا تتفکرون — کہہ دو کیا اندھا اور دیکھنے والا یہ دونوں برابر ہیں؟ کیا تم فکر و بصیرت سے کام نہیں لیتے!

خلافت ارضی کا سہرا بعض انسانوں کے سر باندھا گیا ہے، اور انسانوں میں بعض کو بعض پر ترجیح دی گئی ہے۔

وھو الذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فیما اتاکم — وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے اور تمہارے ایک دوسرے کے درجات بلند کئے ہیں تاکہ وہ اپنی عطا کردہ چیزوں میں تمہیں آزمائے۔

مسلمانوں کو کافروں پر بہرحال فضیلت حاصل ہے۔

مثل الفریقین کالاعمی الآیۃ — دونوں گروہ (مومن و کافر) کی مثال اندھے اور بینا شخص کی طرح ہے۔

غرض کہ قرآن مجید اس قسم کے بے شمار شواہد و آثار سے معمور ہے، احادیث و سنن بھی ان ہی حقائق و واقعات کی

تشریح سے لبریز ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

انزلوا الناس منازلھم — تم لوگوں کو ان کے مرتبہ و مقام تک پہنچاؤ۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ۔ — جب تمہارے پاس قوم کا معزز شخص آئے تو تم اس کی تعظیم کرو۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

الناس معادن خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا — لوگ کانوں کی مثال ہیں، تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں جب کہ وہ سمجھ سے کام لیں۔

دوسری حدیث میں آیا ہے۔

ارحموا عزیز قوم ذل وغنی قوم افتقر۔ — قوم کا معزز شخص ذلیل ہو گیا ہے تو تم اس پر رحم کھاؤ اور قوم کا کوئی مالدار فقیر ہو گیا ہے تو اس پر ترس کھاؤ۔

اسلام نے کمسنوں اور سن رسیدہ اشخاص کی عزت و توقیر کی ایک حد مقرر کر دی یہ کس قدر زرین اصول ہے۔

من لم يرحم صغيرنا ويعرف حق كبيرنا فليس منا

جو شخص چھوٹوں پر رحم نہ کھائے اور بڑوں کے حق کو نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں۔

علماء کی شان و توقیر کو اس طرح بڑھایا گیا۔

وقروا علماء امتی فانهم نجوم الارض

تم میری اُمت کے عالموں کی قدر و عزت کرو کیوں کہ وہ زمین کے ستارے ہیں۔

صحابہ کی فضیلت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔

لا تسبوا اصحابی فلو انفق احدکم مثل اُحد ذهبا ما بلغ مد احدهم ولا نصيفه من سب اصحابی فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين

میرے اصحاب کو تم برا بھلا نہ کہو کیوں کہ تم میں سے کوئی اُحد برابر سونا بھی خرچ کر دے تب بھی ان میں سے کسی ایک کے مرتبہ تک اور نہ نصف مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو شخص میرے صحابہ کو برا کہے گا تو اُس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت اور پھٹکار ہوگی

ایک اور حدیث میں آیا ہے۔

ان من اشراط الساعة ان يلتمس العلم عند الاصاغر

بے شک قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ علم کو کمینوں کے پاس سے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے

افراد انسانی کی تعظیم و توقیر کے بارے میں نہ صرف احادیث وسنن ہی مروی ہیں بلکہ خود آنحضرت کے آثار و کردار بھی اس باب میں بے شمار ہیں۔ جس کی بیّن دلیل یہ ہے کہ آپ نے وفد نجران کے لئے (جو نصاریٰ کا وفد تھا) آپ سے ملاقات کے وقت اپنی چادر بچھائی، عامر بن طفیل کو جب کہ وہ کافر تھا اعزاز و اکرام بخشا، کیوں کہ آپ کی خدمت میں وفد کی شکل میں آنے والے تمام کے تمام اپنی قوم کے معزز اشخاص تھے، اور عامر بھی اپنی قوم کا سردار تھا۔

ہمارے گزشتہ بیانات اور تشریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تمام انسان قانون الٰہی کے آگے برابر ہیں، ان میں فضیلت و برتری کا انحصار تقویٰ پر ہے، لیکن مخصوص صفات کی حیثیت سے ان کے مختلف درجے اور مقام ہو سکتے ہیں، اس بناء پر ان کی دو بڑی قسمیں ہیں

(۱) مسلم ——— (۲) غیر مسلم

مسلمانوں کے درمیان اولاً اُخوت اسلامی کا مضبوط رشتہ ہے، اس کے بعد ماں باپ بھائی اور بہنوں اور رشتہ داروں کے تعلقات محکم و استوار ہیں، اس لحاظ سے وہ ایک خاندان اور ایک قبیلہ میں منقسم ہو جاتے ہیں، ان گوناگوں رشتوں کے باوجود ان کے درمیان اتحاد اسلامی کا رابطہ اور اخوت اسلامیہ کا محکم رشتہ ہے، مرتبہ و مقام میں اختلافات کے باوصف یہ تمام کے تمام قوانین الٰہیہ اور احکام اسلامیہ کے سامنے برابر

ہیں اس اختلاف و تفاوت کی وجہ سے کسی سے فریضۂ دینی اور کوئی قانونِ الٰہی ساقط نہیں ہوتا، اس حقیقت پر آنحضرت صلعم کا یہ قول بین شہادت ہے

لَو اَنَّ فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطع محمد یدھا — اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتیں تو محمد صلعم ان کا ہاتھ کاٹ دے۔

دوسری قسم جو غیر مسلموں سے عبارت ہے پانچ قسموں میں منقسم ہے۔

(۱) اھل ذمہ: یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کے تابع ہیں اور اسلامی دین پر نہیں چلتے مسلمانوں کے لئے جو حقوق و آئین ہیں ان ذمیوں کے لئے بھی وہی ہوں گے، ان کے مال آبرو اور ان کی جان پر کسی قسم کا ظلم نہیں روا رکھا جائے گا، اگر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کو وہی سزا ملے گی جو ایک مسلمان پر تعدی کرنے کی صورت میں ملتی ہے،

(۲) اہل عہد و پیمان: یہ ایسا طبقہ ہے جس کے اور خلافت اسلامیہ کے مابین مضبوط عہد و پیمان کیا جا چکا ہے، عہد نامہ کے مدونہ شرائط و قوانین کے مطابق اس طبقہ کو حقوق دئے جائیں گے، اس کو اسلامی قوانین و احکام اور اس کے واجبات و حدود کا احترام اور ان کی پابندی کرنی پڑے گی، یہ شرائط نقض عہد تک باقی رہیں گے، اگر جان بوجھ کر عہد شکنی ہوئی تو عہد نامہ منسوخ اور اس کے احکام خود بخود ہٹ جائیں گے، صرف ان کی جان، آبرو اور

ان کا مال محفوظ رہے گا بشرطیکہ وہ کسی اور تک کوئی ظلم و تعدی نہ کریں، اس وقت اُن پر وہی تعزیرات عائد کی جائیں گی جو ایک مسلمان پر کی جاتی ہیں جب کہ وہ اس قسم کے فعل کا ارتکاب کرے؛

(۳) صلح جُو :۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے درمیان اور مسلمانوں کی جماعت کے مابین صلح نامہ طے ہوا ہو، صلحنامہ کے شروط کے مطابق عمل درآمد کیا جائے گا۔

(۴) پناہ گزیں :۔ یہ ایسا گروہ ہے جس سے خلافت اسلامیہ کی طرف سے نہ کوئی عہد و پیمان باندھا گیا ہے، نہ صلح ہے، نہ جنگ اور نہ کسی قسم کا ذمہ لیا گیا ہے، اگر اس قسم کے طبقہ کا کوئی فرد ممالک اسلامیہ میں کسی ضرورت کے لئے آئے تو اس کو پناہ گزیں کے حقوق دئے جائیں گے، اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے گی، اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے گی، اس پر بھی سوسائٹی کا احترام کرنا واجب قرار دیا جائے گا۔ یہ کسی کی مضرت کے درپے نہ ہوگا جب تک یہ مسلمانوں کے درمیان رہے مسلمانوں کے احکام کا پابند و مطیع ہوگا؛

(۵) جنگجو :۔ اس گروہ کے احکام و قوانین جنگ اور جنگی اسباب کے گوناگوں ہونے پر بدلتے رہیں گے، جنگ ختم ہونے تک یہ گروہ اقتضائے حالات کے تابع رہے گا اس کے بعد وہ مذکورہ بالا طبقات چہارگانہ میں سے کسی ایک

طبقہ میں شمار کیا جائے گا، اگر وہ قیدی بن کر آیا ہے تو حسب شروط و قوانین مقررہ قید و بند کا حکم اس پر نافذ کیا جائے گا

ان تمام بیانات سے اسلام کا مقصد تمام طبقات عالم کے درمیان امن و سلامتی کو عام کرنا ہے، تمام قوموں پر اسلام یہ امر واجب قرار دیتا ہے کہ وہ انسانی سوسائٹی کی بھلائی کا خیال رکھیں، اور برائیوں کو دور کریں، اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے دنیا سے ظلم و طغیان اور شر و فساد کو روکنے اور اس راہ میں مشکلات و خطرات کی مدافعت کرنے کے لئے جہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون	جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں تم ہرگز ان کے متعلق یہ خیال نہ کرو کہ وہ مرگئے بلکہ وہ زندہ ہیں اللہ کے پاس سے رزق پاتے ہیں،

اس جہاد کی ترغیب مسلمانوں کو دو امور کی وجہ سے دی گئی ہے۔

(۱)، جمعیۃ اسلامیہ کی طرف سے دفاع کے لئے، جو دنیا میں کافرانہ نظام کی بیخ کنی کرنے اور طاغوتی قوتوں کا سرنیچا کرنے اور دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام اور دین اسلامی کو عام کرنے کے لئے تبلیغ و دعوت کے اہم فریضہ کو لے کر اٹھتی ہے،

(۲) ان تمام موانعات، مشکلات اور خطرات کی روک تھام کرنے کے لئے جو اس دعوت و تبلیغ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

اسلام نے جنگ کا حکم اُسی وقت دیا ہے جب کہ اُس نے اپنی دعوت و تبلیغ کے پھیلانے کے لئے تمام اسباب وحیل استعمال کر لئے لیکن مشکلات و موانع حسب دستور بحال رہے ایسی صورت میں اس کو جنگ کرنے کے سوائے کوئی چارۂ کار اور راہ گزیر نظر نہیں آئی، اس کے ساتھ ساتھ مصالحت مسلمانوں کا شیوہ اور طرۂ امتیاز ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا

ادفع بالتی ھی احسن — باحسن وجوہ مدافعت کیا کرو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی دو کاموں میں سے کسی ایک کے کرنے کا اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے سہل اور آسان کام انتخاب فرمایا بشرطیکہ وہ موجب گناہ نہ ہو، اگر اُس میں گناہ کا شائبہ پایا جاتا تو آپ اس سے کوسوں دور ہی رہتے" آنحضرت صلعم ارشاد فرماتے ہیں۔

یسّروا ولا تعسروا۔ — آسان پسند بنو مشکل پسند نہ بنو۔

اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا — اگر وہ صلح کے لئے اپنا بازو جھکا دیں تو تم بھی صلح کے لئے

اپنا بازو جھکا دو۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولا تلقوا بایدیکم	تم اپنے آپ کو (جان بوجھ کر)
الی التھلکہ	ہلاکت میں نہ ڈالو۔



بارھواں باب

اقوام عالم کی اِصلاح

اسلام نے عالم انسانی کی اصلاح کے لئے حسب ذیل چھ چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے، جب تک یہ چھ امور کسی سوسائٹی میں مجتمع نہ ہوں اس کی اصلاح پائے تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔

۱۔ دین صحیح۔

دین کیا ہے، انسان کے لئے دین کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ اس بحث کو تفصیل سے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں، یہاں صرف اس قدر ذکر کر دینا مناسب ہے کہ دین وہ نظام اطاعت ہے۔ جو کائنات ارضی و سماوی کو خالق حقیقی کے رشتہ سے جوڑ دیتا ہے کائنات حیوانی و جمادی تو بلا شعور و اختیار اللہ کے مطیع و منقاد ہے۔ لیکن عالم انسانی کی اطاعت گزاری اور اس کا تعین اختیار وارادہ سے ہوا کرتا ہے، دین انسانی نفوس میں خواہشات، جذبات اور مختلف ہیجانات کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہے، ظاہرو باطن،

خلوت وجلوت میں انسانی اعمال کا محتسب ونگرانکار رہے، اسلام میں دین کا تصور ایک انقلابی اور ہمہ جہتی ہے، جو افراد کے اندر طبائع کا تزکیہ کرتا اور ان کو ایک اجتماعی صلاحیت کا مالک بناتا ہے، دین نام ہے انسان کی خودی کو اُجاگر کرنے، تمام عالم کائنات پر چھاجانے، زمین وآسمان کی چیزوں کو مسخر کرنے، پھر خالق ارض وسماوات کے حلقۂ اطاعت میں اپنے آپ کو پیش کردینے کا،

(۲) حکومت راشدہ۔

حکومت کا اسلامی تصور یہ ہے کہ کائنات ارضی وسماوی خدا کی بادشاہت ہے، زمین کے کسی حصہ کا انسان کو اپنی مِلک قرار دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، اقتدار اعلیٰ محض اللہ کے لئے ہے، انسان صرف خدائی احکام اور الٰہی قوانین کو دنیا میں پھیلانے والا اور ان پر عمل درآمد کرنے والا ہے، اسلامی احکام کی روشنی میں زمین کا بادشاہ، حاکم، سلطان انسان نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی انسان کو حاکمیت، بادشاہت اور سلطنت کا دعویٰ دار ہونے کا حق پہنچتا ہے، دنیا میں اسلامی تعلیمات کو رائج کرنے، حکومت الٰہیہ کے قوانین کو نافذ کرنے اور اسلامی احکام وآئین کو چلانے کے لئے اسلام نے امام اور امامت کبریٰ کا تخیل پیش کیا ہے، یہی امام اسلامی تبلیغ ودعوت کی راہ میں حائل ہونے والی تمام طاغوتی قوتوں اور باطل طاقتوں کا مقابلہ کرتا ہے، دین کی حفاظت امن وسلامتی کو عام کرنا، شر وفساد کو روکنا امام کا کام ہے، اس کی طرف

آنحضرت صلعم نے اشارہ فرمایا

ان للہ حراسًا فی السماء وحراسًا فی الارض فحراسهُ فی السماء الملائکة وحراسه فی الارض الذین یقبضون ارزاقهم ویذبون عن الناس

آسمان اور زمین میں اللہ کی طرف سے پاس بان اور محافظ مقرر کئے گئے ہیں، آسمان میں فرشتے نگران کار ہیں اور زمین میں اللہ کی طرف سے مقرر کردہ محافظ وہ ہیں جن کو ان کی روزی ملتی ہے اور وہ لوگوں کے شر و فساد کو دُور کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں امامت کبریٰ کا مستحق اور خلافت اسلامیہ کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جس میں اس بار امانت کو اٹھانے کی استطاعت ہو، جو حکومت الہیہ کے مفہوم سے واقف، احکام شریعت کا پابند، اسلامی اصول و قوانین کو نافذ کرنے اور خود ان پر عمل پیرا ہونے کی قدرت رکھتا ہو، جب یہ تمام صفات و خصوصیات اُس میں پائی جائیں گی تو وہ امت کا امام اور پیشوا ہوگا، رعایا کا فرض ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ محبت و اخلاص اور اس پر اعتماد رکھے، اس مفہوم کو نبی کریم صلعم نے یوں فرمایا ہے؛

خیر ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وشر ائمتکم الذ...

تمھارے بہترین امام اور پیشوا وہ ہیں جن سے تم محبت رکھتے ہو اور وہ تمھیں چاہتے ہیں،

تبغضونهم و تبغضونكم
و تلعنونهم و يلعنونكم

تمھارے برے ائمہ اور لیڈر ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور وہ تم سے نفرت رکھتے ہیں وہ تمھیں لعن طعن کرتے ہیں اور تم ان پر لعنت ملامت بھیجتے ہو"

حضرت عمر بن خطابؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو لکھا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو وہ اس کو اپنی مخلوق میں ہر دلعزیز بنا دیتا ہے تم اپنا مقام و مرتبہ اللہ کے پاس لوگوں کی قدر و منزلت سے پہچانو" یعنی تم اس پر نظر رکھو کہ لوگوں کے پاس تمھارا کردار، تمھاری سیرت اور تمھارے اخلاق کیسے ہیں، تمھیں وہ کس نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے پاس تمھاری قدر و منزلت کیسی ہے، اس سے پتہ چل جائے گا کہ اللہ کے پاس بھی تمھاری وہی قدر و وقعت ہے جو لوگوں کے نزدیک ہو رہی ہے"

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا خوف جس شخص کے دل پر چھایا ہوا ہو گا تو وہ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھے گا، اللہ کی اطاعت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شخص مخلوق میں بھی الٰہی قانون کا پاس رکھے گا، اس طرح اُسے بالواسطہ خدائے تعالیٰ محبوب بنائے گا، یہی وجہ ہے کہ مخلوق کی محبت اس کے خوف خدا اور خیر خواہی خلق پر دلیل ہے، مخلوق کا بغض و کینہ اس کے خباثت نفس اور عدم اعتماد پر بیّن شہادت ہے۔

۳۔ عدلِ شامل:۔

عدالت قانونِ الٰہی کا ایک اہم عنصری جز ہے، عدل کے بغیر زندگی کا کوئی گوشہ تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا، آسمان وزمین کی چیزوں میں ہم آہنگی اور ہمواری کا راز عدل ہی میں مضمر ہے، انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر، جماعتی تنظیم اور اجتماعی تشکیل یہ تمام ایک عادلانہ نظام کے رہین منت ہیں، قرآن مجید نے جا بجا اقامت عدل پر زور دیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔ — بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

قومی دشمنی کے مقابلہ میں ضرر رساں اور کوئی چیز نہیں اسی لئے اس کے پیدا شدہ اثرات سے اس طرح منع کیا گیا

ولا یجرمنکم شنأن قوم علی الا تعدلو۔ اعدلوا ھو اقرب للتقوی — کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل کرنا چھوڑ دو تم عدل کیا کرو کیوں کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے،

ایک اور جگہ عدل کا وسیع مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے

یا ایھا الذین اٰمنو کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم — ایمان والو! تم عدل قائم کرنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے ہو جاؤ خواہ اپنے نفسوں پر

اولو الدین والاقربین — ہو یا ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے

عدل کے صحیح طور پر رائج ہو جانے سے بہت سے فائدے رونما ہوتے ہیں، محبت واتحاد، اطاعت کیشی اور خلوص و یگانگت کا دامن اسی سے وابستہ ہے، تمدنی اور عمرانی ترقی کا دارومدار اسی پر ہے، ظلم وجور سے بڑھ کر تباہی و بربادی برپا کرنے والی اور مخلوق کے قلب و دماغ کو منتشر کرنے والی اور کوئی شے نہیں، کیوں کہ ظلم کی کوئی حد ہے اور نہ انتہا، اس کا ہر شرارہ فتنہ و فساد کا ایک شعلۂ جوالہ ہوتا ہے، آنحضرت صلعم کا ارشاد ظلم کی ہلاکت آفرینی پر کس قدر صادق ہے۔

ثلاث منجیات وثلاث مھلکات فاما المنجیات فالعدل فی الغضب والرضاء وخشیۃ اللہ فی السر والعلانیۃ والقصد فی الغنی والفقر واما المھلکات فشح مطاع وھوی متبع واعجاب المرء بنفسہ	تین چیزیں نجات دہندہ ہیں اور تین ہلاکت آفریں نجات دہندہ یہ ہیں (۱) غضب و رضا میں عدل (۲) خلوت و جلوت میں خوف خدا (۳) تونگری و غریبی کی حالت میں میانہ روی ہلاکت آفریں یہ ہیں۔ (۱) بخل جس کی اطاعت کی جائے (۲) خواہشات جن کی پیروی کی جائے (۳) انسان کی خود پسندی

عدل کی قسمیں:-

عدل کی بے شمار قسمیں ہیں۔

(الف) انسان اپنی ذات پر عدل کرے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو نیکیوں پر آمادہ کرے برائیوں سے روکے، کسی کام کو اختیار کرنا چاہے تو کمی وبیشی کو دیکھ کر معتدل کام اختیار کرے کیوں کہ کسی کام میں حد سے تجاوز کر جانا جور ہے اور اس میں کمی کرنا ظلم، جو شخص اپنے اوپر ظلم کرتا ہے وہ دوسروں کے لئے اور زیادہ ظلم کر سکتا ہے۔

(ب) انسان دوسروں پر عدل کرے، مثلاً بادشاہ اپنی رعایا پر اور سردار اپنے ماتحتوں پر انصاف کرے، ان کے مابین عدل چار امور سے متعلق ہے، سہل کاموں کا اتباع، مشکلات کا ازالہ، سخت گیری اور قوت و طاقت کے ذریعہ اثر جانے سے پرہیز، سیرت و کردار میں حق کی روش اختیار کرنا، جن ائمہ اور پیشواؤں میں یہ چار چیزیں جمع نہ ہوں تو ان سے فتنہ فساد اور اختلاف بڑھ جائے گا۔

(ج) انسان اپنے بالا دست اشخاص کے ساتھ عدل کرے، مثلاً محکوم اپنے حاکموں اور ماتحت اپنے افسروں کے ساتھ انصاف کو ملحوظ رکھیں۔

(د) انسان اپنے دوستوں اور ہمعصروں کے ساتھ عدل

کرے، اس کی علامت طنز آمیز گفتگو کو ترک کرنا، اذیت رسانی سے محفوظ رہنا ہے۔

آنحضرت صلعم نے کتنا بہترین قول فرمایا ہے۔

"کیا میں تمھیں بدترین شخص کی خبر نہ دوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا بے شک یا رسول اللہ! فرمایا جو تنہا اترے اپنی امداد سے روکے، اور اپنے غلام کو تازیانے لگائے، پھر آپ نے فرمایا کیا میں تمھیں اس سے بھی بدترین شخص کی خبر نہ دوں؟ صحابہ نے عرض کیا بے شک یا رسول اللہ! فرمایا جس سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھی جائے اور اس کی برائی سے لوگ بے خوف نہ رہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا میں تمھیں اس سے بھی بدترین آدمی سے آگاہ نہ کروں؟ صحابہ نے عرض کیا بے شک یا رسول اللہ فرمایا جو لوگوں سے بغض رکھے اور لوگ اس سے نفرت کریں"۔

۴۔ امن عام۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں اطمینان اور آسائش کی زندگی بسر کرنے کے لئے امن کی بے حد ضرورت ہے، کمزوروں کو چین اور ناداروں کو سکھ اور شانتی کا ذریعہ امن عام ہی ہے، علوم و فنون کی ترقی اور ذہنی نشو و نما کا دار و مدار اسی پر ہے، اسلام نے جنگ پر امن

اور صلح کو مقدم رکھا ہے۔

۵۔ اسباب سہولت کی فراوانی

کسی ملک یا قوم کی خوش حالی کا انحصار اس کے اسباب سہولت کی فراوانی پر ہے جس کے افراد کو اپنی جولانی طبع دکھانے کا خوب موقعہ دست یاب ہوتا ہے، اگر نفوس کی حوصلہ افزائی کا سامان فراہم کیا جائے تو ان کی ہمتیں اُجاگر ہوتی ہیں قوم کا غریب اور مال دار طبقہ یکساں اشتراک عمل کرسکتا ہے، حسد، بغض اور فتنہ و فساد کا قلع قمع ہوجاتا ہے افلاس اور غربت کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، غمخواری اور ہمدردی کے جذبات خوب اُبھرتے ہیں، سخاوت اور امانت نشو ونما پاتی ہے اسلام کے نظام حیات میں اس قسم کی بہت لچک پائی جاتی ہے

حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھا کہ تم شریف ذی عزت یا مالدار کو ہی قاضی بناؤ، کیوں کہ شریف آدمی انجام سے ڈرتا ہے اور مالدار اوروں کے مال میں حرص نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ قوم کے مصلح کو اپنے اصلاحی پروگرام میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی تاوقتیکہ وہ قوم کی خوش حالی کے اسباب کو فراواں کرنے کی طرف توجہ نہ کرے اور افلاس و غربت کے ذرائع کا انسداد نہ کرے، کیونکہ قوم کی خوش حالی اس کی اصلاح اور ترقی کی ذمہ دار ہے،

۶۔ مقاصد آفرینی:۔

انسان کی عمر بہت کم ہے، اس کے باوجود امید و آرزو کی ایک چنگاری اس کے مقاصد و عزائم کی تکمیل پر اس کو آمادہ کرنے کے لئے کافی ہے، وہ مستقبل حیات کی تعمیر کے لئے اپنی اختراعی قوت کو ابھارنے لگتا ہے، اگر آنے والی نسل اپنے اسلاف کی بیش بہا ایجادات و اختراعات اور علوم و فنون سے استفادہ نہ کرتی تو ہر زمانے میں نئے سرے سے ہر فرد عمرانی، معاشی، اور تمدنی حوائج و ضروریات کو پیدا کرنے کا محتاج ہوتا، اس میں جو مشکلات اور خطرات ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں،

وسیع امید و مقصد آفرینی انسانی اصلاح اور تمدنی وسائل فراہم کرنے پر آمادہ کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلاف کا علمی ذخیرہ، تمدن کا بیش بہا سرمایہ اور ان کی ذہنی و فکری معلومات نسلاً بعد نسلٍ ہر دور میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اسی طرح دنیا کا نظام برقرار ہے، اگر امیدوں آرزوؤں میں کمی واقع ہو جائے تو زمانے کی ضروریات کی رفتار ہی رک جائے اور تباہی و بربادی میں تیزی واقع ہو جائے اسی طرف آنحضرت صلعم نے اشارہ فرمایا۔

اَلْاَمَلُ رحمة من اللّٰه لِاُمَّتِی — امید و آرزو میری امت کیلئے اللہ کی رحمت ہے

یہ وہ چھ امور ہیں جن سے قوموں کی حالت درست ہوتی ہے اور ان کی زندگی ایک نظام میں مربوط ہوتی ہے اگر ان میں سے کسی ایک میں خلل پیدا ہو جائے تو فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے ۔

خلاصہ

ہم نے ایک حد تک اسلام کے نظام حیات کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے اس کتاب کو ختم کرنے سے پیشتر ہم پورے اسلامی نظام پر ایک محیطی نظر ڈالتے ہیں۔ اور پچھلے بیانات کا خلاصہ چند الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

اسلام نے اولاً افراد کی ظاہری و باطنی طبائع کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے جس کے لئے عبادات اور عقائد کا نظام پیش کیا، پھر جماعت کی تنظیم اور تشکیل کی اسکیم پیش کی اور افراد کے اندر جماعت انسانی کا رکن بننے کی استعداد پیدا کی۔ اس نے نہ صرف عبادات پر زور دیا بلکہ زندگی کی دیگر ضروریات پر بھی توجہ دلائی ہے مثلاً زراعت کا حکم اس طرح دیا۔

اُطلبوا الرّزق من خبایا الارض — زمین کی گہرائیوں سے تم رزق تلاش کرو۔

اس میں ضمنی طور پر اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ زمین کے معاون اور اس کے خزانوں کو جو اس کی گہرائیوں میں ہیں تلاش کیا جائے، اسی طرح صنعت و حرفت کا بھی اسلام نے حکم دیا ہے، علوم و فنون کی تحصیل کی ترغیب دی ہے اخوت و مساوات، علوم کی نشر و اشاعت، دفاعی امور، لشکر کی تنظیم اور تنظیم کے قوانین و اصول نافذ کئے ہیں، اخلاق، معاملات، معاشرتی آداب اقتصادی و مالی امور کی تنظیم، سوسائٹی کے اصول غرض کہ تمام تمدنی اور عمرانی ضروریات کی

تشکیل کے مکمل قوانین و احکام پیش کئے ہیں، اس کے امور خارجہ کی طرف نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے حقوق دولیہ اور حقوق ملیہ مقرر کئے ہیں۔ دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ اصول منضبط کئے، جنگ، صلح، معاہدہ، خط و کتابت کے احکام، سیاسی بین الاقوامی اصول و قوانین، ہمسایہ کے حقوق و آداب، مختلف حالات میں معاہدات کے آئین، اجنبی رعایا اور اہل ذمہ کے معاملات کے حدود اور ہر فرقہ و طبقہ کے حقوق مرتب کئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک برہانی دین ہے، جو معاش و معاد کی اصلاح کا کفیل اور زندگی کی ضروریات کی تکمیل کا ذمہ دار ہے، اسلام نے فکری اور ذہنی آزادی عطا کی ہے کسی کو زبردستی غلام بنانے سے منع کیا ہے، انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے، انسانیت کو ذلیل کرنے سے روکا ہے، انسانی معاملات کو الٰہی احکام سے مربوط کیا ہے، تمام حقوق و واجبات اور حدود کی تشریح کر دی ہے، مسلمانوں کے درمیان اخوت و مساوات اور حریت کے اصول مدوّن کئے ہیں، چوں کہ حکومت الٰہیہ کے قوانین کو دنیا میں نافذ کرنے اور ربّانی احکام کو رائج کرنے کے لئے اثر و اقتدار کی ضرورت تھی اس لئے دین اسلام نے ایک امام عادل کو مقرر کرنے کا حکم دیا۔

اسی اساس و بنیاد پر خلفاء راشدین نے خلافت اسلامیہ کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اپنے فرائض و واجبات کو خوش اسلوبی سے انجام دیا اور مسلمانوں کے لئے اپنا اسلامی نمونہ پیش کیا۔

اگر مسلمان اسلام کے اس نظام پر کاربند ہوں تو ان کو دنیا کی کسی تحریک میں حصہ لینے کی ضرورت نہ ہوگی، وہ تمام اقوام عالم کے لئے ایک ربانی و الہٰی نمونہ اور مثال ہیں، کیا ایسی امت جس کے پاس الہی و ربانی سرچشمہ (قرآن) اور ہدایت اور حق و صداقت کا بیش بہا سرمایہ اور اسلام کا ایک اٹل قانون اور نظام ہو جس کی روشنی میں وہ زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتی ہے اور قوموں کو درس حیات دے سکتی ہے دنیا کی قومی تحریکوں اور زمانے کی بے روح اور غیر مستقل نظاموں میں پنپ سکتی ہے؟ آج بھی مسلمان اپنے منبع اور سرچشمہ کی طرف رجوع کریں تو وہ پیاسی انسانیت کی پیاس بجھا سکتے اور پھر دنیا میں حکومت الٰہیہ کو نافذ کرنے کی صلاحیت جو ان کے اندر پائی جاتی ہے اُسے اُجاگر کر سکتے ہیں، واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ماخذات

(۱) قرآن مجید

(۲) کتب احادیث صحیحہ

(۳) نہج البلاغۃ

(۴) خلاصۃ السیرہ المحمدیہ ۔ علامہ سید رشید رضا

(۵) سیرۃ الحلبیہ

(۶) المثل الکامل ۔ محمد احمد جاد المولی بک

(۷) اسلام میں عورت کا مرکز سید امیر علی

(۸) المعاہدات والمحالفات استاذ حسن خطاب الوکیل

(۹) الرق فی الاسلام ۔ احمد باشا شفیق

(۱۰) اسائل السلام ۔ فیلسوف شیخ یوسف الدجوی

(۱۱) مشرق کی مختصر تاریخ ۔ پروفیسر نولدیک مدرس جامعہ استرابرگ جرمنی

(۱۲) سیرت محمد صلعم ۔ مولانا محمد علی

تفسیر المنار ۔ محمد عبدہ و سید رشید رضا

(۱۴) دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۔ محمد فرید وجدی

(۱۵) الاسلام دین عام خالد ″ ″

(۱۶) لبطل الابطال ۔ عبدالرحمٰن عزام بک

(۱۷) صراط مستقیم ۔

(۱۸) مجلۂ مصحف ۔

نفیس ترین لٹریچر

تاریخی و سیاسی

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ سید عبدالباری
تین روپیہ بارہ آنہ

ہندوستان کی سیاسی انجمنیں مولانا محمد علی
دو روپیہ بارہ آنہ

مقالات جمال الدین افغانی ۔ مبارز الدین
دو روپیہ چودہ آنہ

مقام جمال الدین افغانی رفعت تین روپیہ

تصورات پاکستان ۔ قائد اعظم محمد علی جناح
دو روپیہ بارہ آنہ

تشریحات پاکستان ۔ علامہ عبدالقدوس ہاشمی
دو روپیہ چودہ آنہ

معاشیات پاکستان ۔ علامہ عبدالقدوس ہاشمی
ایک روپیہ دس آنہ

ہمارا پاکستان ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی
بارہ آنہ

اسلام کے سیاسی تصورات ۔ پروفیسر
• غلام دستگیر رشید ایم اے عثمانیہ دو روپیہ ۱۲ آنے

حکومت الٰہیہ ۔ رئیس احمد جعفری
دو روپیہ چودہ آنہ

اسلام کا نظام حیات ۔ عبدالوہاب ظہوری
چار روپیہ چار آنہ

نانسیت ۔ شاہد رزاقی ایم اے عثمانیہ
دو روپیہ بارہ آنہ

قائدین کے خطوط جناح کے نام مترجمہ
عبدالرحمٰن سعید دو روپیہ

گاندھی جناح مراسلت ۔ بارہ آنہ

افادات محمد علی ۔ رئیس احمد جعفری
تین روپیہ بارہ آنہ

اسلام کا نظام عدالت و سیاست
پروفیسر یعقوب الرحمٰن عثمانی جامعہ عثمانیہ
دو روپیہ بارہ آنہ

اسلام اور سود ۔ ڈاکٹر اقبال قریشی
تین روپیہ

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ ۔
علامہ مناظر احسن گیلانی ۔ تین روپے بارہ آنہ

اقبالیات

فلسفۂ عجم ۔ ۔ علامہ اقبال ۔
تین روپیہ دو آنہ

تصورات اقبال ۔ مشاغل فخری
تین روپیہ چھ آنہ

حکمت اقبال ۔ مرتبہ غلام دستگیر
رشید ایم اے چار روپیہ

رموزِ اقبال ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین عثمانیہ
دو روپیہ آٹھ آنہ

اسلامی ۔ ادبی ۔ تاریخی

نئے ادبی رجحانات ۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین
ایم اے ۔ تین روپیہ آٹھ آنہ

نثر ریاض ۔ خیرآبادی ۔ مضامین ریاض
مرتبہ عقیل جعفری ۔ دو روپیہ آٹھ آنہ

جگر مراد آبادی ۔ حالات ۔ تبصرہ
انتخاب کلام ۔ تبسم نظامی ۔
دو روپیہ آٹھ آنہ

زہریلے آنسو ۔ قاضی نذر الاسلام کی
نظموں کا ترجمہ ۔ دو روپیہ چار آنہ

جہانِ آرزو ۔ علامہ آرزو لکھنوی
دو روپیہ بارہ آنہ

ذکرِ جمیل ۔ نعتیہ کلام ماہر القادری
ایک روپیہ آٹھ آنہ

فلسفۂ امن ۔ احمد حسین نقوی ۔
دو روپیہ آٹھ آنہ

سیر افغانستان ۔ علامہ سید سلیمان
ندوی ۔ دو روپیہ آٹھ آنہ

داستان کربلا ۔ سعید صدیقی ۔
دو روپیہ بارہ آنہ

تاجدار دو عالم ۔ عبدالرحمٰن
عزام بک ۔ دو روپیہ بارہ آنہ

قائد ملت بہادر یار جنگ مرحوم
غلام محمد بی اے عثمانیہ
دو روپیہ بارہ آنہ

امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ۔
علامہ مناظر احسن گیلانی ۔ چار روپیہ

کرنل لارنس ۔ حالات زندگی ۔
مشیر حسین دو روپیہ بارہ آنہ

مجرمین جنگ ۔ عثمان صحرائی
(زیر طبع) دو روپیہ بارہ آنہ

برنارڈ شاہ کا جہنم۔ مترجمہ آغا افتخار حسین۔ دو روپیہ بارہ آنہ

سہیل کی سرگزشت۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی مضامین کا مجموعہ
دو روپیہ بارہ آنہ

کوہ نور کی سرگذشت۔ رہبر فاروقی
ایک روپیہ چار آنہ

ناول۔ ڈرامے۔ افسانے

عشرت دردناک معاشرتی ناول
ڈاکٹر عارف بٹالوی دو روپیہ آٹھ آنہ

مستقبل کے سوداگر (ناول)
رضا زیدی۔ ایک روپیہ بارہ آنہ

نکتہ چیں ہے غم دل۔ مترجمہ آغا افتخار حسین
بارہ آنہ

کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں۔ افسانے
ابراہیم جلیس دو روپیہ بارہ آنہ

مظلوم دوشیزہ تین روپیہ

چالیس کروڑ بھکاری (افسانے)
ابراہیم جلیس دو روپیہ بارہ آنہ

تکونا دیس (افسانے) ابراہیم جلیس
دو روپیہ بارہ آنہ

بھوکا ہے بنگال۔ (افسانے) مرتبہ ابراہیم جلیس۔
دو روپیہ چودہ آنہ

آج کل کے رومان (خواتین کے افسانے
دو روپیہ بارہ آنہ

سرنوشت (افسانے) مجنوں گورکھپوری
دو روپیہ

ہچکیاں۔ صدیقہ بیگم
تین روپیہ

طوفان۔ (ناول) رئیس احمد جعفری
تین روپیہ

غُبار (افسانے) قیسی رام پوری
دو روپیہ چار آنہ

خطا۔ (ناول) قیسی رام پوری
تین روپیہ

کسک۔ (افسانے) تسلیم سلیم چھتاری
دو روپیہ بارہ آنہ)

فلسفیوں کے خواب۔ علامہ ظہوری دو روپیہ چار آنہ

ہماری بچوں کی کتابیں

حضرت عمر فاروقؓ	الطاف شوکت	۷ر
حضرت ابوبکر صدیقؓ	"	۵ر
حضرت عثمان غنیؓ	اعجاز قدوسی	۷ر
حضرت علیؓ	"	۷ر
حضرت محمد بن قاسمؒ	شاہین فاروقی	۷ر
حضرت خالد بن ولید	"	۷ر
حضرت بلال	"	۷ر
ٹیپو سلطان	"	۷ر
کانا باقی	عشرت رحمانی	۵ر
خوفناک درندہ	بشیر شارق	۷ر
بہادر شہزادی	"	۷ر
نیلی داڑھی	"	۷ر
خلیفہ سارس	"	۷ر
مصطفےٰ کی بہادری	"	۷ر
چالاک بھیڑیا	کوثر چاندپوری	۷ر
ہیروں کی کان	"	۷ر
موتیوں کا انڈا	"	۷ر
چوہوں کی بستی	"	۷ر
لاہور کی یادگاریں	الطاف شوکت	۷ر
مشہور یادگاریں	ماہر القادری	۷ر
دونوں جہان والے	عشرت رحمانی	۷ر
اونچے نشان والے	"	۷ر
دیس دیس کی کہانیاں	"	۷ر
بے زبانوں کی کہانیاں	سیتا رام باہری	۷ر
جانوروں کی کہانیاں	"	۵ر

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

۱- اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقاء، مجلس انتظامی
مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۲- اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ
و اراکین دار الترجمہ دس کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے اور طلبۂ ریسرچ
دس کتابیں بی اے و تحقیقاتی جماعتوں سے

۳- طلبائے ایم اے، ال ال بی ... اپنے پاس رکھ سکینگے۔
کے طلبہ تین کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے ہوں تو طلبہ بحساب
طلبہ پانچ کتابیں دو ہفتہ تک کتابیں واپس نہ ہوں ... سکینگی مگر اس غرض

۴- مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ لیا جائیگا
ایک آنہ یومیہ فی کتاب وصول کر لیا جائیگا

۵- بشرط موقع کتابیں گھر جاری کی جا سکینگی ... واری
کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶- کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو مستعیر پر ذمہ داری
عائد ہوگی۔

۷- کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ نہ
لگایا جائے۔

۸- قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں
جاری نہ کی جا سکینگی۔ فقط